رَبِّ اَوۡ زِعۡنِیۡ أَنۡ أَشۡکُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِیۡ أَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلیٰ وَالِدَیَّ وَ أَنۡ أَعۡمَلَ صَالِحًا

تَرۡ ضٰهُ وَأَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِیَّتِیۡ ۚ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡكَ

وَاِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ

☆ کچھ یادیں کچھ باتیں ☆

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹہ ۔ جرمنی

انتساب

میرے پیارے والد ماجد محترم چوہدری فضل کریم صاحب بھٹہ کے نام جن کو اللہ تعالیٰ نے جوانی میں احمدیت قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور جن کی بدولت مجھے پیدائشی احمدی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا اور جن کی تربیت اور دعاؤں کے طفیل مجھے وقف کی سعادت نصیب ہوئی۔

میری یہ عاجزانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے والد ماجد کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقامات میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کی نیک خواہشات کی تکمیل کی مجھے توفیق عطا فرمائے اور تادم آخر احمدیت پر قائم رکھے۔ آمین ثم آمین

طالبِ دعا

عبدالرحمٰن بھٹہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم　　　نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم

عرضِ حال

زندگی کے یہ کچھ واقعات ہیں جن کو لکھنے کا کبھی سوچا نہ تھا۔لیکن ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' بس انہی مہربان مربیان صاحبان کے طفیل یہ مجموعہ معرض وجود میں آ گیا ہے۔اس اجمال کی قدرے تفصیل کچھ اس طرح ہے:

محترم مولانا محمد الیاس منیر صاحب نے چند سال قبل جب مجھ سے اپنی زندگی کے واقعات لکھنے کے لیے کہا تو مجھے یہ بات بہت عجیب سی لگی تھی اور میں ٹال گیا۔لیکن جب انہوں نے بار بار کہا تو میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی ایک صورت سوچی۔ میں نائیجیریا 1971ء میں نصرت جہاں سکیم کے تحت وقف کر کے گیا تھا اور سات سال بعد 1978ء میں چھٹی پر پاکستان گیا۔ پاکستان روانگی سے دو ماہ پہلے میں نے ایک طویل خط اپنے بڑے بھائی مکرم عبدالرحیم صاحب بھٹہ (سابق امیر ضلع وہاڑی) کے نام لکھا۔جس میں میں نے گزشتہ سات سال کے کچھ واقعات وحالات تحریر کئے تھے۔اس خط کی نقل میرے پاس یہاں جرمنی میں موجود تھی۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اسی خط کو ذرا وضاحت کے ساتھ دوبارہ لکھ لوں تو اس سے محترم مربی صاحب کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے وہ خط دوبارہ لکھا اور واقعات وحالات ذرا وضاحت سے بیان کئے۔لیکن مکرم مولانا محمد الیاس منیر صاحب کو ارسال کرنے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ میں یہ خط محترم مولانا فضل الٰہی صاحب انوری کو دکھا دوں کیونکہ وہ اس دَور میں نائیجیریا کے امیر تھے اور بہت سے واقعات اور حالات سے واقف تھے۔

محترم مولانا انوری صاحب نے میری اس تحریر کو بہت سراہا۔لیکن ساتھ ہی مجھے بعض واقعات یاد دلائے اور لکھا کہ وہ بھی شامل کرو۔ اور پھر یہ بھی فرمایا کہ تم جب 1971ء میں نائیجیریا آئے تھے تو بتایا تھا کہ یہ ''سعادت وقف''، تمہیں ''اس شرفِ شاگردی'' کی بدولت حاصل ہوئی تھی جو تمہیں 1951ء میں تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخلے کی صورت میں ملا تھا۔محترم انوری صاحب نے فرمایا کہ اس ''شرفِ شاگردی'' کے حوالے سے بھی کچھ واقعات درج کرو۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ اس وقت کالج کے پرنسپل تھے۔ میں بات کو جس قدر مختصر کرنا چاہتا تھا۔ یہ اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

اب مشکل یہ تھی کہ ''شرفِ شاگردی'' تو 1953-1951 میں حاصل ہوا تھا اور سعادتِ وقف 1971ء میں ملی تھی۔اس درمیانی سترہ سال کے خلا کو پر کرنا ضروری تھا۔لہٰذا مجبوراً مجھے میڈیکل کالج کے پانچ سال اور ملازمت کے بارہ سال کے کچھ واقعات بھی درج کرنا پڑے۔

اب جب مسودہ میرے بچوں نے دیکھا تو احتجاج کیا کہ یہ واقعات تو اس زمانہ کے ہیں جب ہم پیدا نہ ہوئے تھے یا ہوش نہ

سنبھالا تھا۔ وہ واقعات جو ہم نے دیکھے اور وہ حالات جن سے ہم گزرے ان کا ذکر ہی نہیں۔ انہوں نے سوال اٹھایا کہ نائیجیریا میں تو ہم انیس سال رہے اور اب جرمنی میں بھی بیس سال ہونے کو ہیں۔ کیا اس عرصہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ میں کوئی داستانِ حیات نہیں لکھ رہا۔ بس بزرگوں کے فرمان پر کچھ واقعات لکھ دیئے ہیں لیکن ان کا کہنا تھا کہ داستانِ حیات تو آپ لکھ ہی چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو ادھورا چھوڑ دیں۔ بالآخر مجھے باقی 2009ء تک کے واقعات بھی لکھتے ہی بنی۔

اسی دوران مربی سلسلہ مکرم مولانا ساجد احمد صاحب نسیم ہماری جماعت میں دَورے پر آئے اور میں نے یہ مسودہ ان کو دکھا دیا۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا: ''شروع میں اپنے والد صاحب کے کچھ حالات بھی تو لگائیں۔ یہ بھی تو بتائیں کہ احمدیت آپ کے خاندان میں کیسے آئی۔'' مکرم مربی صاحب نے ایک ایسی کمی کی طرف متوجہ فرمایا جس کو ہم بھائی عرصہ سے محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے بھائیوں سے رابطہ کیا۔ کچھ حالات و واقعات والد صاحب کے مرتب کئے اور شروع میں درج کیے۔

جب یہ مسودہ مکمل ہوا تو میں نے مکرم مولانا حیدر علی صاحب ظفر سے اس کا جائزہ لینے کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی توجہ سے جائزہ لیا اور اصلاحات تجویز کیں۔ مشورے دیئے اور تبصرے بھی کیے۔ اسی طرح مکرم مولانا مبارک احمد تنویر صاحب انچارج شعبہ تصنیف جرمنی نے بھی جائزہ لیا اور اہم اصلاحات تجویز کیں۔ اس کے بعد یہ مسودہ لندن سیکرٹری صاحب تصنیف کی خدمت میں ارسال کیا تو انہوں نے اس کو پسند فرمایا اور ساتھ ہی یہ اصرار کیا کہ اس میں فوٹوز لگائی جائیں۔ چنانچہ اب فوٹوز تیار ہو رہی ہیں۔ ٹائپ کی سہولت مجھے یہاں جرمنی میں میسر نہ تھی۔ مکرم مبارک احمد صاحب ارجمند نے پہلے تیس صفحات ٹائپ کئے لیکن پھر کمپیوٹر کی خرابی کی وجہ سے کام جاری نہ رکھ سکے۔ اس پر میں نے اپنے بھائی عبدالمنان بھٹہ سے ربوہ بات کی تو انہوں نے مکرم جاوید اقبال یوسف صاحب مربی سلسلہ سے رابطہ کر کے اس مسئلہ کو حل کیا۔ مکرم جاوید اقبال یوسف صاحب نے نہ صرف بہت عمدہ کتابت کی بلکہ بہت سے مفید مشوروں سے متن درست کیا۔

میں ان سب مہربان حضرات اور مکرم مبارک احمد صاحب ارجمند کا مشکور ہوں کہ ان کی تحریک، ترغیب، تصحیح اور تعاون سے یہ مسودہ معرضِ وجود میں آ گیا ورنہ میں تو اس کی راہ میں روڑے ہی اٹکاتا رہا تھا۔ میں اپنے حالات واقعات کو اس طرح کتابی شکل میں لکھنا ضروری سمجھتا تھا نہ مناسب کہ ادب کی یہ صنف خواص کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اب جبکہ قلمبند کر چکا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہو سکے تو ہر شخص کو اپنے حالات و واقعات لکھنے چاہییں۔ بیتے دنوں کو یاد کر کے واقعات لکھنا ایک عجیب دلگداز تجربہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہی زندگی ایک دفعہ پھر جی رہے ہوں۔ اصل زندگی میں جب یہ واقعات وقوع پذیر ہو رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ان کی اہمیت اور حکمت کا ادراک ایسا نہیں ہوتا جیسا برسوں بعد ان کے پس منظر، نتائج اور اثرات پر غور کرنے سے ہوتا ہے۔ لکھتے وقت قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور عنایات سے دل ایسے گداز ہوتا ہے کہ انسان شکر کے سجدے بجالاتا ہے اور لحظہ لحظہ اپنی خطاؤں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس بے ساختہ توبہ اور استغفار پر مجبور کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ امتحان میں پرچہ حل کر لینے کے بعد آخری چند منٹ میں اس پر نظر ثانی کر لینا مفید رہتا ہے۔ اس سے چھوٹی موٹی غلطیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آخری عمر میں اگر یوم حساب سے پہلے اپنے اعمالنامہ پر نظر ثانی کی توفیق مل جائے تو بڑی

خوش بختی کی بات ہے۔اس سے چھوٹی موٹی نہیں بلکہ بڑی بڑی خطاؤں کا مداوا بھی ہوسکتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا.

میری اس سرگزشت سے کسی کو کوئی فائدہ ہو نہ ہو لیکن مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچا ہے اور ایک دفعہ پھر میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کی تیاری میں تعاون فرمایا۔اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے فضل و کرم سے نوازے اور ان کا حامی و ناصر ہو۔آمین۔

قارئین سے درخواستِ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری خطاؤں کو معاف فرمائے اور میری پردہ پوشی کرے اور خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین۔

خاکسار

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹہ

02 - 03 - 2014

شکرانِ نعمت سے متعلق چند آراء

1۔مکرم مولانا محمد الیاس منیر صاحب اپنے مکتوب مؤرخہ 20 ستمبر 2008ء میں لکھتے ہیں:

''الحمد للہ کہ آپ نے خاکسار کی گزارش پر اپنے حالاتِ زندگی ضبطِ تحریر میں لانے کا تاریخی کام شروع کر دیا ہے۔ جَـزَاکُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡجَزَاء۔ اس تحریر کی پہلی قسط ملتے ہی خاکسار نے مطالعہ شروع کر دیا اور دم اُسی وقت لیا جب آخری صفحہ پر پہنچا۔ ماشاء اللہ بہت عمدگی سے آپ نے یہ واقعات لکھے ہیں۔ انہیں پڑھتے چلے جانے کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔تحریر بولتی ہے اور حسبِ ضرورت نہ صرف محاوروں سے لیس ہے بلکہ مختلف مقامات پر باریک قسم کے چٹکلوں سے بھی مزین ہے جہاں گزرتے ہوئے قاری ایک گہری گدگدی محسوس کرتا چلا جاتا ہے.....''

2۔محترم مولانا فضل الٰہی انوری صاحب اپنے خط محررہ 20 ستمبر 2010ء میں تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کا مرسلہ مضمون میں نے پڑھ لیا ہے...... مجموعی طور پر مضمون بہت ہی دلچسپی کا موجب بنا بعض حصے خاص طور پر بڑے دلگداز ہیں۔ مثلاً حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی 1980ء میں نائیجیریا میں آمد اور جس طور پر بالکل غیر متوقع حضور اور حضور کی بیگم صاحبہ آپ کے گھر تشریف لے گئے۔عیسائی پادریوں کے ساتھ آپ کی گفتگو بہت دلچسپ اور عالمانہ دلائل پر مشتمل ہے۔آپ کے مُسکت جوابات جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی علمی فضیلت کے بموجب ہمیں حاصل ہیں، پڑھنے سے خود آپ کے گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ڈاکٹری تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کا سلسلہ کے لٹریچر پر عبور آپ کی نمایاں خصوصیت ہے جس پر ہم مبلغین بھی رشک کرتے ہیں...... پھر آپ کی غائبانہ نصرت الٰہی کے واقعات پڑھ کر خدا کی حمد کے ترانے گانے کو جی چاہتا ہے۔ان میں سے ایک واقعہ میں نے اپنی کتاب ''درویشانِ احمدیت'' کی زینت بنایا ہے......''

3۔محترم مولانا حیدر علی صاحب ظفر نے فروری 2011ء میں مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں تحریر فرمایا:

''بھٹہ صاحب! بہت دلچسپ۔ بہت ایمان افروز ہے آپ کی داستان۔
میرے خیال میں کہا جا سکتا ہے۔خدا رحمت کند......الخ
واقفین زندگی طلبہ۔ نئے مربیان سلسلہ کے لیے بہت اچھی رہے گی۔''

دوسری جگہ تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا:۔

''بھٹہ صاحب! یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ صبح سے پڑھ رہا ہوں۔چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔''

شکرانِ نعمت

بابِ اوّل (1 - 30)

بابِ دوم (31 - 56)

باب ششم (125 - 150)

باب ہفتم (171 - 176)

باب ہشتم (177 - 197)

بابِ نہم (198 - 220)

بابِ دہم (221 - 246)

لندن کے انٹرنیشنل تبلیغ سیمینار میں تقریر- جلسہ سالانہ میں شرکت
ریجن کی تربیتی کلاسز، قرآن کلاس بذریعہ ٹیلیفون، انفرادی تبلیغی ملاقاتیں، مربی صاحبان اور تبلیغی نشستیں
ایک تبلیغی نشست- ایک افسوناک واقعہ
محترم ڈاکٹر محمد جلال شمس صاحب کے ساتھ ایک تبلیغی نشست میں شرکت
یہووا وٹنس کی نامعقول توجیہات، مکرم مولانا حیدر علی صاحب ظفر کے ساتھ ایک عیسائی سے گفتگو، کوبلنز میں تبلیغی نشست
بیٹوں کی شادی
لڑکوں کی سیاسی پناہ کی درخواست- ردّ ہونے کے بعد اپیل، عدالت عالیہ انس باخ (Ansbach) میں پیشی- ''ایک زندہ خدا موجود ہے''،
عدالت میں حاضری اور تائید الٰہی، پریشان کن کاروائی- خوشکن فیصلہ
''احمدیہ'' فیصلہ کن لفظ
ریجنل امارت- ایک اعزاز ایک ذمہ داری
حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے ساتھ البانین کی محفل سوال و جواب، دستی بیعت کی سعادت۔
نیشنلٹی کی درخواست
میری نیشنلٹی کی راہ میں رکاوٹ، قانون کی تبدیلی سے نیشنلٹی کا امکان- اندھیرے میں روشنی کی کرن، نئے قانون کے تحت نیشنلٹی
نئی صدی کے آغاز پر ''مسیح کی آمدِ ثانی'' پر مضمون۔ اشاعت کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کا ارشاد
پوپ کے اعتراضات کا جواب تیار کرنے والی کمیٹی میں شمولیت۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کا احسان
بائیبل کمنٹری کا جائزہ۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
اہلیہ کی وفات۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا اظہارِ تعزیت

بسمِ اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

باب اوّل

شکرانِ نعمت

میرے والدِ محترم

میرے والدِ محترم چودہری فضل کریم بھٹّہ، ضلع لدھیانہ کے گاؤں ''رام گڑھ سرداراں'' کے رہنے والے تھے۔اس گاؤں کی آبادی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، زیادہ تر ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔گاؤں میں سکھوں کا قلعہ بھی تھا جس کی دیوار ہمارے گھر کے سامنے تھی۔ایک دومنزلہ مکان والد مرحوم نے وہاں بنوایا تھا جس کے چوبارے اور آنگن میں کھیلنا مجھے یاد ہے۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ ہم ''گُپ'' سٹیشن پر اتر کر یکّہ میں بیٹھ کر گاؤں جایا کرتے تھے۔اسی گاؤں میں والد صاحب نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر انہوں نے لدھیانہ کے ایک عیسائی سکول میں داخلہ لے لیا۔اس سکول سے میٹرک پاس کر کے انہوں نے وہیں ملازمت اختیار کر لی۔

قبولِ احمدیت

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ اُس سکول کے عیسائی ماحول میں اسلام کے خلاف بہت سے اعتراضات اُن کو سننے کو ملتے تھے۔ان اعتراضات کے جواب کے لئے والد صاحب کئی مولویوں سے رابطہ کرتے لیکن کہیں سے اُن کو تسلی بخش جواب نہ ملتا تھا۔یہ صورتحال ان کے لئے بہت پریشان کُن تھی۔

اُن کی احمدیت کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک ہندو پنڈت لالہ کشن پرشاد تھا۔وہ چُھٹّی پر گاؤں گئے تو پنڈت نے پوچھا ''کیا بات ہے فضل کریم! کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔'' والد صاحب نے اپنی پریشانی بیان کر دی۔پنڈت نے سن کر کہا کہ ان مولویوں سے تمہیں کچھ نہیں ملنے کا۔اگر عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب چاہتے ہو تو میں تمہیں پتہ بتاتا ہوں۔ایک نواحی بستی ''ملود'' تھی جس میں دو تین احمدی گھرانے تھے۔پنڈت نے ان میں سے ایک کا پتہ بتا دیا۔والد محترم وہاں پہنچے اور وہاں سے اُن کو ''چشمۂ مسیحی'' اور ''سراج دین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب'' دو کتابیں مل گئیں۔جماعت کے متعلق کچھ اور معلومات بھی ملیں۔واپس آ کر انہوں نے رات کو وہ کتابیں پڑھیں۔اُن کُتب سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ صبح اُٹھ کر انہوں نے بیعت کا خط لکھ دیا۔سب اعتراضات کے نہایت تسلی بخش جوابات ان کو مل گئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت بھی عیاں ہوگئی۔یہ 1917ء کی بات ہے۔بعد میں قادیان جا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی دستی بیعت بھی کی۔ملود میں جمعہ ہوتا تھا۔وہاں جا کر جمعہ پڑھنا شروع کر دیا۔وہاں سے مزید لٹریچر بھی پڑھنے کو ملتا رہا۔بعد میں کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور سلسلہ کا دیگر لٹریچر بھی خرید لیا تھا اور اچھا مطالعہ کیا۔اس علمی خزانہ سے ہم بھی فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔بچپن میں ان کے ساتھ جلسہ پر قادیان جانا

مجھے یاد ہے۔ہم مکرم مولانا عبدالرحیم درد صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرا کرتے تھے۔والد مرحوم کی انگلی پکڑ کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی ملاقات کو جانا بھی یاد ہے۔

سوشل بائیکاٹ۔تعلیمی ترقی

والد صاحب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔بہن بھائی تو پہلے ہی نہ تھے۔اب بیعت کے بعد دوسرے رشتہ داروں نے بھی چھوڑ دیا۔سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا۔اس طرح وہ بالکل تنہا رہ گئے۔کسی تقریب میں اُن کو بلایا نہ جاتا تھا۔اور اگر وہ شامل ہوتے تو دوسرے مہمان شامل ہونے سے انکار کر دیتے۔اس طرح میز بان کو ان سے معذرت کرنی پڑتی۔

اس تنہائی کو والد مرحوم نے اپنے حق میں یوں استعمال کیا کہ اپنی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔آہستہ آہستہ انہوں نے بی۔اے اور بی۔ٹی کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔اور پھر ادیب فاضل اور منشی فاضل بھی پاس کر لیے اور اس طرح اُن کو بی۔او۔ایل کی اعزازی ڈگری بھی مل گئی اور جلد ہی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدہ تک پہنچ گئے۔بارہ سال تک وہ عارف والا ضلع پاکپتن میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔1941ء میں اُن کا تبادلہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ہائی سکول میں ہوگیا۔وہاں سے اپریل 1947ء میں بورے والا ضلع وہاڑی کے ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔پھر یہاں سے ہی وہ 1952ء میں ریٹائر ہوئے اور یہیں رہائش اختیار کر لی۔ہم بھائیوں نے جب ہوش سنبھالا تو والد صاحب کو بطور ہیڈ ماسٹر اور صدر جماعت ہی دیکھا۔

عادات وخصائل

والد محترم کا طرزِ زندگی بہت سادہ لیکن پُر وقار تھا۔لباس عام طور پر شلوار قمیض کے ساتھ کوٹ یا اچکن اور پگڑی تھا۔موقع محل کے لحاظ سے سوٹ اور ٹائی بھی پہنتے تھے۔خوراک بالکل سادہ تھی۔جو پکتا خوشی سے کھا لیتے تھے۔ہم نے کبھی ان کو کھانے میں نقص نکالتے نہیں دیکھا نہ ہی کبھی کسی خاص خوراک کے بارے میں کوئی فرمائش کرتے دیکھا۔کسی چیز کی عادت نہ تھی۔یہ کہتے تھے کہ انسان کو استعمال تو ہر چیز کر لینی چاہیئے لیکن عادت کسی چیز کی نہیں ڈالنی چاہیئے۔میں کالج سے چھٹیوں میں گھر آتا تو رات کھانے کے بعد اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹہلنے نکل جاتا۔ہم راستے میں پان خرید لیتے۔دو چار دن کے بعد ایک روز والد صاحب نے مجھے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ تم پان کھاتے ہو۔یہ عادت اچھی نہیں۔اس کے بعد میں نے پان کھانا چھوڑ دیا۔

وہ اپنی صحت کا خیال رکھتے تھے۔روزانہ سیر کرتے تھے اور ہم بچوں کو بھی صبح جلد جگا کر نماز کے بعد سیر پر ساتھ لے کر جاتے۔ان کا قاعدہ تھا کہ طلوع آفتاب سے پہلے پہلے سیر سے واپس آ جانا چاہیئے۔بہت تیز چلتے تھے۔اس طرح ہمیں بھی تیز چلنے کی عادت ہوگئی۔جوانی میں ٹینس اور شکار بھی کھیلتے رہے تھے۔بچپن میں مجھے ان کے ساتھ ٹینس کلب جانا یاد ہے۔اور شکار تو ہم سب بھائیوں نے اُن کے ساتھ خوب کھیلا ہے۔

بھینسیں پالنے کا والد صاحب کو بڑا شوق تھا۔گھر میں دودھ، دہی، مکھن اور گھی کی ہمیشہ فراوانی رہی۔ان کی صفائی اور

صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ بھینس کا کالا رنگ چمکنا چاہئیے۔

اپنی ہیڈ ماسٹری کی تقریباً 25 سالہ سروس میں اگر چہ بھینسوں کو سنبھالنا، چارہ ڈالنا ملازم کے ہی ذمہ تھا۔مگر تمام امور کی مکمل نگرانی رکھتے۔ 1952ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ایک ہی بھینس رہ گئی تھی جس کے تمام امور خوراک کی تیاری، نہلانا، موسم کے لحاظ سے اس کے آرام کا خیال رکھنا، اندر باہر، دھوپ چھاؤں، گرمی سردی کے لحاظ سے نہ صرف ہم بھائیوں کو ہدایات دیتے بلکہ خود بھی ہاتھ بٹاتے۔صبح سیر پر جاتے تو ہم بعض اوقات بھینس کو بھی ساتھ لے جاتے اور نہر میں اسے نہلاتے۔ والدہ صاحبہ بھی بھینسوں کی خدمت حسبِ توفیق خود بڑی خوش دلی اور محبت سے کرتی تھیں۔ کہتی تھیں یہ بے زبان جانور ہے اس کی خدمت سے خدا خوش ہوتا ہے۔ جانور سے اُن کے لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے پاس تین بھینسیں ہوگئی تھیں۔ والد صاحب نے بڑی بھینس کو فروخت کر دیا۔ جب والد صاحب باہر گلی میں سودا کر رہے تھے تو والدہ اندر کھڑکی کھڑکی کی جالی سے دیکھ رہی تھیں۔ میں والدہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جب نیا مالک بھینس کو لے جانے لگا تو بھینس چند قدم چلی اور پھر رک گئی۔ پھر اس نے مڑ کر کمرہ کی طرف دیکھا۔ والدہ صاحبہ بے ساختہ رونے لگیں۔ نیا مالک زور لگا تا رہا لیکن بھینس اُسی طرح مڑ کر دیکھتی رہی۔ پھر والد صاحب نے آگے بڑھ کر اس کو ہانکا تب وہ چلی۔ والدہ نے بھینس کو ایسے رخصت کیا جیسے بہن، بیٹی کو رخصت کر رہی ہوں۔ ہاں کیوں نہ دکھی ہوتیں۔ بھینس نے بھی تو ان کے بچوں کو برسوں دودھ پلایا تھا۔ رضاعت کا رشتہ تو تھا ناں۔ بھینس کا مڑ کر الوداعی نگاہیں ڈالنا میرے لئے بہت حیران کن تھا۔ دل میرا بھی بھر آیا تھا۔

تربیت و تبلیغ

والد صاحب عالم باعمل تھے۔ جوانی سے ہی پابند صوم وصلوٰۃ، تہجد گزار اور صاحب رؤیا بزرگ تھے۔ گھر میں بچوں کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد قرآن کریم کا درس دیتے جس میں پوری فیملی شامل ہوتی۔ کھیل کود سے منع نہیں کرتے تھے لیکن نماز اور پڑھائی کی طرف بھی توجہ دلاتے رہتے اور اگر اس بارہ میں کوتاہی دیکھتے تو باز پرس بھی ہوتی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی۔ عصر اور مغرب کی نماز اکثر ہمارے کھیل کے درمیان آتی۔ ہم نیکر پہن کر کھیلتے تھے۔ ایک دھوتی گھر میں رکھی ہوتی تھی۔ ہم کھیل چھوڑ کر آتے، وضو کرتے اور نیکر کے اوپر دھوتی لپیٹ کر نماز ادا کرتے اور پھر بھاگ جاتے۔

آپ نے قرآن کریم، حدیث اور کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تبلیغ کا بہت شوق تھا۔ بورے والہ میں روزانہ شام کو بیٹھک کے باہر کھلی فضا میں کرسیاں بچھ جاتیں اور ہم بھائی اُن سے کوئی نہ کوئی سوال کر کے گفتگو کا آغاز کر دیتے۔ ہمارے پڑوس میں دو تین غیر احمدی استاد رہتے تھے۔ وہ بھی اکثر آشامل ہوتے اور اچھی خاصی تبلیغی نشست ہو جاتی۔ ہر طرح کے سوالات اور اعتراضات زیر بحث آتے تھے۔ اگر حوالوں کی ضرورت محسوس ہوتی تو میں بھاگ کر جاتا اور کتاب لا کر

حوالے نکالتا۔ وہ استاد بعض اوقات کہتے ''دیکھو اس لڑکے کو، باپ سے بھی تیز ہے۔'' موقع محل کے مطابق جواب ایسا برجستہ دیتے کہ مخالف لاجواب ہو جاتا۔ اندازِ گفتگو مدلّل اور مہذب ہوتا تھا۔ اعتراض خواہ کیسا ہی تلخ ہوتا کبھی جوش یا غصہ میں نہیں آتے تھے۔ بلکہ اصل جواب دینے سے پہلے ہلکے پھلکے انداز سے کوئی بات کر کے فضا کی تلخی کو پہلے دور کرتے پھر اصل مسئلہ کی وضاحت کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ گفتگو صبر وتحمل سے کرنی چاہئیے۔ جوش اور غصہ سے دلیل کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ بحث کرنے والا مدّ مقابل اکثر آپ کے جواب کی معقولیت کو محسوس کرنے کے باوجود تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے۔ لہٰذا حاضرین کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ وہ اثر لیتے ہیں۔

شہر میں احراریوں کا جلسہ تقریباً ہر سال ہی ہوتا تھا۔ جماعت کے خلاف بہت تقریریں ہوتی تھیں۔ ہم دُور بیٹھ کر اعتراضات نوٹ کرتے اور پھر گھر آ کر والد صاحب مرحوم کو بتاتے اور وہ ہمیں ان کے جواب بڑی تسلی اور سیاق وسباق کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ اگر اعتراض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کسی تحریر کے حوالے سے ہوتا تو کہتے جاؤ جا کر الماری سے متعلقہ کتاب لے کر خود اصل عبارت پڑھو۔ اس طرح ہمیں جواب بھی مل جاتا اور یہ بھی علم ہو جاتا کہ یہ مولوی کس طرح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ہمارے پڑوسی غیر احمدی استادوں نے کہا کہ ہمارے جلسہ پر مولوی محمد علی جالندھری آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ہم آپ کی ملاقات کرانا چاہتے ہیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ لے آئیں ان کو۔ چنانچہ مولوی صاحب ایک استاد کے ساتھ رات کے اندھیرے میں کچھ گھونگھٹ سا نکال کر آئے۔ ختم نبوت پر بات ہوئی۔ والد صاحب نے کہا کہ جب حضرت مسیحؑ آئیں گے تو ختم نبوت کہاں جائے گی۔ مولوی صاحب نے کہا وہ پرانے نبی ہیں۔ ان کے آنے سے ختم نبوت نہیں ٹوٹتی۔ صرف نئے نبی کے آنے سے ٹوٹتی ہے۔ والد محترم نے کہا کہ کیا آپ یہ بات لکھ کر دے سکتے ہیں۔ میں نے مولوی صاحب کے سامنے کاغذ رکھا۔ انہوں نے تحریر لکھی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بس چند منٹ ہی ملاقات رہی تھی۔

صداقت مسیح موعود علیہ السلام کی دلیل

ابا جی کبھی ہم سے بھی سوال پوچھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز مجھ سے پوچھا اگر صداقت مسیح موعودؑ پر تم سے صرف ایک دلیل مانگی جائے تو کیا دو گے۔

میں نے قدرے سوچ کر جواب دیا ''شدّت مخالفت'' جیسی شدید مخالفت حضور علیہ السلام کی ہوئی ہے کبھی کسی جھوٹے نبی کی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی سچا نبی ایسی شدید مخالفت سے بچا ہے۔ یہ ایک طرّہ امتیاز ہے سچے اور جھوٹے نبی میں۔ میرے جواب کو انہوں نے سراہا تھا۔ ایسے ہی سوال وجواب سے ہمارے علم وایمان میں پختگی پیدا کرتے رہتے تھے۔

طالب علمی کے زمانہ میں ہی ہم بھائیوں کو اختلافی مسائل از قسم وفات مسیح، ختم نبوت اور صداقتِ مسیح موعود علیہ السلام پر

عبور حاصل ہو گیا تھا اور ہم کھل کر بات کر سکتے تھے۔ ہمارا ایمان احمدیت پر خدا کے فضل سے علیٰ وجہ البصیرت قائم ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ میڈیکل کالج کے زمانہ میں ایک غیر احمدی بزرگ نے بڑے ناصحانہ انداز میں مجھ سے کہا "دیکھو بیٹا یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان بے سوچے سمجھے باپ کے پیچھے چلتا چلا جائے۔ تم پڑھ لکھ گئے ہو۔ اپنی عقل سے بھی فیصلہ کر سکتے ہو۔"

میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "آپ کی بات بالکل درست ہے۔" اس پر انہوں نے کہا "پھر تم چھوڑ دو اس کو جس کو تمہارے باپ نے مانا ہے اور مسلمان ہو جاؤ۔" میں نے فوراً جواب دیا کہ میں صرف اس لئے احمدی نہیں ہوں کہ میرا باپ احمدی ہے۔ اب میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر احمدی ہوں اور جس کو چھوڑنے کا آپ مشورہ دے رہے ہیں اس پر میں ہزار بار اپنے ماں باپ قربان کر سکتا ہوں۔" وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

احمدیہ بلڈنگس میں مولوی محمد علی صاحب سے ملاقات

(لاہور میں پیغامیوں کا مرکز)

ایک دفعہ ابا جی لاہور گئے تو احمدیہ بلڈنگس کے قریب سے گزرتے ہوئے مولوی محمد علی صاحب کے پاس چلے گئے اور ان سے کہا "مولوی صاحب! آپ کی تقریریں سن کر تو ہم لوگ احمدی ہوئے۔ اور اب آپ قادیان چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے ہیں۔" مولوی صاحب نے وضاحت کی کہ ہم تقریریں تو مسیح موعود کی صداقت پر کرتے رہے۔ خلافت سے ہمیں اختلاف ہے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ابا جی نے کہا "تو پھر پہلی خلافت کو کیوں چھ سال تک مانتے رہے۔" مولوی صاحب کچھ سوچ کر بولے "وہ ہماری غلطی تھی۔ وہ چھ سال کا عمل ہمیں قربان کرنا پڑے گا۔" ابا جی یہ کہہ کر واپس آ گئے۔ "پھر تو آپ کا کوئی اعتبار نہ رہا۔ اگر آپ پہلے غلطی پر تھے تو اب بھی غلطی پر ہی ہیں۔"

ظفر علی خان ایڈیٹر اخبار "زمیندار" نے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا جو شعر میں استعارۃً استعمال ہوا تھا۔ ان ہی دنوں مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم اخبار میں چھپی جس میں ایک لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا تھا۔ ابا جی لاہور گئے تو مولانا ظفر علی سے جا ملے اور ان کی نظم کے اس شعر کو پیش کر کے نہایت سادگی سے پوچھا "اس کا کیا مطلب ہے کچھ سمجھ نہیں آئی؟" مولانا نے کہا "یہاں یہ لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں، استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔" والد صاحب نے فوراً گرفت کی اور کہا "یہ استعارے صرف آپ کے لئے رہ گئے ہیں۔ کیا کوئی دوسرا ان کو استعمال نہیں کر سکتا۔" پھر ان کے اعتراض کی نشاندہی کر کے کہا کہ اُس شعر میں بھی وہ لفظ استعارۃً ہی استعمال ہوا تھا۔ مولانا نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ اخبار کا تازہ پرچہ والد صاحب کو پیش کیا اور کہا "مرزا محمود سے میرا اسلام کہنا۔"

دعا اور خلافت سے وابستگی

دعاؤں کو ابا جی کی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں اکثر اپنے تجربات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک

دفعہ مجھ سے کہا کہ جس امر کے لئے دعا کی توفیق نہ ملے یا توجہ میسر نہ آئے تو محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ امر مشیّتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ دعا کے بارے میں تاکید کرتے رہتے اور اس کی افادیت اور اہمیت ذہن نشین کرواتے رہتے تھے۔ چھُٹی گزار کر جب میں لاہور واپس جانے لگتا تو مجھے بَس پر سوار کرانے ساتھ جاتے۔ ایک دفعہ بسوں کے اڈّے پر میں نے ذکر کیا کہ آج کل بسوں کے حادثات بہت ہو رہے ہیں۔ سن کر فرمایا ''دعا کر کے سوار ہوا کرو اور راستہ میں بھی دعا کرتے رہا کرو۔ اللہ تعالیٰ ایک مومن کی خاطر دوسروں کو بھی بچا لیتا ہے۔''

خلافت سے آپ کی گہری وابستگی تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ یا پریشانی ہوتی تو ان کا پہلا کام حضورؓ کی خدمت میں دعا کی درخواست ہوتا تھا۔ بعض اوقات میں نے دیکھا کہ باہر سے آئے ہیں اور ابھی پگڑی بھی نہیں اتاری، کھڑے کھڑے ہی خط لکھا اور مجھے پوسٹ کرنے کے لئے دے دیا۔ اُن دنوں خط لکھنے کے لئے عام طور پر پوسٹ کارڈ استعمال ہوتے تھے۔ خط لکھ کر اکثر مجھے ہی پوسٹ کرنے کے لئے دیتے تھے۔ اور راستہ میں وہ دعا کا خط میں پڑھ لیتا تھا۔ اس سے مجھے بھی دعا کے لئے حضورؓ کی خدمت میں خط لکھنے کی ترغیب ہوتی اور لکھنے کا سلیقہ بھی آ گیا۔

ایک دفعہ میں خط پوسٹ کر کے واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ جس امر کے لئے آپ نے دعا کا خط لکھا ہے اس کا تو کل فیصلہ ہو جائے گا جبکہ یہ خط حضور کی خدمت میں دو روز بعد پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا ''خدا کو تو علم ہو جاتا ہے کہ میں نے اس کے خلیفہ کی خدمت میں دعا کی درخواست کی ہے۔ آگے خدا اور اس کے خلیفہ کا باہمی معاملہ ہے۔ خدا تعالیٰ بعض اوقات اپنے خلیفہ کی دعا اس کے دعا کرنے سے بھی پہلے قبول کر لیتا ہے۔ لہٰذا خط لکھنے میں سستی نہیں کرنی چاہئے۔ ضروری یہ ہے کہ پورے خلوص اور یقین سے لکھا جائے۔''

والد صاحب بطور ہیڈ ماسٹر

بطور ہیڈ ماسٹر والد صاحب کا سلوک اساتذہ اور مددگار عملہ کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور ہمدردانہ رہا۔ وہ اُن کے سرکاری مسائل اور گھریلو پریشانیوں کو خود دلچسپی لے کر دُور کروانے کی کوشش کرتے۔ اس لئے اساتذہ بھی اپنے فرائض احسن طریق سے ادا کرتے اور سکول کے رزلٹ ہمیشہ بہت اچھے رہتے۔

شہر کے سرکاری محکموں کے سربراہان سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے جو بہت عزت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ اس کے علاوہ اردگرد کے زمینداروں اور بااثر شخصیات کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

آپ کی کارکردگی اور اخلاق کی وجہ سے آپ کے محکمہ کے افسران بالا آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ سکول کے سالانہ معائنہ کے بعد انسپکٹر صاحبان اساتذہ کے متعلق ریمارکس آپ کے مشورہ سے ہی دیتے تھے۔

سکول کے طلباء سے بھی سلوک مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا۔ آپ کے دور میں سپورٹس اور گیمز کی خوب حوصلہ افزائی

رہی۔ بایں ہمہ بعض عناصر ان کے خلاف الزام تراشی کرتے رہتے۔

بعض اوقات احراری مولوی صاحبان انسپکٹر صاحب کے پاس شکایت لے کر جاتے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب احمدیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب ان سے پوچھتے کہ سکول کے رزلٹ کیسے ہیں۔ مولوی صاحبان کو کہنا پڑتا کہ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ اس پر انسپکٹر صاحب فرماتے کہ آپ کو اور کیا چاہئے۔ مولوی صاحبان کو شرمندہ ہو کر آنا پڑتا۔

والد محترم اور مخالفین

ہمارا گھرانا شہر میں جماعت کا مرکز تھا۔ جمعہ ہمارے ہاں ہوتا تھا۔ والد صاحب عمر بھر صدر جماعت رہے۔ تبلیغی نشستیں، بحث مباحثہ اور سوال و جواب ہوتا رہتا تھا۔ ہم بھائی بھی اپنے اپنے دائرہ میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا جب بھی شہر میں مخالفت کی رَو چلتی تو ہمارا گھرانا ہی زیادہ تر نشانہ بنتا تھا۔ بایں ہمہ والد صاحب کو شہر میں ایک عزت و وقار کا مقام حاصل تھا۔ مخالف بھی اکثر احترام سے پیش آتے تھے۔

1953ء میں لاہور میں فسادات ہوئے تو دوسرے شہروں میں بھی جلوس نکلے تھے۔ بورے والا میں بھی آگ بھڑکائی گئی تھی اور ڈنڈے اور پتھر لے کر ہجوم نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ کھڑکی سے ابا جی صورتحال کا جائزہ لیتے رہے۔ جب ہجوم منتشر نہ ہوا تو وہ دروازہ کھول کر سامنے آ گئے۔ ہجوم ذرا ہٹ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ ابا جی نے پوچھا ''آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔'' مطالبہ ہوا ''بس ایک بار آپ اُن کی نبوت کا انکار کر دیں۔'' ابا جی نے بڑے وثوق سے جواب دیا ''نہیں۔ یہ خواہش تمہاری کبھی پوری نہ ہوگی۔ وہ نبی تھے اور ضرور تھے۔'' انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور ہجوم بکھرنے لگا۔

24 ستمبر 1963ء کو اچانک وفات ہوئی تو سارا شہر ہل کر رہ گیا تھا۔ احمدی احباب کے علاوہ بیسیوں غیر از جماعت احباب جنازہ میں شمولیت کے لئے آئے اور چہرہ بھی دیکھا۔ کئی روز تک لوگ تعزیت کے لئے آتے رہے۔ ان میں معززین شہر بھی تھے اور مخالفین جماعت بھی۔ مرحوم کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر ہوتا۔ کئی غیر احمدی معزز شہریوں نے کہا ''سچی بات تو یہ ہے کہ شہر میں اگر کوئی مسلمان تھا تو یہ شخص تھا۔'' کئی ایک نے تو مرحوم کے لئے 'ولی' کا لفظ بھی استعمال کیا۔ مرحوم بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا رہے۔ آمین

والد محترم کی دعائیں اور ہم بھائی

ہم بھائی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خدمت دین کی جو توفیق ہمیں نصیب ہوئی ہے اور تبلیغ کا جوشوق و ذوق ہمیں عطا ہوا ہے۔ یہ سب والد صاحب کی تعلیم و تربیت اور دعاؤں کے ہی طفیل ہے۔ خصوصاً جو تبدیلی اس ضمن میں ان کی وفات کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کو تو غیر بھی محسوس کرتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس تبدیلی کا کسی قدر ذکر یہاں کر دیا جائے۔

1۔ مکرم عبدالرحیم ہمٗتہ صاحب میرے بڑے بھائی ہیں۔ والد صاحب نے انہیں میٹرک کے بعد بہتر تعلیم و تربیت کے

لئے تعلیم الاسلام کالج قادیان میں 1944ء میں داخل کرایا۔ اس طرح انہیں مذکورہ کالج کی پہلی فسٹ ایئر کلاس کے طالب علم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ چونکہ آپ شروع سے ہی ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور اسی طرف زیادہ توجہ تھی، اس لئے طالب علمی کے زمانے میں ایف۔اے سے آگے نہ بڑھ سکے اور اباجی کی انتہائی خواہش اور کوشش کے باوجود یہ بی۔اے پاس نہ کر سکے تھے۔ پھر 1950ء کے قریب انہوں نے ملازمت اختیار کر لی اور شادی کے بعد عیال دار ہو گئے۔ اباجی کی وفات کے بعد اچانک ان میں تبدیلی آئی اور انہوں نے 1966ء میں بی۔اے پاس کیا اور پھر پہلے ایم۔اے (اردو) اور پھر ایم اے (اسلامیات) بھی پاس کر لیا۔ اردو ادب سے لگاؤ اور مذہبی لٹریچر کے مطالعے کا شوق تو انہیں پہلے ہی تھا۔ ڈگریوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے انہیں علمی اور ادبی حلقوں میں اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا۔ اس وقت ملک کے بعض نامور ادیب ان کی شاگردی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

1950-52ء کی بات ہے کہ بھائی صاحب نے پیغامی مؤقف کے ردّ میں ایک خط عبدالرحمٰن مصری صاحب کو لکھا تھا۔ جواباً مصری صاحب نے آٹھ دس صفحہ کا خط ان کو لکھا۔ جواب الجواب کے طور پر بھائی صاحب نے ایک مضمون لکھا جو الفضل میں کئی قسطوں میں چھپا۔ اس کی تعریف میں حضرت مرزا بشیر احمدؓ نے اُن کو خط لکھا تھا اور مزید نکات بھی بیان فرمائے تھے۔ اس کے بعد جب والد صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملے تو حضورِ اقدس نے بھی اس مضمون کی تعریف فرمائی تھی۔ (افسوس کہ یہ ریکارڈ 1974ء کے گھراؤ جلاؤ میں ضائع ہو گیا۔)

والد صاحب کی وفات کے بعد دیگر گھریلو ذمہ داریوں کو بھی بھائی صاحب نے خوب نبھایا اور ہم بھائیوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ بیوہ والدہ صاحبہ کی خدمت کا بھی ان کو خوب موقع ملا۔ والد صاحب کی طرح صحت جسمانی سے بھی بھائی صاحب غافل نہیں رہے۔ شکار میں ان کا نشانہ لڑکپن سے ہی مثالی تھا۔ چاہے وہ غلیل کا ہو یا بندوق کا۔

اسی طرح علاقے میں ہاکی کے فروغ اور سکول اور کالج کے کھلاڑیوں کی تربیت میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا اور بوریوالہ کے ایک کھلاڑی رانا احسان اللہ نے ورلڈ کپ میں پاکستان کی ٹیم میں شمولیت کی۔ اس سال پاکستان ورلڈ کپ جیتا تھا۔ اسی طرح شہر کی ہاکی کلب نے ان کی سرکردگی میں ایک دفعہ گجرات میں منعقدہ آل پاکستان ہاکی ٹورنامنٹ بھی جیتا تھا۔

علمی اور صحتِ جسمانی کے میدان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمتِ دین کی بھی توفیق عطا فرمائی۔ 1974ء کے بعد کچھ عرصہ بوریوالہ کی جماعت کے سیکرٹری مال اور سیکرٹری اصلاح وارشاد کے طور پر کام کرتے رہے۔ پھر صدر جماعت اور ضلع وہاڑی کے امیر مقرر ہوئے اور اب 84 سال کی عمر میں بھی صدر جماعت اور امیر ضلع کے طور پر کام کرنے کی توفیق پا رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے خدمت دین کا جو اعزاز بورے والہ میں ہمارے گھرانے کو والد صاحب مرحوم کے زمانہ میں حاصل تھا وہ اب بھی بھائی صاحب کے ذریعہ حاصل ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی غیبی ہاتھ نے اچانک بیٹے کو اٹھا کر باپ کی جگہ

بٹھادیا ہو۔

دعوت الی اللہ کا شوق تو ورثہ میں ملا ہی تھا۔ جو نشستیں اباجی کے زمانے میں ہوتی تھیں، اب بھی بھائی صاحب کے ہاں جاری ہیں الحمدللہ۔

2۔ اسی طرح خاکسار کو جو بارہ سالہ ملازمت چھوڑ کر وقف کی سعادت نصیب ہوئی وہ بھی بلاشبہ اباجی مرحوم کی تمناؤں اور دعاؤں کی ہی مرہونِ منت ہے۔ اسی نعمتِ خداوندی کا ذکر اور شکر اصل غرض و غایت ہے میری اس سرگزشت کی جو میں لکھ رہا ہوں۔

3۔ مجھ سے چھوٹے بھائی عبدالوہاب بُھٹہ کی صحت شروع سے ہی کمزور تھی۔ وہ میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکا تھا۔ اباجی کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو ہمت دی۔ اس نے ذاتی محنت سے آرٹسٹ کے طور پر اچھی مہارت حاصل کر لی اور پینٹنگ میں نام پیدا کیا۔ تبلیغ کا شوق تھا اور دوکان پر لٹریچر رکھتا تھا اور ایک بیعت بھی کرائی تھی۔ 1974ء کے فسادات میں اس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔ دھمکیاں دی گئیں اور اس کے قتل کے فتوے دیواروں پر لکھے گئے لیکن میرے اس بھائی کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ اس نے بھی پورے صبر و استقلال کے ساتھ ان سنگین حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں وہ ۶۵ سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین

4۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی عبدالمنان بُھٹہ ہیں۔ انہیں بھی والد صاحب نے بہتر تعلیم و تربیت کے لئے میٹرک کے بعد تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخل کرایا۔ جہاں سے انہوں نے بی۔ ایس سی 1960ء میں پاس کی۔ پھر بی۔ ایڈ کرنے کے بعد بورے والہ کے ہائی سکول میں ہی ان کی بطور سائنس ٹیچر تقرری ہوئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایم۔ ایڈ کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی اور چند سال اُسی یونیورسٹی کے ادارۂ تعلیم و تحقیق میں پی ایچ۔ ڈی (ایجوکیشن) کی طالب علمی کے دوران مذکورہ ادارہ میں لیکچرار بھی رہے۔ 1974ء کے فسادات سے متاثر ہونے کی وجہ سے پی ایچ۔ ڈی تو مکمل نہ کر سکے مگر نصرت جہاں سکیم کے تحت دونوں میاں بیوی نے وقف کر دیا اور سیرالیون میں ٹمبوڈ د کے مقام پر احمدیہ سکول کے پرنسپل کے طور پر کئی سال کام کیا۔ مدت وقف ختم ہونے کے بعد کئی سال تک نائیجیریا میں میرے ہی شہر اجے بواوڈے (Ijebu-ode) کے مسلم گرلز ہائی سکول میں ٹیچر رہے۔ 1986ء میں پاکستان واپس آنے پر انہوں نے پھر گورنمنٹ سروس اختیار کر لی اور 2000ء میں ریٹائر ہوئے اور ربوہ شفٹ ہو گئے۔

اپنے بورے والہ کے قیام کے دوران اکثر صدر جماعت کی اور ضلعی مجلس عاملہ کے ممبر رہے اور پھر کئی سال تک نائب امیر ضلع وہاڑی کے طور پر خدمت کی توفیق ملی۔

اب ربوہ میں بھی کئی سال سے اپنے محلّہ کے صدر صاحب اور زعیم صاحب انصاراللہ کی مجالس عاملہ کے ممبر ہیں۔ انہیں

بھی دعوت الی اللہ کا شوق ورثہ میں ملا ہے۔ پاکستان کے قیام کے دوران غیر از جماعت دوستوں اور ساتھی اساتذہ کو دعوت الی اللہ کرتے رہتے تھے اور ربوہ میں بھی علمی اور دعوت الی اللہ کے پروگراموں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔

اپنے سیرالیون کے قیام کے دوران بھی قصبہ کے مختلف ممالک سے آئے لوگوں اور خصوصاً الحاجیوں کی مجالس میں جماعت احمدیہ کا تعارف اور مختلف مسائل میں جماعت کا مؤقف قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اور ضلعی مقام پر ''مسلم کرسچین برادر ہڈ'' (Muslim Christian Brother Hood) کے اجلاسات میں اسلام اور خصوصاً احمدیت کا نہ صرف تعارف بلکہ آج کی انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کا حل اسلام کی رُو سے بیان کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح نائیجیریا میں اجے بُواوڈے کے قیام کے دوران بھی نہ صرف جماعتی مجالس میں انہیں تقاریر کا موقع ملا بلکہ کئی دفعہ ملحقہ قصبات میں دعوت الی اللہ کے لئے بھی جاتے رہے۔

1974ء کے فسادات میں بورے والہ میں ہمارے گھر کو بھی نشانہ بناتے ہوئے لوٹا گیا۔ توڑ پھوڑ کی گئی اور باہر نکال کر سامان جلایا گیا اور گھر کو آگ لگا دی گئی۔ تینوں بھائیوں نے مع رحیم صاحب کے دو بیٹوں کے مختصر مقابلہ کے بعد حکام بالا کے کہنے پر پڑوسی کے گھر میں پناہ لی۔ وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالے گئے اور ہجوم نے گھیر لیا۔ موت سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ایک آخری اجتماعی دعا کے لیے انہوں نے ہاتھ اٹھائے۔ اور پھر اچانک اللہ تعالیٰ نے اعجازی طور پر ایسے حالات بدلے کہ بچا لیے گئے۔

ہم سب بھائی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل خلیفۂ وقت اور ہمارے والد محترم کی دعاؤں کے طفیل ہی ہم پر ہوا تھا۔ باپ کے نام کی لاج تھی جو اللہ تعالیٰ نے رکھ لی تھی ورنہ ہم جانتے ہیں جو ہم تھے اور ہیں۔

چوہدری فضل کریم بھٹہ
(1893 - 1963)

عبدلوہاب بُھٹہ
ہم بھائی
عبدالمنان بُھٹہ
عبدالرحمٰن بُھٹہ
عبدالرحیم بُھٹہ
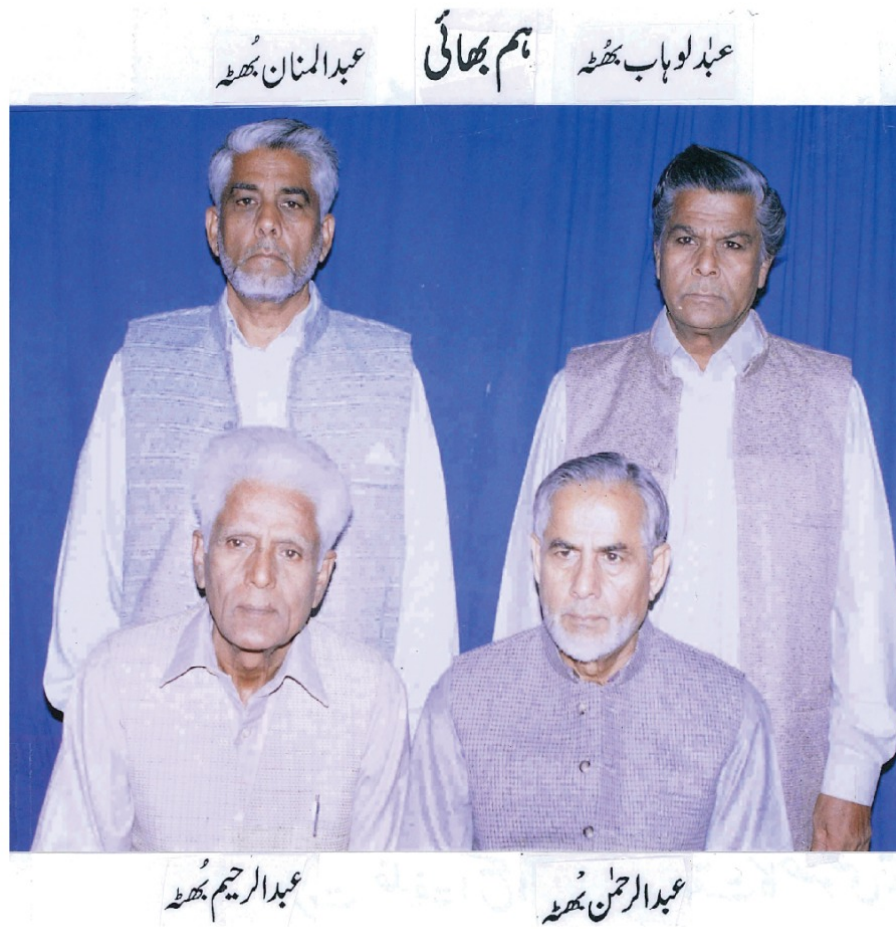
شرف شاگردی

(کچھ یادیں کچھ باتیں)

1951ء میں این۔اے۔سی ہائی سکول بوریوالہ ضلع ملتان سے جہاں خاکسار کے والد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔میٹرک کا امتحان دیتے ہی میں نے کالج کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔کالج تو ہمارے شہر ''بورے والا'' کے قریب ساہیوال اور ملتان میں بھی موجود تھے لیکن میرا دل لاہور جانے کو چاہتا تھا۔میرے ذہن میں لاہور کے گورنمنٹ کالج اور ایف۔سی کالج تھے۔تعلیم الاسلام کالج کا تو علم نہ تھا۔

والد صاحب سے میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو دوسرے ہی روز وہ مجھے لاہور تعلیم الاسلام کالج لے گئے۔وہاں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ان دنوں پرنسپل تھے۔ملاقات کے دوران جب میں نے بتایا کہ میں میڈیکل کے مضامین لینا چاہتا ہوں تو حضرت صاحبزادہ صاحب نے فرمایا:

''ہمارا کالج لاہور میں ابھی نیا ہے۔میڈیکل کی کلاسز کا ابھی انتظام نہیں ہوا'' آپ نے مشورہ دیا کہ گورنمنٹ کالج بہتر رہے گا اور فرمایا کہ وہاں جا کر قاضی محمد اسلم صاحب سے مل لیں۔چنانچہ ہم گورنمنٹ کالج گئے اور قاضی صاحب سے ملے۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میٹرک میں تمہیں کتنے نمبروں کی امید ہے۔میں نے بتایا کہ امید ہے کہ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاؤں گا۔اس پر قاضی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔رزلٹ جب نکل آئے گا تو آ جانا۔اسی روز شام کو ہم لاہور سے واپس بورے والہ آ گئے۔

رزلٹ نکلا تو میں خدا کے فضل سے اچھی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا۔میں لاہور گیا اور قاضی صاحب سے ملا۔آسانی سے گورنمنٹ کالج میں داخلہ ہو گیا۔سب مراحل انٹرویو وغیرہ بغیر کسی پریشانی کے طے ہو گئے تھے۔چند دن بعد کالج کی ہاکی ٹیم کے لئے بھی منتخب ہو گیا تھا۔

گورنمنٹ کالج سے تعلیم الاسلام کالج میں

گورنمنٹ کالج میں داخلے کی کاروائی کے دوران میں تعلیم الاسلام کالج کے ہوسٹل میں مکرم سمیع اللہ صاحب سیال کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔اور اس طرح دونوں کالجوں کے درمیان میرا آنا جانا رہتا تھا۔مجھے داخلہ لئے دو تین ہفتے ہو گئے تھے۔اب گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں داخلے کا سوچ رہا تھا۔

ایک روز میں گورنمنٹ کالج سے ٹی۔آئی کالج کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے حضرت صاحبزادہ صاحب کی Moris Minor گاڑی کو سامنے سے آتے دیکھا۔گاڑی آئی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔آپ نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا

اورفرمایا

''ہم نے میڈیکل کی کلاسز کا انتظام کرلیا ہے۔تم اگر چاہوتو ادھر آ سکتے ہو۔''

گاڑی روانہ ہوگئی اور میں آہستہ آہستہ ٹی۔آئی کالج کی طرف چلتے ہوئے خوشی اور تعجب سے یہ سوچ رہا تھا کہ آپ مجھے پہچانتے ہیں اورانہیں میری وہ چندمنٹ کی پہلی ملاقات بھی یاد ہے جو والد صاحب کے ساتھ کی تھی اور جس پر اب تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے۔

میں سیدھا ٹی۔آئی کالج کے دفتر گیا اور داخلے کی کارروائی مکمل کر لی۔اور پھر گورنمنٹ کالج اور اس میں داخلے کو بھول گیا۔حضرت صاحبزادہ صاحب کے شفقت بھرے فرمان کی بدولت مجھے آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔اور یہی ''شرفِ شاگردی'' آگے چل کر میری زندگی کا ایک بابرکت موڑ اور انمول سرمایا ثابت ہوا۔اور ''سعادتِ وقف'' کے حصول کا پیش خیمہ بنا۔

تعلیم الاسلام کالج لاہور میں میرے دو سال

تاثرات وواقعات

تعلیم الاسلام کالج لاہور میں گزارے وہ دو سال میری زندگی کے اہم ترین سال تھے۔ وہاں اُس وقت کے پرنسپل حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کی نگرانی اور مہربانی کے سایہ تلے مجھے خان نصیر خان صاحب اور مکرم سلطان محمود شاہد صاحب ایسے خلیق اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اور ہوسٹل میں مکرم چودھری محمد علی صاحب اور مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب ایسے عظیم بزرگان کی تربیت سے فیضیاب ہوا۔

''استاد اور شاگرد'' کے رشتہ کو یوں تو ہر جگہ ایک تقدس حاصل ہوتا ہے۔لیکن وہاں کی بات تو کچھ اور ہی تھی۔ وہاں اس ''رشتۂ شاگردی'' کے مرکزی پھول کے ارد گرد ابوّت واخوت، شفقت والفت اور احترام وعزت قسم کے بہت سے خوشنما پھول کچھ اس طرح سجے تھے کہ پورا ماحول ایک حسین گلدستہ سا بن گیا تھا اور ان پھولوں کی مہک زندگی بھر قلب ونظر کو جلا بخشتی رہی ہے۔

نشیب وفراز سے بھر پور اور کرب وقرار سے معمور اپنی نصف دنیا پر پھیلی شاہراہ حیات کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو نظر تشکّر، ماں کی گود کے بعد، اسلام کے اسی گہوارے پر جا کر ٹھہرتی ہے جس نے زندگی کے اُس نازک موڑ پر اس طفل نادان کی تعلیم وتربیت کے شیرِ شیریں سے پرورش کی اور اخلاقی اور روحانی اقدار کے آب حیات سے اس کے درخت شعور کی آبیاری کی اور اس کو زندگی کے میدانِ کارزار میں قدم رکھنے کے قابل بنایا۔

ان بزرگ اساتذہ کرام کی عنایات کی حد تو یہ ہے کہ میدان عمل میں اتار کر اپنے ذہنوں سے نہیں اُتارا۔ زندگی میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا خلوص اور پیار کی زبان سے یہی پیغام ملا۔''تم آج بھی ہمارے شاگرد ہو''

تعلیم الاسلام کالج میں صرف دو سال میں نے گزارے تھے۔ کالج میں کسی ایسی سرگرمی میں بھی کوئی حصہ نہ لیا تھا جس سے میں نمایاں ہو کر نظر میں آ جاتا۔ میں ایک خاموش طبع سا لڑکا تھا جس کو اس کی کلاس کے اکثر لڑکے بھی نہ جانتے تھے۔لیکن میرے یہ قابل صد احترام اساتذہ عمر بھر مجھے اس طرح جانتے پہچانتے رہے جیسے ایک میں ہی ان کا شاگرد رہا تھا۔ اور یہ سب خلوص و پیار مجھ سے صرف اس لئے تھا کہ حسنِ اتفاق سے میں نے لڑکپن میں دو سال ٹی۔ آئی کالج میں گزارے تھے۔

2000ء میں مَیں پندرہ سال بعد پاکستان گیا۔ چودہری محمد علی صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا تو وہ ابھی آئے نہ تھے۔ میں برآمدہ میں کھڑا یہی سوچتا رہا کہ چودہری صاحب سے ملے تو تقریباً سولہ سترہ سال ہو گئے ہیں۔ میں اپنی پہچان اس حوالے سے کراؤں گا۔

اتنے میں چودہری صاحب آتے نظر آئے۔ وہی سیاہ چشمہ اور صاف ستھرا چمکتا لباس، البتہ اب کے ہاتھ میں چھڑی

تھی۔ میں آہستہ سے آگے بڑھا تو دیکھتے ہی میرا نام پکارا۔ میں جلدی سے ان سے لپٹ گیا۔ دفتر میں بیٹھے بے تکلّفی سے ایسے باتیں کرتے رہے جیسے یہ سولہ سال کا فاصلہ کبھی آیا ہی نہ تھا۔ میں دل میں ندامت محسوس کر رہا تھا کہ میں نے ان کی شفقت اور ذہانت کا کتنا غلط اندازہ لگایا۔

2005ء میں پھر میں پاکستان گیا تو ربوہ میں اقصیٰ روڈ پر میرے چھوٹے بھائی عبدالمنان بھٹّہ نے کہا ''وہ دیکھو ڈاکٹر سلطان محمود شاہد صاحب۔'' وہ رکشا میں بیٹھے ایک ریڑھی والے سے پھل خرید رہے تھے۔ ان سے ملے تو بیس پچیس سال کا عرصہ ہوگیا ہوگا۔ اگر بھائی نہ بتاتا تو شاید میں پہچان نہ سکتا۔ ہم گئے تو انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملے اور باتیں کرتے رہے۔ اسی طرح مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب اور خان نصیر خان صاحب سے جب بھی ملا۔ بڑے خلوص اور پیار سے ملتے رہے اور پھر سب سے بڑھ کر تو اس وقت کے پرنسپل حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کی نظرِ عنایت تھی جو ہمیشہ اس عاجز پر رہی۔ اور جس کا ذکر اگلے صفحات میں بار بار آئے گا۔ خصوصاً ''سعادتِ وقف'' اور ''نائیجیریا کے حالات'' کے تحت۔

حدیث میں ہے کہ انسان کے ''تین باپ'' ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس نے پیدا کیا۔ دوسرا وہ جس نے اس کو اپنی بیٹی دی اور تیسرا وہ جس نے اس کو تعلیم دی۔ اور مجھے زیورِ تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے والے یہ کرم فرما اس حدیث کی صداقت کے عظیم مظہر اور آئینہ دار تھے۔

اُس دَور کے چند واقعات

تعلیم الاسلام کالج لاہور میں گزارے 1951ء سے 1953ء تک کے دو سالوں کے کچھ واقعات درج کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض واقعات تو زندگی کی 56 سالہ تگ ودو میں ذہن سے اتر چکے تھے۔ وہ تو یادداشت پر زور دے کر کچھ ''زنگ'' صاف کیا اور ''جالے'' اتارے تو پرانی یادوں کے نقوش واضح ہونے لگے۔ تاہم بعض واقعات توانمٹ نقوش چھوڑ گئے اور ذہن میں ہمیشہ تازہ رہے۔ خصوصاً وہ جن کا تعلق جناب پرنسپل صاحب کے مشفقانہ سلوک سے یا 1953ء کے ہنگاموں سے ہے۔

1۔ سب سے پہلے تو میں تکلف اور تصنّع سے پاک اُس سادہ اور ستھرے دینی ماحول کا ذکر کروں گا جو اس کالج میں میسر آیا تھا۔ کوئی شور وغوغا تھا نہ سخت کلامی۔ کوئی لڑائی جھگڑا تھا نہ باہمی رنجش وکدورت، بس پیار ومحبت سے معمور اور سکون وطمانیت سے بھرپور ہنستی مسکراتی سی فضا تھی۔ اس میں ایک طرف شستہ مذاق، ادبی چٹکلے، شعر وشاعری اور لطائف اگر خوشیاں بکھیر رہے تھے تو دوسری طرف صبح کی تلاوت، پنج وقتہ اذان، باجماعت نماز اور قرآن وحدیث کے درس اس میں تقدس کا رنگ بھر رہے تھے۔ مکرم چودھری محمد علی صاحب اور مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب ایسے بزرگوں کا مربیّانہ سلوک ایک نعمتِ عظمٰی سے کم نہ تھا۔ جن سینئر طلباء کی رہنمائی اور نگرانی شامل حال رہی اُن میں مکرم سمیع اللہ صاحب سیال، چودھری حمید اللہ صاحب، مکرم مبارک مصلح الدین صاحب، مکرم بشیر احمد صاحب رفیق اور مکرم رفیق احمد

ثاقب شامل ہیں۔ یہ سب حضرات اس وقت جماعت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اوران سے شناسائی میرے لیے باعثِ اعزاز ہے۔

2۔ مجھے اگر کوئی مشکل یا شکایت ہوتی تو میں جناب پرنسپل صاحب سے جا کہتا۔ایک روز ہاکی ٹیم کے کیپٹن نے نوٹس لگایا کہ ''آج فلاں کالج کے ساتھ میچ ہے۔سب کھلاڑی تین بجے وہاں پہنچ جائیں۔'' میں نے کیپٹن سے کہا کہ ''آج بعد دوپہر میرا پریکٹیکل ہے۔تین بجے نہ آسکوں گا۔کچھ دیر ہو جائے گی۔'' اس نے سختی سے کہا کہ ''نہیں نہیں پورے تین بجے پہنچنا ہوگا۔'' میں پریشان ہوکر پرنسپل صاحب کے پاس چلا گیا اور جا کر اپنی مشکل بیان کردی۔

آپ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا لیا۔اس پر لکھا ''عبدالرحمٰن آج پریکٹیکل کریں گے۔'' اور وہ کاغذ مجھے دے دیا۔اور پھر جلد ہی وہ ٹکڑا واپس لے کر میرے نام سے پہلے ''عزیزم'' کا لفظ لکھا۔اور پھر مجھے دے دیا۔ میں نے وہ چٹ جا کر کیپٹن کو دے دی۔ہوسٹل کے کمرۂ نماز میں جب نماز ظہر ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ مکرم پرنسپل صاحب پچھلی صف میں عین میرے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔میں وہیں بیٹھا رہا۔نماز کے بعد میں نے سلام کیا تو آپ نے آہستہ سے مجھ سے کہا ''تمہارا کیپٹن آیا تھا۔کہتا تھا کہ اس کو کہہ دیں کہ پریکٹیکل کے بعد آجائے۔اب تم پریکٹیکل ختم کر کے چلے جانا۔''

3۔ عام طور پر تو میں ٹوپی ہی پہنتا تھا۔لیکن انارکلی سے میں نے ایک "Hat" (ہیٹ) بھی خرید لیا تھا۔کبھی تیز دھوپ میں نکلنا پڑتا تو میں وہ سر پر رکھ لیتا۔ایک روز بعد دوپہر سخت دھوپ تھی۔میں کالج سے باہر لیٹر بکس میں خط ڈالنے نکلا تو ہیٹ سر پر رکھ لیا۔کالج بند تھا اور ہر طرف خاموشی تھی۔گیٹ کے قریب پہنچا تو گیٹ کیپر ''شادی'' نے روک کر ایک طرف اشارہ کیا۔میں نے مڑ کر دیکھا تو جنید ہاشمی صاحب بلا رہے تھے۔میں گیا تو انہوں نے دفتر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''آپ کو اندر بلایا جا رہا ہے۔'' میں سخت گھبرایا۔ہیٹ کو ہاتھ میں پکڑے میں اندر گیا۔سلام کر کے کھڑا رہا۔حضرت صاحبزادہ صاحب نے دیکھا اور مجھ سے پوچھا ''تمہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کتنی محبت ہے؟'' میں نے کچھ سوچ کر عرض کی ''جی اس کا تو اندازہ مشکل ہے۔'' آپ نے فرمایا ''حضور کو یہ ہیٹ کا پہننا پسند نہ تھا۔'' میں نے وضاحتاً عرض کی۔''جی میں اس کو عام طور پر تو نہیں پہنتا۔بس کبھی دھوپ تیز ہو تو سر پر رکھ لیتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا ''ٹوپی سے بھی دھوپ سے بچا جا سکتا ہے۔'' میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی نہیں پہنوں گا۔

4۔ میں ایک دفعہ بیمار ہو گیا۔ہوسٹل کے ڈاکٹر کے علاج سے آفاقہ نہ ہوا۔دو دن بعد مجھے Sick Room میں شفٹ کر دیا گیا۔مکرم پرنسپل صاحب مجھے دیکھنے آئے۔پھر ایک سپیشلسٹ کو بلایا گیا۔تیسرے روز وہی ڈاکٹر صاحب پھر مجھے دیکھنے آئے۔اُس کے علاج سے میں ٹھیک ہو گیا۔

اچانک میرے والد صاحب مجھے دیکھنے آگئے۔شاید اُن کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ہم دونوں مکرم پرنسپل صاحب سے

دفتر میں ملے۔ والد صاحب نے شکریہ ادا کیا اور میرے علاج کے اخراجات کی ادائیگی کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ کالج کا میڈیکل فنڈ خدا کے فضل سے اچھا Strong ہے۔" بعد میں جب میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں نے ان سپیشلسٹ ڈاکٹر صاحب کو پہچان لیا تھا۔ وہ ہمارے پروفیسر آف میڈیسن ڈاکٹر پیرزادہ تھے۔

5۔ ہوسٹل میں ڈسپلن اچھا تھا۔ مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب نگران تھے اور طلباء پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ نماز فجر میں لیٹ آنے والوں میں میرا نام بھی کبھی کبھی آ تا تھا۔ مجموعی طور پر میرا خیال ہے کہ میں نے ان کو شکایت کا موقع کم ہی دیا ہوگا۔ مجھ سے زیادہ تر نرمی اور شفقت کا سلوک ہی کرتے تھے۔

ایک روز میں نے روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' میں پڑھا کہ آج رات آٹھ بجے Y.M.C.A. ہال میں "الوہیت مسیح" پر لیکچر ہوگا۔ مقرر انگریز تھا۔ میں نے مکرم صوفی صاحب سے کہا کہ میں اس لیکچر کو سننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا کہ عشاء کے بعد کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تاہم تمہارے لئے استثنٰی کر لیتے ہیں۔ "شادی" سے کہہ دیا کہ میرے لئے گیٹ کھول دے۔

لیکچر کے بعد ایک بزرگ اٹھے اور بائیبل کو اوپر اٹھا کر سوال کیا کہ اس میں سے مسیحؑ کا ایک قول ہی دکھا دیں جہاں انہوں نے خود کہا ہو کہ "وہ خدا ہیں۔" مترجم نے سوال کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مقرر نے جواب دیا کہ مسیح کا قول تو نہیں ہے لیکن ہم ان کے کاموں سے اخذ کرتے ہیں کہ وہ خدا تھے۔ وہ بزرگ دوسرا سوال کرنے لگے تو ان کو اجازت نہ دی گئی۔ دیگر حاضرین میں سے ایک دو نے چھوٹے سے سوال کئے اور پھر ہال میں خاموشی چھا گئی۔ وہ بزرگ پھر اٹھے اور سوال کیا لیکن مترجم نے انگریزی میں ترجمہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ انگریزی میں بات کریں۔ اس پر وہ بزرگ بولے کہ انگریزی میں سوال جواب سے اکثر حاضرین فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ لیکن مترجم نہ مانا۔ اس پر حاضرین میں بے چینی سی پھیل گئی اور کھسر پھسر ہونے لگی۔ اس پر اجلاس ختم کر دیا گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بزرگ "عبدالرحمٰن موگا" تھے۔ یہ احمدی بزرگ عیسائیت پر اچھا عبور رکھتے تھے۔

6۔ میرے پاس ایک "پاکٹ سائز" کا قرآن کریم ہوتا تھا۔ ایک روز صوفی صاحب نے دیکھا تو اپنی جیب سے بالکل ویسا ہی پاکٹ سائز قرآن کریم نکال کر مجھے دکھایا۔ اور پھر فرمایا۔ "آؤ ان کو بدل لیں۔ یہ ہمیں ایک دوسرے کو دعا میں یاد رکھنے میں مدد دیں گے۔" انہوں نے اپنا نام لکھ کر اپنا قرآن کریم مجھے دے دیا اور میں نے اپنا ان کو دے دیا۔ آج تقریباً ساٹھ سال بعد بھی وہ صوفی صاحب والا قرآن کریم میرے پاس موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ تاہم مجھے شرمندگی ہے کہ دعاؤں میں اس طرح یاد نہیں رکھ سکا جس طرح چاہیئے تھا۔ مجھ ایسے لوگ بزرگوں کی توقعات پر پورا کب اترتے ہیں!

ایک دفعہ ایک لڑکے نے ہوسٹل کے برآمدہ میں مجھے بتایا کہ ہم چندلڑکے صوفی صاحب کے ساتھ کھڑے باتیں کررہے تھے۔صوفی صاحب نے ہم سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ہمارے ہوسٹل میں "Ideal Student" کون ہے۔ہم سوچتے رہےاور کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھرصوفی صاحب نے تمہارا نام لیااور کہا ''وہ میڈیکل کا سٹوڈنٹ ہے ہاکی ٹیم کاممبر ہےاور دینی لحاظ سے بھی ٹھیک ہے۔''میں نے سناتو خاموشی سے سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے کچھ اس قسم کا فکر دامنگیر ہو گیا تھا کہ میں اس ''حُسنِ ظن'' کا بھرم کیسے رکھ سکوں گا۔

7۔ مستنصر باللہ میرا بے تکلف دوست تھا،ظرافت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔خوب ہنساتا تھا۔ہم اکثر شام کو باہر کی طرف گھومنے نکل جاتے اور ایک دودھ والے کی دوکان سے دودھ پیتے اور کبھی کبھی برفی بھی کھاتے۔

ایک روز اس نے کہا کہ آج مال روڈ کی طرف چلنا ہے۔کچھ کام ہے۔میں سائیکل پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ہمیں وہاں دیر ہوگئی اور واپسی پر اندھیرا چھا چکا تھا۔سائیکل پر لائیٹ نہیں تھی اور پھر ڈبل سواری۔''نیلہ گنبد'' کے قریب پولیس مین نے پکڑ لیا۔چالان بک نکال کر اس نے قلم ہاتھ میں لی اور کہا ''نام بتاؤ'' میرے دوست نے بہت منت سماجت کی لیکن سپاہی نہ مانا اور بار بار نام پوچھتا رہا۔پھر میں نے بھی اس کو''حوالدار جی'' کہہ کر معافی مانگی لیکن وہ چالان کرنے پر بضد رہا۔بالآخر میرے دوست نے نام بتایا۔''مستنصر باللہ۔'' سپاہی نے چونک کر کہا'' کیا کہا؟'' میرے دوست نے پھر کہا ''مستنصر باللہ۔'' سپاہی چالان بک پر قلم ٹکائے کچھ سوچتا رہا۔پھر بولا''اچھا!اس دفعہ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔اگر آئندہ غلطی کی تو نہیں چھوڑوں گا۔'' باقی راستہ تو ہم نے پیدل ہی طے کیا لیکن راستہ بھر ہنستے رہے کہ مشکل نام رکھنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے۔

8۔ ایک روز ہوسٹل میں نماز عشاء کے بعد تقریری مقابلہ ہوا۔موضوع تھا''اسلام زندہ مذہب ہے''جج تھے مکرم شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ۔میں اور مستنصر سامعین میں پیچھے بیٹھے تھے۔جب آخری مقرر تقریر کررہا تھا۔تو میں نے مستنصر سے آہستہ سے کہا کہ سب نے جو دلائل دیئے ہیں اُن سے اسلام کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام ہی زندہ مذہب ہےاور دوسرے مذاہب مردہ ہیں۔مستنصر سنتے ہی اٹھا اور جا کر میرا نام پیش کر دیا۔اور ساتھ ہی آخری مقرر نے تقریر ختم کر دی اور فوری طور پر میرا نام پکارا گیا۔میں گیا اور جا کر میں نے یہ بات کہہ دی کہ یہ جو دلائل دیئے گئے ہیں ان سے صرف دوسرے مذاہب پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔اور پھر میں نے کہا کہ اسلام کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ صرف اسلام کے ذریعہ ہی خدا سے زندہ تعلق قائم ہوسکتا ہے۔میں نے کچھ مثالیں بھی دیں۔اور کہا کہ دوسرے مذاہب تو صرف ایسے رنگین خوبصورت بلبوں کی طرح ہیں جو فیوز ہو چکے ہوں۔اُن سے روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔

بعد میں شیخ صاحب نے مجھے کہا کہ اصل بات تو تم نے ہی کہی لیکن تم اگر نکتہ چینی نہ کرتے تو اول آ سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ میرا تو مقابلہ میں حصہ لینے کا ارادہ نہ تھا۔ بس تقریروں کو سن کر مجھے یہ خیال آ گیا۔ شیخ صاحب نے کہا

''So you were provoked to speak on the topic''

اس واقعہ کے بعد مجھے یہ زعم ہو گیا کہ میں بھی تقریر کر سکتا ہوں۔ اگلی دفعہ میں باقاعدہ تیاری کر کے مقابلہ میں شامل ہوا لیکن ایک دو منٹ بھی ٹھیک سے نہ بول سکا۔ باقی کسر بعض سامعین کی دبی دبی ہنسی اور ''ہوٹنگ'' نے پوری کر دی۔ وقت سے پہلے ہی صدر نے گھنٹی بجا کر میری جان چھڑائی۔ پھر کبھی میں نے جرأت نہ کی۔

9۔ ''کالج لائف'' شروع کئے ایک دو ماہ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا پاجامہ پہن کر کالج آیا ہے۔ بعد دوپہر فزکس کا پریکٹیکل تھا۔ میں بھی پاجامہ پہن کر چلا گیا۔ خان نصیر خانصاحب دوسرے لڑکوں کو دیکھتے، ہدایات دیتے آہستہ آہستہ میرے پاس آئے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے چٹکی لی اور میرے کان میں کہا ''یہ کیا پہن کر آ گئے ہو۔'' میں نے آہستہ سے جواباً کہا ''یہ لڑکا بھی تو پاجامہ پہنے ہے۔'' خان صاحب نے کہا ''ارے اس کا تو سفید ہے'' بہت شرمسار ہوا۔ میرا پاجامہ دھاری دار تھا۔

10۔ فرسٹ ایئر کے انہی ابتدائی ایام کی بات ہے کہ فزکس کی کلاس میں مَیں اوپر جا کر بیٹھا تھا۔ ایک لڑکے نے مجھے چھیڑا اور میں نے بھی اس کو کہنی مار دی۔ خان نصیر خانصاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ مجھے بلایا۔ میں آہستہ آہستہ اتر کر کھڑا ہو گیا۔ خانصاحب نے کہا ''ادھر آؤ میرے پاس'' میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ اپنے بائیں رخسار پر رکھ لیا۔ خانصاحب فوراً بولے۔ ''نہیں نہیں یہ سکول نہیں۔ کالج میں ہم مارتے نہیں۔'' میرے ہاتھ کو پکڑ کر انہوں نے نیچے کیا اور کان کی لَو کو پکڑ کر آہستہ سے مسلا اور وارننگ دی۔

بعد میں لڑکے مجھے یہ کہہ کر چھیڑتے ''کالج میں ہم مارتے نہیں۔ صرف کان کھینچتے ہیں''

اب سوچتا ہوں کہ اگر وہ ایک آدھ مجھے ''لگا'' دیتے تو کالج کا کیا بگڑتا تھا۔ شاید میری اصلاح ہو جاتی۔ اور پھر تھا بھی تو اسی لائق۔ ''تھا'' ہی نہیں، اب بھی ہوں۔ اپنے ان مہربان اساتذہ کو یاد کر کے بے ساختہ دعا نکلتی ہے دل سے ؎

''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

11۔ 1953ء کے یادگار ایّام

ٹی۔ آئی۔ کالج کے دو سالہ دور کے آخری ایام تو کئی لحاظ سے یادگار بن گئے تھے۔ 1953ء کے آغاز کے ساتھ ہی F.Sc. کے فائنل امتحان کا خوف محسوس ہونے لگ گیا تھا۔ تیاری تو کوئی خاص ہوئی نہ تھی۔ ''میڈیکل کلاسز'' کا بندوبست جو ہوا تھا وہ یہ تھا کہ میڈیکل کے طلباء ''بیالوجی'' کی کلاس M.A.O کالج میں Attend کر لیا کریں گے۔ چنانچہ ہم سائیکلوں پر اُدھر

بھاگتے اور پہنچتے تو نصف پیریڈ نکل چکا ہوتا۔ پھر واپس بھاگتے تو ادھر کا پیریڈ کافی نکل چکا ہوتا۔ پریکٹیکل بھی M.A.O کالج میں برائے نام ہی کر پاتے۔ فرسٹ ایئر تو ایسے ہی کٹا۔ البتہ سیکنڈ ایئر میں ہمیں بیالوجی کا پروفیسر بھی میسر آ گیا تھا اور پریکٹیکل کا سامان بھی۔ تاہم بیالوجی کا کورس ختم نہ ہوسکا تھا۔ یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ اگر .F.Sc میں نمبر اچھے نہیں آئے تو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہوسکے گا۔ اور میں تو لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلے کے خواب دیکھ رہا تھا جس کے لئے کم از کم اچھی سیکنڈ ڈویژن درکار تھی۔ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ میں گورنمنٹ کالج کے داخلے کو چھوڑ کر ٹی۔ آئی۔ کالج میں آیا تھا۔ اگر اب داخلہ نہ ملا تو دوست واحباب طعنہ دیں گے کہ ''گورنمنٹ کالج چھوڑ کر غلطی کی۔'' ''اگر ٹی۔ آئی۔ کالج نہ آتے تو ڈاکٹر بن جاتے۔'' اور یہ طعنہ دور تک جاتا تھا۔ میرے Stakes بہت High تھے۔ میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنے کی صورت میں میرے دین و دنیا دونوں پر زد پڑتی دکھائی دیتی تھی۔

کچھ پڑھائی شروع کی تھی کہ جماعت کے خلاف تحریک چلنے لگی۔ جلسے جلوس نکلنے لگے اور پھر مارچ کے شروع میں ہنگامے اور فسادات شروع ہو گئے۔ احمدی احباب کے گھر بار لوٹے گئے اور جائیدادوں کو آگ لگائی گئی۔ جس کے آسمان تک لپکتے شعلے ہم ہوسٹل میں کھڑے دیکھتے۔ بہت سے احمدی شہید ہوئے۔ ہمارے ہوسٹل پر بھی پتھراؤ ہوا تھا۔ ان حالات میں امتحان تو پس منظر میں چلا گیا تھا۔ پڑھائی نہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ اور امتحان تھا کہ سر پر کھڑا تھا۔

لاہور اور گردونواح کے احمدی لُٹ لٹا کر ''رتن باغ'' اور شیخ بشیر احمد صاحب امیر جماعت لاہور کی کوٹھی میں پناہ گزین تھے۔ غالباً چھ مارچ کا دن تھا کہ ہم طلباء کی حفاظتی ڈیوٹی ان مقامات پر لگی۔ جن تین لڑکوں کو رتن باغ بھیجا گیا۔ ان میں مَیں بھی شامل تھا۔ ہمیں راستہ آتا نہیں تھا لہٰذا لاہور کا ایک خادم ہمیں ساتھ لے کر گیا۔ اس نے اچکن اور ٹوپی پہن رکھی تھی اور چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ ہم میں سے ایک نے کہا۔ ''یار۔ یہ تو بالکل ''قادیانی'' لگتا ہے۔ یہ ہمیں بھی مروائے گا۔'' ہم اُس سے کچھ فاصلے پر چلنے لگے تھے۔ اسی روز فوج بھی آ گئی تھی اور بڑی سڑکوں اور چوراہوں پر فوج کا قبضہ تھا۔ شر پسند عناصر سب چھوٹی سڑکوں اور بازاروں میں گھسے ہنگامہ بپا کئے ہوئے تھے اور انہی بازاروں میں سے ہم گزر کر جا رہے تھے۔ سارا راستہ تو یاد نہیں۔ یہ یاد آتا ہے کہ پرانی انارکلی اور بیڈن روڈ سے بھی گزرے تھے۔ یہ بازار ہجوم سے بھرے تھے۔ ان میں سے گزرتے ہوئے ہم سب ایک دوسرے سے الگ کچھ فاصلے سے چل رہے تھے تاکہ اگر ایک پکڑا جائے تو دوسرا بچ سکے۔ بہت غیض وغضب اور غلیظ زبان دیکھنے سننے میں آ رہی تھی۔

میکلورڈ روڈ پر فوج کا قبضہ تھا اور اس کو کراس کئے بغیر ہم رتن باغ نہ جا سکتے تھے۔ ایک فوجی افسر سے اجازت لی اور پھر ہم سیمنٹ بلڈنگ اور جودھامل بلڈنگ کے قریب سے ہوتے ہوئے رتن باغ میں داخل ہوئے۔

رتن باغ میں احباب لان میں ٹولیوں کی شکل میں کھڑے دبی زبان سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں کھڑے ہو کر

باتیں سننے لگے۔ عصر کا وقت ہوگا کہ ایک کار گیٹ سے داخل ہوئی۔ شیخ بشیر احمد صاحب تھے۔ چہرہ بہت متغیّر تھا۔ خاموشی سے اُوپر چلے گئے۔ جلد ہی پتہ چلا کہ ہجوم نے اُن کی کوٹھی پر حملہ کر دیا تھا اور حفاظت پر مامور طالب علم نے گولی چلا دی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ فوج نے بچا لیا تھا۔ عشاء کے بعد میں پھر گیٹ پر ڈیوٹی دینے لگا۔ دوسرا گیٹ جو ہال روڈ کی طرف کھلتا ہے اکثر بند رہتا تھا۔ اس پر میرے دوستوں نے کچھ دیر ڈیوٹی دی اور پھر جا کر لیٹ گئے۔ اب میں اکیلا تھا۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب میرے پاس آئے اور فرمایا۔ ''گھبرانا نہیں۔ اوپر سے تمہاری نگرانی ہو رہی ہے۔ جب تھک جاؤ تو جا کر سو جانا۔'' تھوڑی دیر بعد باہر سڑک پر ایک فوجی گشت کرنے لگا۔ میں گیٹ کے اندر ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا اور وہ باہر کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ اور پھر بولا ''اندر ہی رہنا، باہر نہ آنا۔''

آدھی رات کے قریب میں رتن باغ کے نماز والے بڑے کمرے میں چلا گیا۔ لوگ وہاں آڑھے ترچھے لیٹے تھے۔ میں بھی انہی میں کہیں لیٹ گیا۔ نیند بالکل نہ آئی۔ بس تھوڑا آرام کر لیا۔ ساری رات گولی چلنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ پھر نماز تہجد کے لئے سب دوست اُٹھ بیٹھے۔ وہ باجماعت نماز تہجد اور اس کی آہ و بکا میری زندگی کا عجب روحانی تجربہ تھا۔

نماز فجر کے بعد میں پھر گیٹ پر ڈیوٹی پر تھا۔ میرے دوسرے دونوں ساتھی دوسرے گیٹ پر تھے۔ جب ذرا دھوپ نکل آئی تو وہ دونوں میرے پاس آئے اور کہا ''ہم باہر ناشتہ کرنے جا رہے ہیں۔ چلنا ہے تو چلو'' میں نے انکار کیا اور ان کو بھی منع کیا کہ اس طرح بغیر اجازت جانا ٹھیک نہیں۔ اور پھر حالات بھی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن وہ چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں نے دیکھا کہ مکرم پرنسپل صاحب نیچے آئے اور کچھ دوستوں کے پاس گئے جو لان میں کھڑے تھے۔ پھر آپ میرے پاس آئے اور پوچھا۔ ''ناشتہ کیا ہے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ آپ نے فرمایا ''آؤ میرے ساتھ۔'' مجھے اوپر لے گئے اور ایک دروازہ کھول کر کہا ''یہاں بیٹھ کر تم ناشتہ کرو'' اور آپ خود نیچے چلے گئے۔ اندر ایک بڑی سی میز پر چائے کی تھرموس، ڈبل روٹی، مکھن وغیرہ سب کچھ تھا۔ شام کو ہم واپس ہوسٹل آ گئے تھے۔

فسادات ختم ہوئے تو امتحان سر پر تھا۔ ان ہنگاموں نے ''اچھے نمبروں'' کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی تھی۔ اب تو پاس ہونا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ مستقبل سے متعلق سارے خواب ٹوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ اب امتحان کیا دینا تھا۔ بس ''لاٹری'' کھیلنے والی بات تھی۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گاہے گاہے میں دعا کے لئے لکھتا رہتا تھا۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں اپنی ساری خامیاں اور خدشات لکھ کر میں نے حضور رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دعا کی درخواست کی۔ امتحان سے چند دن پہلے جوابی پوسٹ کارڈ ملا۔ لکھا تھا ''حضور نے دعا کی ہے اور فرمایا ہے۔ میرا خدا تمہارے ساتھ ہو۔''

امتحان دیا۔ رزلٹ آیا تو میں خدا کے فضل سے اپنے میڈیکل گروپ میں اوّل تھا۔ صرف ایک میری ہی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ مجھے دو سال کے لئے سرکاری وظیفہ بھی ملا اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بھی۔ حضرت مصلح موعودؓ کے خدا نے

مجھے میری امیدوں سے بڑھ کرنواز دیا تھا۔ میری لاج رکھ لی تھی۔ فالحمد للّٰه علیٰ ذالك۔

12۔ ''یااللہ! یہ پیالہ ٹل جائے''

مارچ 1953ء میں لگے مارشل لاء کے دنوں کی بات ہے کہ ایک روز غروب آفتاب کے بعد میں اور مستنصر باللہ ٹہلتے ٹہلتے کالج گیٹ سے ذرا باہر نکل گئے۔ مارشل لاء کی وجہ سے ہر طرف سناٹا تھا۔ اتنے میں ہم نے ایک طرف سے ایک بس آتی دیکھی۔ بس آہستہ آہستہ جب سامنے سے گزری، تو میں نے بے ساختہ کہا۔

''اوئے یہ تو ہمارے بورے والہ کی بس ہے، یہ ادھر کہاں۔'' میرا یہ کہنا تھا کہ بس رک گئی اور ایک فوجی افسر باہر نکلا۔ اس نے سختی سے کہا ''تم نے بس کا مذاق اڑایا ہے۔ نام بتاؤ'' ہمارے رنگ فق ہو گئے۔ میں نے وضاحت کی کہ میں بورے والا کا رہنے والا ہوں۔ اور میں نے تو اپنے دوست کو یہ بتایا ہے کہ یہ ہمارے شہر کی بس ہے۔ ''جھوٹ بولتے ہو۔ نام بتاؤ جلدی سے'' افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ ہم نے نام بتائے اور وہ نوٹ کر کے لے گیا۔

ہم تو سکتے میں آ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ہمارے خوف زدہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چند دن پہلے ہی سنا تھا کہ گورنمنٹ کالج کے بعض طلباء کو کسی ایسی ہی بدتمیزی پر فوج نے کوڑوں کی سزا دی ہے۔ ہم منہ لٹکائے اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ کچھ ایسی سوچوں میں گم تھے۔ ''یہ کوڑا کیسا ہوتا ہے۔ کیسے مارتے ہیں۔ کہاں مارتے ہیں۔ کتنے ماریں گے۔ سنتے ہیں کہ چمڑی اُدھڑ جاتی ہے۔'' جوں جوں سوچتے خوف سے اعصاب شل ہوتے جاتے۔ کمرے میں پہنچ کر ہم نے ایک دوسرے کو حوصلہ دیا اور پھر مستنصر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات بھر نیند نہ آئی۔ سوچتا تھا کہ یہ فوجی صبح سحری کے وقت پکڑ کر لے جائیں گے۔ مارشل لاء کے ابتدائی دنوں میں سحری کے وقت ہی آئے تھے جب ہوسٹل کے بعض کمروں کی تلاشی لی تھی۔ کاش یہ خواب ہی ہو۔ کروٹ کروٹ توبہ، استغفار کرتا رہا۔ دعائیں مانگتا رہا۔ ''یا اللہ یہ پیالہ کسی طور ٹل جائے۔ بچت کی کوئی صورت پیدا فرما۔''

صبح باجماعت نماز ادا کی۔ تلاوت بھی کی اور پھر ٹک شاپ پر جا کر ناشتہ بھی زہر مار کیا۔ کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور پھر یہی سوچ کہ وہ کسی وقت بھی پکڑنے آ سکتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ کسی کو بتایا نہ تھا۔ بار بار دل سے یہی صدا اٹھتی تھی۔ یا اللہ! کوئی صورت کوئی مداوا............

اتنے میں دروازے پر کسی نے ''ناک'' کیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور رانا بشیر احمد صاحب جو فوج میں میجر تھے۔ میرے سامنے تھے۔ ''اوہ! بھائی بشیر'' کہتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے دروازہ بند کیا اور کہا۔

رات اُس بس میں میں بھی تھا۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت مداخلت کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں اپنے ساتھی میجر کو میں نے بتا دیا تھا کہ میں اس لڑکے کو جانتا ہوں۔ وہ واقعی بورے والا سے ہے۔ جھوٹ نہیں بولا تھا اس نے۔

تمہارے نام ہم نے کاٹ دیئے تھے۔ میں تمہیں بتانے آیا ہوں تا کہ تم فکرمند نہ ہو۔'' میں نے سکھ کا لمبا سانس لیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اسی وقت کھڑے کھڑے چلے گئے۔ مستنصر کو بتایا تو اس کی جان میں جان آئی۔

(یہ رانا بشیر احمد صاحب میرے بڑے بہنوئی بشیر احمد صاحب سیال کے جو پہلے ایئر فورس میں تھے اور پھر اصلاح و ارشاد میں انسپکٹر تھے، گہرے دوست تھے۔ مخلص احمدی تھے۔ بھائی بشیر احمد سیال کے ساتھ یہ ایک دفعہ ہمارے گھر بورے والا بھی آئے تھے۔ بعد میں انہوں نے فوج چھوڑ کر وکالت پاس کی اور پھر مجسٹریٹ بنے۔ 1971ء میں جب میں وقف کر کے نائیجیریا گیا تو یہ میانوالی میں مجسٹریٹ تھے۔ ان کا ذکر آگے بھی آئے گا۔)

میڈیکل کالج کے پانچ سال

(چند واقعات)

تعلیم الاسلام کالج سے ''ایف۔ایس سی'' کر کے میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔خوش قسمتی سے ''جودھامل بلڈنگ'' اور ''رتن باغ'' ہمارے میڈیکل کالج کے ہوسٹل سے بہت قریب تھے۔''ہال روڈ'' کے ایک طرف ہمارے ہوسٹل تھے اور دوسری طرف یہ عمارات۔ان عمارتوں کے قرب نے ٹی۔آئی۔کالج کے دینی ماحول سے محرومی کا کافی حد تک ازالہ کر دیا تھا۔

1۔ ''جودھامل بلڈنگ'' میں جماعت کا ایک نماز سنٹر تھا۔ہم احمدی طلباء وہاں نماز مغرب اور عشاء میں شامل ہو جاتے تھے۔ درس بھی ہوتا تھا۔رمضان میں نماز تراویح میں بھی شامل ہو جاتے۔اسی بلڈنگ میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ کے فرزند عبدالوہاب عمر صاحب بھی رہتے تھے۔حکمت کی دوکان بھی وہیں تھی۔نماز میں وہ کبھی کبھار شامل ہو جاتے۔ ایک دفعہ وہ شامل ہوئے۔نماز کے بعد تفسیر کبیر سے درس دیا گیا۔درس ختم ہوا تو عبدالوہاب صاحب کھڑے ہو گئے اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا کہ اس تفسیر میں طوالت بہت ہے۔اکثر دوست سمجھ نہیں سکتے۔بہتر ہوگا کہ قرآن کی چند آیات کا ترجمہ سنا دیا جائے۔یہ بھی کہا کہ پلازا سینما کا مالک میرا دوست ہے۔شام تین بجے میں اُن کے ہاں قرآن پڑھانے جاتا ہوں۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے فرزند ہونے کے ناطے ہمارے دل میں ان کا بہت احترام تھا لیکن ان کی اس بات سے مجھے دھچکا سا لگا تھا۔اصل حقیقت تو کچھ عرصہ بعد عیاں ہو گئی تھی۔

2۔ ''احمدیہ انٹر کالجیئیٹ ایسوسی ایشن'' نے ایک دفعہ حضرت چودہری ظفر اللہ خان صاحب رضی اللہ عنہ کو خطاب کی درخواست کی تھی۔اسی جودھامل بلڈنگ کے سامنے ایک چھوٹا سا خیمہ لگا کر ہم کالجوں کے احمدی طلباء جمع ہوئے تھے۔ حضرت چودھری صاحب نے دیگر نصائح کے علاوہ ایک یہ نصیحت بھی کی تھی کہ ہمارے احمدی نوجوانوں کو ''No'' کہنا سیکھنا چاہیئے ۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ کالج میں ماحول قدرے آزاد ہوتا ہے۔ایسے لڑکوں سے میل ملاقات ہوتی ہے جو بری عادتوں میں مبتلاء ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کو بھی اُن عادتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، اُکساتے ہیں۔ایسی صورت میں آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے کہ آپ ''No'' کہہ سکیں اور اُن کے دباؤ میں نہ آئیں۔اگر آپ انکار کرنے میں جھجک محسوس کرتے رہیں گے تو آہستہ آہستہ آپ اپنی ان اخلاقی اقدار کو کھو بیٹھیں گے جو آپ اپنے گھروں اور سکولوں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

3۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لیتے ہی مجھے بھی کچھ ایسے ہی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس وقت میری ٹھوڑی پر ہلکی سی داڑھی

اُگ آئی تھی اور میں نے وہ داڑھی رکھ لی تھی۔ اسی سال ہماری ہاکی ٹیم نے امرتسر (انڈیا) جا کر گلینسی میڈیکل کالج کی ہاکی ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنے کا پروگرام بنالیا۔ سب انتظامات، پاسپورٹ ویزا وغیرہ مکمل ہو گئے۔ روانگی سے دو تین دن پہلے ہم ہاکی کی پریکٹس کر رہے تھے کہ ٹیم کے سیکرٹری نے مجھے الگ لے جا کر کہا "کیپٹن کہتا ہے کہ غیر ملک جا رہے ہیں۔ بہتر ہوگا چند دن کے لئے تم یہ داڑھی صاف کر دو" میں نے فوراً جواب دیا "اُسے کہہ دیں کہ میری جگہ کسی اور لڑکے کو ساتھ لے جائے۔ میں شیو نہیں کروں گا۔" دوسرے دن وہ سیکرٹری میرے پاس آیا اور کہا کہ تم اپنی تیاری جاری رکھو میں نے کیپٹن کو سمجھا دیا کہ وہ صرف داڑھی کو نہ دیکھے۔ یہ بھی دیکھے کہ اس نے رکھی کیوں ہے؟

4۔ امرتسر کا ہمارا یہ چکر اچھا دلچسپ رہا تھا۔ ہمارے میزبان لڑکے اکثر سکھ تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ چند گھنٹوں میں ہم اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ ایک ہم عمر لڑکا میرا اچھا دوست بن گیا تھا۔ اس کا نام "بہندر سنگھ" تھا۔ دو چار گھنٹوں کی گپ شپ کے بعد اس نے مجھ سے کہا "قادیان دیکھنا ہے!" میں حیران تھا کہ اس نے کیسے پہچان لیا۔ میں نے کہا "یار! جی تو کرتا ہے لیکن کیپٹن اجازت نہیں دے گا۔ اور پھر ویزہ بھی صرف امرتسر کا ہے۔" اس نے کہا کہ ویزہ تو کمشنر سے لے دیں گے۔ باقی کیپٹن سے اجازت تم خود لے لو۔ وقت بھی تھوڑا تھا اور اجازت کی بھی اُمید نہ تھی لہٰذا میں نے کہا کہ رہنے دو۔

میچ تو ہم ہار گئے۔ لیکن امرتسر کی سیر اچھی ہوئی۔ گولڈن ٹیمپل بھی دیکھا۔ کھانے میں تین دن گوشت نہ ملا۔ اُن کا "جھٹکا زدہ" گوشت ہم کھا نہیں سکتے تھے۔ اور ہمارا ذبح کردہ گوشت پکانے سے اُن کے باورچیوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ ہمارے برتن "بھرشٹ" ہو جائیں گے۔ چنانچہ تین دن ہم دال سبزی ہی کھاتے رہے تھے۔

5۔ ہمارے ہوسٹل سے "رتن باغ" کا قرب ہمارے لئے بہت بڑی نعمت تھا۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ لاہور تشریف لاتے تو ہمیں زیارت نصیب ہو جاتی۔ نمازوں میں بھی شامل ہو جاتے اور کبھی مجلس عرفان سے بھی فیضیاب ہوتے۔ گرمیوں کی ایک شام نماز مغرب کا انتظام باہر "لان" میں تھا۔ حضور سیر سے قدرے دیر سے لوٹے۔ نماز کے بعد مجلس عرفان ہوئی۔ ایک سوال یہ کیا گیا کہ آج مغرب کی نماز بہت دیر سے پڑھی گئی ہے۔ حضور نے جواباً وضاحت فرمائی۔ "نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک ہوتا ہے۔ اسی طرح نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب سے لے کر شفق کے غائب ہونے تک ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس وقت کے اندر نماز مغرب ادا کر لی ہے۔"

6۔ چھانگا مانگا کی سیر۔ پیار اور درگزر کا اثر

میں تھرڈ ایئر میں تھا کہ ہماری کلاس نے چھانگا مانگا کے جنگل کی سیر کا پروگرام بنایا۔ صبح ناشتہ کے بعد ہم ٹرین سے روانہ ہوئے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دوپہر کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ساتھ لے لیا تھا۔ دس گیارہ بجے ہم وہاں پہنچ گئے

تھے۔ ریل کی چھوٹی پتلی سی لائن پر ننّھی منّی سی مال گاڑی اندر جنگل میں جاتی ہے۔ اس کا چھوٹا سا کالا انجن اچھا لگتا تھا۔ ہم اس مال گاڑی پر سوار ہو کر جنگل کے اندر گئے، سیر کی اور دیکھا کہ کیسے درختوں کی کٹائی، صفائی ہوتی ہے اور پھر درختوں کے ان تنوں کو اسی گاڑی کے ذریعہ سٹیشن تک پہنچایا جاتا ہے۔ جہاں سے یہ پھر ملک میں سپلائی کیئے جاتے ہیں۔

گھوم پھر کر ہم بعد دوپہر سٹیشن پر واپس آ گئے تھے۔ واپسی کے لئے ٹرین میں کافی وقت تھا اور پھر وہ ٹرین لیٹ بھی بہت ہوگئی تھی۔ اس طرح ہمیں سٹیشن پر کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ سب لڑکے ٹولیوں کی شکل میں اِدھر اُدھر بکھرے گپ شپ کرنے لگے۔ میں بھی دوستوں کے ساتھ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر الگ ہو کر میں تنہا پلیٹ فارم کے آخری حصہ پر ٹہلنے لگا۔

چھانگا مانگا سٹیشن کے پیچھے کھلا میدان تھا جس میں لڑکے بالے، کھِدّو، کھونڈی کھیل رہے تھے۔ کچھ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور کچھ ویسے ہی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میدان سے پرے آبادی تھی۔ معمولی قصبہ سا دکھائی پڑتا تھا۔ تین لڑکے پلیٹ فارم کے جنگلے سے لگے مجھے ٹہلتا دیکھنے لگے۔ میں ان کے قریب سے جب گزرا تو ایک لڑکے نے آوازہ کسا۔ ''اوئے! شہری باؤ'' میں نے ایک نظر اس کو دیکھا۔ میلی سی شلوار قمیض پہنے وہ نو دس سال کا ہوگا۔ ٹہلتے جب میں پھر ان کے پاس سے گزرا تو اُسی لڑکے نے پھر آوازہ کسا ''اُوئے! گندے آنڈے'' اب میں نے رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا۔ اور پھر میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ گیا۔ میں کچھ دیر بعد پھر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے ڈگڈگی کی آواز سنی۔ دیکھا تو میدان میں ایک مداری، بندروں کی جوڑی لئے لوگوں کو جمع کر رہا تھا۔ ہم بھی تماشہ دیکھنے چلے گئے۔ جب تماشہ ختم ہوا اور آگے بیٹھے بچے کھڑے ہوئے تو میں نے دیکھا وہی لڑکا جس نے گالی دی تھی بالکل میرے سامنے تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا رنگ فق ہوگیا۔ میں نے اس کا بایاں بازو پکڑا اور الگ ایک طرف لے گیا۔ سر جھکائے اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار پر رکھ لیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے قدرے سختی سے پوچھا۔ ''جی! محمد حنیف'' اس نے ڈرتے ڈرتے نام بتایا۔

میں نے کہا ''نام تو تمہارا بڑا پیارا ہے۔ اور تم خود بھی اچھے بچے دکھائی دیتے ہو۔ یہ گالی تم نے کیوں دی تھی۔'' اب کے اس نے فوراً جواب دیا ''جی غلطی ہوگئی'' میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا ''آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا، شاباش، جاؤ کھیلو'' وہ بھاگ گیا اور میں پھر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جنگلے کے پاس آیا اور بولا ''جی آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے نام بتا دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ پلیٹ فارم پر چلا آ رہا ہے۔ ہاتھ میں کاغذ پنسل تھی۔ اس نے کہا ''جی اس پر اپنا پتہ لکھ دیں'' میں نے پتہ لکھ دیا۔ کچھ دیر میرے ساتھ ٹہلتا رہا۔ میں نے پڑھائی اور بہن بھائی اور والدین کا پوچھا پھر وہ چلا گیا۔ چھ سات دن بعد مجھے اس کا خط ملا۔ لفافہ تھا۔ کالی سیاہی سے ''زیڈ (Z)'' کی نب کے ساتھ موٹا موٹا لکھا تھا۔ سلام ودعا

کے بعداس نے لکھا تھا کہ وہ خیریت سے ہےاور میری خیریت وہ'' نیک مطلوب چاہتا ہے'' اپنی غلطی کی اس نے معافی مانگی تھی اورآخر میں لکھا تھا کہ اس نے پانچویں کا امتحان دیا ہے۔اور''رجلٹ'' نکلنے والا ہے۔دعا کریں کہ پاس ہوجاؤں۔اس نے تاکید کی تھی کہ جواب ضرور دوں لیکن اپنا پتہ لکھنا بھول گیا تھا۔اس کا 1956ء کا لکھا خط 1971ءتک میرے پاس موجود تھا۔1971ء میں نائیجیریا جانے کی تیاری میں اپنے کاغذات خطوط وغیرہ میں نے میز پر پھیلا رکھے تھے۔شام کو چائے پی رہا تھا کہ اہلیہ آئی اور بولی''میرا رجلٹ نکلنے والا ہے'' سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔پھر اس نے وہ خط دکھایا اور پوچھا''یہ کون سا دوست بنالیا تھا آپ نے کالج کے زمانے میں۔'' پھر میں نے یہ سارا واقعہ سنایا۔آج ترپن سال بعداس واقعہ کی اہمیت بہت محسوس ہورہی ہے۔کاش ہم والدین اور دیگر بزرگ یہ سمجھ لیں کہ پیار،درگزر کا وار بہت کاری اور گہرا ہوتا ہے۔سزا کی نسبت اس سے کہیں بہتر اصلاح ہو سکتی ہے بچوں کی۔دعا تو بہرحال سب سے پہلے ہے ہی۔

7۔ فورتھ ایئر کا امتحان قریب تھا۔سب لڑکے کمروں میں گھسے کتابوں میں دبے تھے۔میں بھی کمرے میں بیٹھا دوپہر تک پڑھتا رہا اور پھر کتابوں کو جو دیکھا تو مایوسی سی چھا گئی۔سوچا''یہ ساری کتابیں بمشکل ایک دو دفعہ پڑھ سکا ہوں۔یاد تو کچھ رہا نہیں۔چند سوال امتحان میں آئیں گے۔پتہ نہیں کہاں سے آجائیں۔''اور پھر مجھے خیال آیا کہ''والدصاحب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ٹیوشن پڑھا کر بمشکل اخراجات پورے کرتے ہیں۔اگر فیل ہوگیا تو ان پر کیا گزرے گی۔''

میں گھبرا کر اٹھا۔وضو کیا اور نماز ظہر نیت لی۔حضورِقلب میسر آیا اور بڑے درد اور الحاح کے ساتھ دعا کرتا رہا۔نماز کے بعد میں بستر پر بیٹھ گیا اور کرسی پر کتاب رکھ لی۔لمبی نماز میں تھک گیا تھا۔میں گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر کمر سیدھی کرنے کے لئے پیچھے کی طرف جھکا اور لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

کیا دیکھتا ہوں کہ میں اورنسیم احمد دونوں ساتھ ساتھ اس طرح قدم ملا کر چل رہے ہیں جیسے فوجی مارچ کرتے ہیں آگے چھوٹی سی کھائی آئی اور ہم دونوں نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی اس کو پار کرنے کے لئے۔چھلانگ کے جھٹکے کے ساتھ میں نے آنکھیں کھولیں اور ساتھ ہی آواز آئی۔''پاس ہو گئے۔''

امتحان دیا۔رزلٹ نوٹس بورڈ پر آویزاں ہوگیا۔نسیم احمد آیا اور مبارک باد دی کہ ہم پاس ہو گئے ہیں۔میں نے اس کو مبارکباد دی اور پھر خاموشی سے میں خود آہستہ آہستہ رزلٹ دیکھنے گیا۔ہم دونوں نہ صرف پاس ہو گئے تھے بلکہ نمبر بھی دونوں کے برابر تھے۔اس کے بھی 400 تھے اور میرے بھی۔(نسیم احمد میرے کلاس فیلو بھی تھے اور کئی سال تک میرے''روم میٹ'' بھی رہے۔یہ بعد میں فوج میں آئی سرجن کے طور پر مشہور ہوئے اور میجر جنرل بن کر ریٹائر ہوئے وہ اب فوت ہو چکے ہیں۔(ان کا ذکر آگے بھی آئے گا)

8۔ ''رتن باغ'' میں حضرت مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ایک روز صبح نو دس بجے

کے قریب میں ہوسٹل سے میوہسپتال کی طرف جارہا تھا۔ جب 'رتن باغ' کے اس گیٹ کے سامنے سے گزرا جو ہال روڈ کی طرف ہے اور جو اکثر بند رہتا تھا۔ تو میں نے حضرت مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ کو کوٹھی کے پورچ میں ٹہلتے دیکھا۔ میں رک کر چند لمحات ان کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے گیٹ سے ہوتا ہوا اُن کے پاس چلا گیا۔ سلام کر کے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ میرا آخری سال تھا اور فائنل امتحان قریب تھا۔ میں نے دعا کی درخواست کی۔

حضرت میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا ''کیا پہلے کبھی فیل ہوئے ہو۔''

میں نے جواباً عرض کی۔ ''جی نہیں! ابھی تک تو نہیں ہوا۔''

میرا جواب سن کر حضرت میاں صاحب نے قدرے سنجیدگی سے فرمایا۔

''میرے سوال کا اصل جواب یہ تھا کہ ''نہیں۔ خدا کے فضل سے کبھی نہیں فیل ہوا۔'' پھر آپ نے حدیث قدسی ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ'' پڑھی اور فرمایا ''انسان کو اللہ تعالیٰ پر حسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ میں شرمندہ ہوا اور معذرت کی۔ شاید یہ اللہ تعالیٰ پر ''حسن ظن'' نہ رکھنے کا ہی نتیجہ تھا کہ میں زندگی میں پہلی بار کسی امتحان کو مکمل طور پر پاس نہ کر سکا تھا۔ فائنل امتحان میں ''سرجری'' میں تو میں پاس ہو گیا تھا لیکن تین مضامین کا امتحان دو ماہ بعد دوبارہ دینا پڑا تھا۔ شکر و احساں ہے اللہ تعالیٰ کا کہ سال ضائع ہونے سے بچ گیا تھا۔

9۔ عزیز احمد چوہدری بھی میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اچھی سادہ اور سیدھی طبیعت پائی تھی۔ فائنل امتحان میں میری طرح اس کو بھی مکمل کامیابی نہ ملی اور دو ماہ بعد اس کو سرجری کا امتحان دوبارہ دینا پڑا۔

ان دو ماہ میں ہم اکثر نماز اکٹھے پڑھتے۔ دعائیں کرتے۔ زیادہ گھبراہٹ ہوتی تو درثمین سے دعائیہ اشعار اور ''کشتی نوح'' سے اقتباس پڑھ کر اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ سال ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔

ایک روز عزیز میرے پاس آئے اور کہا ''یار! تم نے تو سرجری کلیئر کر لی ہے'' تمہاری کتاب میں نشان لگے ہیں اور اہم مقامات ''انڈر لائن'' کئے ہوئے ہیں یہ اپنی کتاب مجھے دے دو۔ میری کتاب تو ایسے ہے جیسے بالکل نئی ہو۔ کھولتے ہی گھبراہٹ ہوتی ہے۔

میں نے کتاب اس سے بدل لی۔ میرے دل میں اس کے لئے فکر اور ہمدردی پیدا ہوئی۔ کچھ اس لئے بھی کہ اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔

اپنے سرجری کے امتحان سے ایک روز پہلے عزیز احمد نے بتایا کہ اس نے خواب میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے جس کی ایک آنکھ بندسی ہے۔ ہاتھ اکڑا ہوا ہے اور ٹانگ پر زخم سے ہیں۔ میں نے کہا جاؤ جا کر کتاب کے وہ حصے جن کا تعلق آنکھ، ہاتھ اور ٹانگ سے ہے اچھی طرح پڑھ لو۔

دوسرے روز میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ عزیز احمد امتحان دے کر سیدھا وہیں ''میس'' (Mess) میں آ ملا۔ میں نے پوچھا کیسا رہا امتحان۔ بولا ''ٹھیک ہی ہوگیا ہے۔ انہی تین حصوں میں سے تین سوال آ گئے تھے۔''

رزلٹ نکلا تو عزیز احمد چوہدری کی یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن تھی اور میری چوتھی۔

تیرہ سال بعد جب میں وقف کر کے نائیجیریا گیا تو ڈاکٹر عزیز احمد چوہدری بھی وہاں وقف کر کے آئے تھے۔ گو صحت کی بناء پر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے تھے۔

باب دوم

ملازمت کے بارہ سال

1958ء میں میڈیکل کالج سے گریجویشن کے بعد میں نے ''پاکستان ریلوے'' کی میڈیکل سروس Join کر لی۔ میری پہلی پوسٹنگ کوئٹہ ڈویژن میں ریلوے ہسپتال ''احمد وال'' میں ہوئی۔

یہ احمد وال ہے کہاں۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ والد صاحب نے ریلوے کے بعض ریٹائرڈ افسران سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ بلوچستان کے دور دراز اور بنجر بیابان علاقے میں چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ والد صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ میرے وہاں جانے کے بارہ میں اُن کو شرح صدر نہ تھا۔ مجھے بھی فکر تو تھا لیکن میرا خیال تھا کہ جا کر دیکھنے میں حرج نہیں۔ جہاں ریلوے ٹرین جاتی ہے اور ہسپتال ہے وہاں کچھ نہ کچھ آبادی تو ہوگی۔ کئی روز تک گھر میں سوچ بچار ہوتا رہا۔ ہمشیرہ نے کہا کہ ''جگہ کا نام تو بڑا پیارا اور برکت والا لگتا ہے''میں نے کہا ''ہاں آپا! یہ برکت والے مقام ایسے ہی بنجر بیابان علاقے میں ہوتے ہیں۔'' چند دن بعد والد صاحب نے جانے کی اجازت دے دی۔ چھوٹے بھائی عبدالوہاب کو ساتھ کر دیا۔ شرط یہ تھی کہ اگر جگہ معقول ہوئی تو چارج لینا ورنہ واپس آ جانا۔

ا۔ ملازمت کا آغاز ''احمد وال'' سے

ہم دونوں بھائی بورے والہ سے روانہ ہوئے اور لودھراں، روہڑی اور جیکب آباد ہوتے ہوئے کوئٹہ پہنچے۔ میں نے D.M.O. کو رپورٹ کیا اور پھر دو دن بعد ہم احمد وال کے لئے روانہ ہوئے۔

کوئٹہ سے زاہدان (ایران) تک بچھی یہ ریلوے لائن تقریباً چار سو میل لمبی ہے۔ کوئٹہ سے روانہ ہوں تو پہلے نوے میل تو مسلسل پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ ان سنگلاخ پہاڑوں کو کاٹ اور تراش کر اور سرنگیں کھود کر اور پل بنا کر لائن بچھائی گئی ہے۔ سانپ کی طرح ان پہاڑوں سے لپٹی اور بل کھاتی ٹرین آہستہ آہستہ دس بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رینگتی آگے بڑھتی ہے۔ شرارتی لڑکے پکڑ دھکڑ کرتے ایک ڈبے سے اتر کر پتھر اٹھا کر دوسرے ڈبے میں آسانی سے چڑھ جاتے۔ جوں جوں گاڑی لمبی اور اندھیری سرنگوں میں سے گزرتی جاتی، ہمارا دل بیٹھتا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر ملک میں جا رہے ہوں۔ سات آٹھ گھنٹوں میں یہ نوے میل کا سفر طے کر کے جونہی گاڑی پہاڑوں سے نکل کر نسبتاً ہموار اور کھلے علاقے میں داخل ہوتی ہے تو ''نوشکی'' شہر آ جاتا ہے۔ یہ ضلعی صدر مقام ہے۔ اس سے پہلے کوئٹہ تک یوں تو کئی چھوٹے چھوٹے سٹیشن ہیں لیکن ''مستونگ روڈ'' اچھا بڑا شہر ہے۔ یہاں سٹیشن پر بکتی خوبانی اور کلّو کے سیب بالکل تازہ اور لذیذ ہوتے تھے۔ خوبانی اتنی بڑی جیسے چھوٹا سیب، پنجاب میں ایسی خوبانی نہ دیکھی تھی۔

نوشکی سے آگے دس میل کے فاصلے پر ''احمد وال'' ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہاں ریلوے ملازمین کی چھوٹی سی کالونی تھی اور

ریلوے ہسپتال بھی۔ سٹیشن پر ڈاکٹر اور ہسپتال کا سٹاف استقبال کے لئے موجود تھے۔ ریلوے کا دوسرا اسٹاف بھی تھا۔ سب بڑے تپاک سے ملے اور خوشگوار ماحول پیدا کر کے ہمارے خوف وخدشات کو دُور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنگلہ اور باغیچہ خوب تھا۔ اچھی سبزیاں لگی تھیں۔ انگوروں کی بیل چڑھی تھی۔ نرگس کے پھول کھلے تھے اور مرغ پلاؤ تیار تھا۔ وہاں بجلی تو نہ تھی لیکن نلکوں میں پانی آتا تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ بھائی سے مشورہ کر کے میں نے چارج لے لیا۔ میں جال میں پھنس گیا تھا۔

احمد وال میں مقامی آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ریلوے حدود سے باہر چند کچی دوکانیں تھیں جن سے پیاز، آلو، گوشت وغیرہ مل جاتا تھا۔ دیگر اشیائے خورد ونوش از قسم آٹا، چاول، دالیں، چائے، چینی وغیرہ کے لئے محکمہ ریلوے ہر ماہ ایک ''راشن ٹرین'' چلاتا تھا۔ جو ہر سٹیشن پر ٹھہر کر سب ریلوے سٹاف کو راشن فروخت کرتی تھی۔ ہفتہ کے روز کوئٹہ سے زاہدان انٹرنیشنل ٹرین گزرتی تھی جس کی ڈائننگ کار سے ہم مکھن اور ڈبل روٹی بھی کبھی لے لیتے اور پرانے اخبار بھی۔

احمد وال سے تقریباً سو میل آگے صحرا میں ''دالبندین'' نسبتاً اچھا شہر آباد ہے۔ وہاں بھی ریلوے ہسپتال تھا۔ کچھ دن میں وہاں بھی کام کرتا رہا ہوں۔ جب وہاں کا ڈاکٹر چھٹی پر گیا تھا۔ دالبندین سے آگے ''نوکنڈی''، ''یک مچھ'' اور ''تفتان'' ریلوے سٹیشن ہیں اور پھر آگے ایران کی سرحد کے بعد زاہدان آتا ہے۔ احمد وال سے آگے ایرانی سرحد تک تقریباً اڑھائی تین سو میل تک صحرا ہے جو ''صحرائے تھل'' کا حصہ ہے۔ ویسے بائیں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس صحرا میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پکی سڑک بھی ہے۔ یہ انٹرنیشنل شاہراہ ہے جو مشرق اور مغرب کو ملاتی ہے ٹورسٹ کا زمینی راستہ یہی ہے۔

2۔ میں ایک دفعہ صحرا کا نظارہ کرنے کے لئے ''نوکنڈی'' تک گیا تھا۔ دو دن ٹھہر کر واپس آیا تھا۔ ایک شام نوکنڈی کے سٹیشن ماسٹر کے ساتھ ریت کے ٹیلوں کی سیر کرنے نکل گیا۔ ایک ٹیلے پر چڑھ کر جب دور تک نظر دوڑائی تو صحرا میں ہمیں کچھ چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ ہم اس کی طرف چل پڑے۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ کمبوڈیا کا ایک ٹورسٹ تھا۔ وہ راستہ بھول کر کسی پگڈنڈی پر چل پڑا تھا اور آگے جا کر اس کا موٹر سائیکل ریت میں بُری طرح دھنس گیا تھا۔ موٹر سائیکل کے ساتھ ''سائڈ کار'' بھی لگی تھی جس میں انسان لیٹ سکتا ہے۔ ان دونوں کو نکالنا اکیلے انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم نے مل کر نکالا اور اس کو سیدھے راستہ پر ڈالا۔ عمومی طور پر سڑک تھی تو پکی لیکن بعض مقامات پر اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی کہ دوسرے راستوں میں مل جل گئی تھی۔ اصل سڑک کا پتہ اور پہچان مشکل ہوگئی تھی۔ واپسی پر میں راستہ میں یہی سوچتا رہا کہ اگر ہم نہ دیکھتے تو صحرا میں اس کا کیا بنتا۔ کیا میرا اچانک ایک مال گاڑی پر بیٹھ کر ''نوکنڈی'' جانا اور پھر ریت کے ٹیلے پر چڑھنا، اس غریب الوطن مسافر کی مدد کے لئے ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کیسا عجب مسبب الاسباب ہے۔ وہ صرف دو لفظ ''بدھسٹ'' اور ''کمبوڈیا'' بول سکتا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ وہاں پھنسا ہوا تھا۔ تھکاوٹ اور مایوسی سے وہ بے حال

تھا۔ہم حیران تھے کہ وہ اتنی دور تک صحرا میں کیسے اور کیوں چلتا گیا۔ پہلے ہی رُک کیوں نہ گیا۔

3۔ کوئٹہ سے احمد وال تک ہفتہ میں تین ریل گاڑیاں آتی تھیں۔ایک ٹرین تو احمد وال تک آ کر دوسرے روز واپس کوئٹہ چلی جاتی تھی۔ دوسری احمد وال سے آگے دالبندین تک جاتی اور پھر واپس کوئٹہ چلی جاتی۔ یہ دونوں عرف عام میں ''لنڈو'' کہلاتی تھیں یعنی ''ادھوری'' کیونکہ یہ زاہدان تک آگے نہ جاتی تھیں۔ ہفتہ میں صرف ایک ٹرین کوئٹہ سے روانہ ہو کر احمد وال، دالبندین، نوکنڈی وغیرہ سے ہوتی ہوئی زاہدان تک جاتی تھی۔ یہ ''تھرو'' ٹرین کہلاتی تھی۔ یہ اچھی لمبی ٹرین تھی۔ ملکی اور غیر ملکی مسافروں اور سیاحوں سے خوب بھری ہوتی تھی۔اس کے آنے سے احمد وال کے چھوٹے اور ویران سے سٹیشن پر خوب رونق ہو جاتی۔ ہم ہفتہ بھر اس ٹرین کا انتظار کرتے۔ کپڑے بدل کر سٹیشن پر جاتے۔ مسافروں کو دیکھتے، ملتے، ان سے باتیں کرتے اور دنیا کی خبروں کا پوچھتے تھے۔ مسافر ہم سے اس علاقے کے بارے میں پوچھتے۔ایک دفعہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طلباء کا ایک گروپ ایران جا رہا تھا۔ میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ جب اس کو میں نے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے دوسرے لڑکوں کو اکٹھا کر لیا اور میرے بارے میں اس طرح بتایا جیسے کہہ رہا ہو کہ ''دیکھو! کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کا پڑھا ہوا ڈاکٹر بھی اس علاقے میں پایا جاتا ہے۔''

ہم کسی مسافر سے پرانا اخبار حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پھر گھر جا کر ہفتہ بھر اس کو بار بار اور چبا چبا کر پڑھتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ پھل اور سبزیاں گدھوں پر لاد کر ٹرین سے پہلے ہی پہنچ جاتے اور پلیٹ فارم سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی دوکانیں لگا کر بیٹھ جاتے۔ ٹرین کے رُکتے ہی مسافر زیادہ تر ادھر ہی جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب پھل سبزی ختم ہو جاتی۔ گھنٹہ بھر ایک میلے کا سا سماں پیدا کر کے گاڑی آگے دالبندین روانہ ہو جاتی تو پھر ماحول پر سناٹا سا چھا جاتا۔اور ہم اداس سر جھکائے اپنے اپنے ''بِلوں'' میں جا گھستے۔ سٹیشن ماسٹر وہاں پوسٹ ماسٹر بھی تھا۔ٹرین کا گارڈ ڈاک کے تھیلے بھی ہر سٹیشن پر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ گاڑی کے جانے کے بعد ہم سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں اکٹھے ہو جاتے۔تھیلا کھُلتا اور کسی کو خط مل جاتا۔ باقی مایوس ہو کر چلے جاتے۔

بیرونی دنیا سے ہمارا کوئی رابطہ نہ تھا۔کسی کے پاس ریڈیو نہ تھا۔بجلی ہی نہ تھی۔ چند ماہ بعد ایک نوجوان اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر آیا تھا۔ اس کے پاس ریڈیو تھا اور ساتھ ایک لکڑی کے ڈبے میں کوئی دو درجن بڑے سائز کے Cell (بیٹریاں) ڈال کر رکھتا تھا۔ اس سے وہ ریڈیو چلاتا تھا۔ہم رات آٹھ بجے ریڈیو پاکستان سے خبریں سننے اس کے ہاں اکٹھے ہو جاتے تھے۔لیکن چند ماہ بعد ہی وہ وہاں سے کسی اور سٹیشن چلا گیا تھا۔ چند ماہ سے زیادہ تو کوئی ریلوے عہدہ دار وہاں ٹھہرتا نہ تھا۔ ایک میں ہی تھا جو وہاں اڑھائی سال تک ٹکا رہا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

4۔ وہاں ہسپتال میں کام تو کچھ خاص تھا نہیں۔ سارا دن فارغ ہی تھا۔ میں اکثر وقت مطالعہ میں گزارنے لگا تھا۔ شام کو

ایک بلوچی ملازم کے ساتھ قریبی پہاڑیوں تک سیر کو نکل جاتا تھا۔ ایک روز میں نے سوچا کہ ان پہاڑیوں کے اُس پار دیکھیں کیا ہے۔ وہ بلوچی تو آسانی سے چڑھ گیا اور میں بھی اس کے پیچھے چڑھ گیا لیکن جب اترنے لگے تو میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے کہا ''نہیں، میں یہاں سے اتر نہیں سکوں گا۔'' اس بلوچی نے حوصلہ دلایا اور پہلے اتر کر مجھے کہا کہ گہرائی کی طرف نہ دیکھیں۔ صرف اس مقام پر نظر رکھیں جہاں قدم رکھنا ہے اور قدم رکھ کر ہاتھ مجھے پکڑائیں۔ اس طرح دو تین دفعہ اس کا ہاتھ پکڑا تو مشکل مقامات سے اتر سکا۔ پھر پہاڑ کی طرف جانے کی بجائے یا تو ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ سیر کرتے یا پھر ویرانے میں قریبی دیہات کی طرف چلے جاتے۔ گاؤں کو یہاں ''کِلّی'' کہتے تھے۔ بس چند گھر ہی ہوتے تھے۔ گھر بھی صرف چھپر جھگی ہی تھے۔ ان سے ہم انڈے خرید لیتے تھے۔ ان کے کتّوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔

لوگ نہایت غریب، پسماندہ اور سادہ تھے۔ زندگی اب بھی وہاں اسی لیول پر تھی جس پر وہ سینکڑوں سال پہلے ہوگی۔ سنا تھا کہ زمانہ قبل از تاریخ کے ''کول، دراوڑ'' لوگ اب بھی وہاں بستے ہیں۔ ہر طرف امن وامان تھا۔ کوئی خوف و ہراس محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے بلوچ باورچی سے کہا کہ ڈاکٹر کا بنگلہ تو بہت الگ تھلگ ہے۔ اس کو لُوٹنا تو بہت ہی آسان ہے۔ اس نے کہا کہ ساری زندگی میں اس نے یہاں کوئی واردات نہیں دیکھی سُنی۔ ایک دفعہ کالونی کی مسجد سے گھڑی چوری ہوگئی تھی۔ چور کو ہم نے لائن کے ساتھ ساتھ جاتے کچھ فاصلہ پر جا پکڑا تھا۔ اور وہ پنجابی تھا اور رات مسجد میں ٹھہرا تھا۔ یہاں سے بھاگ کر اگر کوئی جائے گا تو وہ ریل کی لائن کے ساتھ ساتھ ہی جا سکتا ہے۔ ادھر ادھر ہوا تو وہ پہاڑوں میں گم ہو جائے گا یا صحرا میں۔

صحرا میں تو وہاں ٹرین بھی پھنس کر رہ جاتی تھی۔ جب تیز ہوا چلتی تو ریت اُڑ کر لائن کو ڈھانپ لیتی اور پہیّہ جام کر دیتی۔ علاج کے طور پر محکمہ ریلوے نے ہر دس بارہ میل پر دس پندرہ ''گینگ مین'' آباد کر رکھے تھے جو لائن کی نگرانی کرتے اور حسبِ ضرورت صفائی بھی کرتے رہتے۔ ظاہر ہے جب جھکّڑ تیز اور مسلسل چلتا تو صفائی ممکن نہ تھی اور ٹرین پھنس جاتی۔ ریلوے افسران جب دورے پر جاتے تو احتیاطاً چند دن کا راشن ساتھ لے کر ہی نکلتے۔ مجھے بھی جاتے ہی ایک ''راشن پیٹی'' بنوانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ یہ ایک لکڑی کی جالی دار ڈولی سی تھی جس میں چاول، آٹا، دال، چائے، چینی، نمک مرچ وغیرہ کے علاوہ ایک گیس کا چولہا بھی رکھا ہوتا تھا اور ضروری برتن بھی۔ عبداللہ اچھا باورچی تھا اور سب پاکستانی کھانے پکانا جانتا تھا۔

کسی صحرائی جھکّڑ میں پھنسنے کا تجربہ تو مجھے وہاں نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک دفعہ سیلابی ریلے نے ہماری ٹرین کو ''ناک آؤٹ'' کر دیا تھا۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ احمد وال سے کوئٹہ کی طرف صحرا نہیں بلکہ آٹھ دس میل تک تو پتھریلا میدانی

علاقہ ہے اور پھر نوشکی سے آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور کوئٹہ تک چلتا ہے۔ ایک دفعہ ٹرین سے میں احمد وال سے کوئٹہ کے لئے روانہ ہوا۔ چند میل ہی گئے ہوں گے کہ بائیں طرف دُور پہاڑوں پر گرج چمک دکھائی دی۔ اکثر مسافر پریشان اور بے چین سے ہو گئے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیوں خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ چند منٹ بعد ہی دیکھا کہ بائیں جانب سے پانی کا ریلہ سانپ کی طرح بل کھاتا آیا اور ایسی تیزی سے لائن کے ساتھ ٹکرایا کہ انجن کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ غریب پہلے تو لڑکھڑایا پھر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ لوگ انجن کے گرد کھڑے دعائے خیر کرتے رہے۔ اس نے بہت شوں شاں کی۔ آگے پیچھے زور مارا لیکن پھر جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

عجب بے ثباتی دیکھی دنیا کی۔ موسم خشک تھا۔ مطلع صاف تھا اور دھوپ نکلی تھی لیکن دُور پہاڑ پر بارش برسی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے پانی کا تیز دھارا ہمارے سارے سفری پروگرام تیز دھار چھری کی طرح کاٹ کر رکھ گیا تھا۔ احمد وال اور نوشکی دُور نہ تھے۔ اکثر مسافر پیدل وہاں پہنچ گئے تھے۔ ریلیف ٹرین تو کوئٹہ سے دوسرے روز پہنچی تھی۔

5۔ قبولِ احمدیت کا دلچسپ واقعہ

ایک روز ایک بلوچی نوجوان میرے گھر آیا۔ شلوار قمیض اور لمبا کوٹ پہنے تھا۔ سر پر ٹوپی، چہرے پر عینک اور پوری داڑھی، ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ قریبی گاؤں کا رہنے والا ہے اور احمدی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم احمدی کس طرح ہوئے۔

اس نے بتایا کہ والد صاحب نے مجھے کوئٹہ میں ایک مدرسے میں داخل کرایا تھا۔ جہاں میں نے کئی سال تعلیم حاصل کی۔ احمدیت کے خلاف سخت نفرت ہم سب طلباء میں بھری گئی تھی۔ ایک روز میں اور میرا ایک دوست عشاء کے بعد کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ''احمدیہ مسجد'' کے قریب سے گزرنا تھا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ گھوم کر چلتے ہیں تا کہ ''ان کافروں'' کی مسجد سے دُور رہیں۔ میں نے کہا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم خاموشی سے گزر جائیں گے۔ چنانچہ ہم چلتے گئے۔

مسجد احمدیہ میں سیرت النبی کا جلسہ تھا اور مولانا جلال الدین شمس صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ دُور سے ہی ہمارے کانوں میں آواز آنی شروع ہوگئی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ لوگ تو کافر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے نہیں لیکن یہ تو سیرت اس قدر شاندار بیان کر رہے ہیں۔ مسجد کے سامنے جا کر میں نے اپنے دوست سے کہا کہ چند منٹ یہاں رُک کر سنتے ہیں لیکن وہ جلد آگے بڑھنے پر مصر تھا۔ میں نے کہا کہ اچھا تم چلو، وہاں پہنچو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ میں پہلے کھڑا سنتا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کے پاس چلا گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک دوست نے مجھے کہا کہ اندر آ جاؤ اور بیٹھ کر سن لو۔ چنانچہ میں اندر بیٹھ کر سنتا رہا۔ وہ دوست سیکرٹری تبلیغ تھے'' جان محمد'' نام تھا شاید۔ تقریر کے

بعد میں نے جان محمد صاحب سے کہا کہ میں ان مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

دوسرے روز میں وقتِ مقرّرہ پر جان محمد صاحب سے آن ملا۔ ہم مولانا شمس صاحب کے پاس گئے۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ نبوّت تو ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے نبی کیسے بنالیا ہے۔ مولانا نے سورۃ الاعراف کی آیت 36 میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے آیت کو پڑھا اور حیران رہ گیا۔ سوچا کہ ''یہ آیت قرآن میں کدھر سے آ گیا۔ ضرور یہ ان لوگوں نے قرآن میں ردّ و بدل کر کے داخل کر دی ہوگی۔ اپنا قرآن لا کر میں ان کو پکڑوں گا۔'' چنانچہ یہ سوچ کر میں پھر ملنے کا وعدہ کر کے واپس آ گیا۔ مدرسہ میں پہنچ کر اپنے قرآن کو دیکھا تو وہ آیت اس میں بھی موجود تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ چوری چوری جان محمد صاحب سے ملتا رہا۔ لٹریچر پڑھتا رہا۔ دوستوں نے استاد سے شکایت کر دی۔ انہوں نے سختی سے منع کیا۔ پھر پٹائی کی اور پھر مدرسہ سے نکال دیا۔ اور پھر میں نے بیعت کر لی۔ اس کی فوٹو اب بھی میرے پاس ہے۔ نام یاد نہیں رہا۔ غالبًا ابراہیم تھا۔ بعد میں بھی وہ دو تین دفعہ آیا اور رات بھی ٹھہرتا تھا۔

مہینہ میں ایک دو بار میں کوئٹہ جاتا تھا۔ واپسی گاڑی کے لئے دو راتیں وہاں ٹھہرنا پڑتا۔ ریلوے کا وہاں اچھا آرام دہ ریسٹ ہاؤس تھا۔ کوئٹہ میں شاپنگ کر لیتا۔ حجامت بنوالیتا اور پھر مسجد احمدیہ چلا جاتا۔ دوستوں سے میل ملاقات ہو جاتی۔ شیخ محمد حنیف صاحب ان دنوں وہاں امیر جماعت تھے۔ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان سے میں جماعت کی کتب لے جاتا اور اگلی دفعہ واپس کر کے اور لے جاتا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ڈاکٹر نسیم احمد جو فوج میں آئی سرجن تھے اور میجر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ میرے کلاس فیلو بھی تھے اور ہوسٹل میں ''روم میٹ'' بھی رہے۔ وہ کوئٹہ سے تھے۔ ان کا گھر مسجد احمدیہ کے قریب ہی تھا۔ ان کے والد صاحب خانصاحب محمد عبداللہ بھی ڈاکٹر تھے اور بزرگ انسان تھے۔ میں اکثر ان کی نصائح اور ہدایات سے فیضیاب ہوتا۔ نسیم احمد ان دنوں کوئٹہ چھاؤنی میں رہتے تھے۔ ان سے بھی ان کے والدین کے ہاں اکثر ملاقات ہو جاتی۔ ان کے بھائی اسداللہ خان کی عینکوں کی دکان تھی۔ وہیں شام کو اکثر مجلس لگا کرتی تھی۔ میری شادی کے بعد تو یہ گھرانا ہمارے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ نسیم احمد کے بڑے بھائی میاں بشیر احمد کوئٹہ میں پاسپورٹ افسر تھے۔ میں نے ان سے پاسپورٹ بنوایا تھا تاکہ ایران کا چکر لگا سکوں، ایران تو نہ جا سکا۔ البتہ 1964ء میں اسی پاسپورٹ پر قادیان جانے کی سعادت نصیب ہوگئی تھی۔

دو ماہ بعد میں نے ایک ہفتہ بھر کی چھٹی لی اور گھر کا چکر لگا آیا۔ عبدالوہاب کو گھر چھوڑ کر واپسی پر میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی عبدالمنان بھٹہ کو ساتھ لیتا آیا۔ اس طرح اس نے بھی دو ماہ تک کوئٹہ، احمد وال اور ارد گرد کے علاقے کی سیر کر لی۔

6۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے ایک ''دوسالہ تعلیمی اور تربیتی کورس'' تھا۔ جو احمد وال میں پورا کیا تھا۔ ایک قسم کا اعتکاف تھا جس میں دنیا سے کٹ کر۔ تنہائی اور خلوت میں قرآن وحدیث، تفسیر کبیر، کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور تاریخ احمدیت پڑھنے کا موقع میسر آیا تھا۔ بائیبل اور دیگر جماعتی کتب کا بھی مطالعہ کیا۔ نماز، روزہ اور دعاؤں کی بھی توفیق ملی تھی۔ ریلوے کے دوسرے سٹاف سے گفتگو اور بحث مباحثہ بھی گاہے گاہے ہو جاتا۔ ایک جوشیلا اور کٹڑ عیسائی ڈسپنسر چند ماہ کے لئے میرے ہسپتال میں آیا تھا۔ اس سے عیسائیت کے بارے میں بھی اچھی پریکٹس ہوئی تھی۔

اعتکاف میں خلل

البتہ میرے اس اعتکاف میں جس بات نے خلل ڈالا وہ میری شادی تھی۔ نکاح تو میرا میڈیکل کالج کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ اب جبکہ نوکری لگ گئی تھی تو میں نے سوچا کہ اب رخصتانہ بھی ہو جائے۔ تاہم والدین کے اس بارہ میں کچھ تحفظات تھے۔ اُس ویران علاقہ کے بارے میں ان کو شرح صدر نہ تھا۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی باری باری میرے ساتھ احمد وال میں دو دو ماہ اچھے خوشگوار گزار چکے تھے۔ کچھ اُنہوں نے والدین کے خدشات دُور کئے اور کچھ بڑے بھائی اور بھابھی نے حمایت کی۔ تب کہیں جا کر بات بنی تھی۔ اہلیہ کے ساتھ اب کے والدہ صاحبہ کو بھی لے گیا تھا۔ وہاں کا خشک موسم والدہ کو راس نہ آیا تھا۔ خشک کھانسی رہنے لگی تھی۔ تاہم اُنہوں نے دو ماہ وہاں گزار لئے تھے۔

میں ہر دو ماہ بعد ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر پنجاب گھوم آیا کرتا تھا۔ اب میں ایک دفعہ بیوی کو لے جاتا تو دوسری دفعہ چھوڑ آتا۔ اس طرح اُس ویرانے میں اب ہر دو ماہ بعد کبھی بہار آنے لگی تھی اور کبھی خزاں۔ اس خزاں کے پہلے چند روز تو بہت کٹھن ہوتے تھے۔ وہ ویرانہ کچھ زیادہ ہی ویران اور اداس محسوس ہونے لگتا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ نوکر کھانا لاتا تو میں کہتا ''وہاں رکھ دو اور برتن لینے مت آنا'' نوکر سب سمجھتے تھے اور آپس میں کھُسر پھُسر کرتے تھے۔ ہفتہ دس دن میں اداسی دور ہو جاتی اور پھر میں اگلی چھٹی کا پلان بنانے لگتا۔ دنیا امید پر قائم ہے۔

اور پھر ایسی ہی ایک خزاں میں مجھے گھر سے خط ملا تھا کہ میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں۔ میں حسبِ معمول ڈیڑھ ماہ بعد چھٹی گیا اور ماں بیٹا دونوں کو لے آیا۔ اور پھر وہ اسی طرح ہر دو ماہ بعد آتے جاتے رہے تھے۔

شادی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میری تنہا نمازیں اب ''نماز باجماعت'' میں بدل گئیں تھیں۔ عرصہ سے مَیں نے جمعہ نہیں ادا کیا تھا اور مجھے یہ محرومی بہت کھٹکتی تھی۔ میں حضرت مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ کو بھی دعا کے لئے لکھتا رہتا تھا۔ ایک خط میں مَیں نے اپنی جمعہ سے محرومی کا ذکر کر دیا۔ جواباً حضرت میاں صاحبؓ نے لکھا کہ ''جمعہ کے لئے باجماعت نماز شرط ہے اور دو افراد سے بھی جماعت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا آپ میاں بیوی جمعہ ادا کر سکتے ہیں۔'' یہ شادی تو میرے دین اور دنیا دونوں ہی سنوار رہی تھی۔ مخل ہونے کی بجائے میرے 'اعتکاف'' میں ممد ثابت ہو رہی تھی۔

بلوچی بچے-انوراورخیر بی بی

اکثر ہم دونوں شام کو پہاڑوں کی طرف سیر کے لئے نکل جاتے۔ راستہ میں ایک دوجھگیاں تھیں۔ بلوچی بچے ہمیں چند دن دیکھتے رہے۔ پھر ساتھ چلنے لگے۔ اور پھر آہستہ آہستہ گھر آنے لگے۔ انور تو آٹھ نو سال کا ہوگا اور اچھی اردو بول لیتا تھا۔ اُس کی چھوٹی بہن خیر بی بی، چھ سات سال کی ہوگی۔ کچھ نہ کچھ اردو سمجھ لیتی تھی۔ اہلیہ کے لئے ان کا وجود غنیمت تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ اچھا سہارا بنے تھے۔ انور ہمیں وہاں کے ماحول، رسم ورواج اور رہن سہن سے متعلق بتاتا تھا۔ ہم ان کی سادگی، محنت، جفاکشی اور انتہائی غربت میں صبر وشکر پر حیران رہ جاتے تھے۔ اور دل ہی دل میں اپنے شکوہ وشکایت اور ناشکری کے اظہار پر ندامت محسوس کرتے۔ بہت خود دار تھے۔ کھانے کا وقت قریب آتا تو انور بہن کو لے کر گھر چل پڑتا۔ بڑی مشکل سے اہلیہ کوئی کھانے کی چیز ان کو دے پاتی۔ انور ہمیشہ معذرت کرتے ہوئے کہتا: ''نہیں بیگم صاحب! اس کا ضرورت نہیں۔ گھر میں سب کچھ ہے۔''

گھر اس کا ہم نے کئی بار دیکھا تھا اور اس میں ''سب کچھ'' کا حال ہم انور سے اچھی طرح جان چکے تھے۔ ایک گول جُھگّی تھی جو ہر طرف سے بند تھی۔ صرف پہاڑ کی طرف ایک چھوٹا سا راستہ تھا۔ جس پر ٹاٹ کا ٹکڑا لٹکا رہتا۔ اندر گھاس پھوس بچھا کر اس کے اُوپر ایک بڑی سی دری بچھا رکھی تھی۔ اس پر ایک موٹی اور بڑی رضائی لے کر سب سورہتے تھے۔ درمیان میں چھوٹے پتھروں کا دائرہ سا بنا کر آگ جلانے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ آگ دُھکا کر پتھر کی ایک موٹی اور گول سلیٹ اس پر رکھ کر توے کا کام لیتے تھے۔ گندم، جو، مکی وغیرہ کو پتھروں سے باریک کوٹ کر اور نمک ملا کر گوندھ لیتے اور پھر گرم سلیٹ پر اس آٹے کو پھیلا کر پکا لیتے۔ اس موٹی اور بڑی روٹی کے ٹکڑے کر کے پانی یا بکری کے دودھ سے کھا لیتے تھے۔

جُھگّی کے باہر پہاڑ کی طرف کچھ جگہ اچھی صاف کر کے صحن بنا رکھا تھا جس میں مرغیاں چگتی پھرتی تھیں۔ درخت کی تین چار موٹی، سوکھی شاخیں صحن میں گاڑھ رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ بکریاں بھی بندھی تھیں اور دو تین بکری کی کھال سے بنائی گئی مشکیں بھی لٹک رہی ہوتیں۔ ان مشکوں میں پانی بھرا ہوتا اور ایک مشک میں بکریوں کا دودھ بھی ہوتا۔ اسی مشک کے اندر ہی جاگ لگا کر دودھ کا دہی بنا لیتے اور پھر مشک کو کچھ اس طرح ہلاتے کہ اس کے اندر ہی لسّی اور مکھن بن جاتا۔ انور کے باپ کے پاس ایک اُونٹ تھا جس کو لے کر وہ دور کہیں مزدوری کرنے نکل جاتا اور کئی دنوں کے بعد گھر لوٹتا۔ گھر میں دو تین دن ٹھہر کر پھر کہیں نکل جاتا۔ انور دو تین دن کے بعد ہمیں ملتا تو بتاتا کہ اس کا باپ آیا تھا اور کچھ گندم، جو اور کھجوریں وغیرہ دے گیا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر کہ اگر تمہارا راشن ختم ہو جائے تو تم کیا کرتے ہو، انور نے کہا ''ہم بھوکا رہنا جانتا ہے جی۔ اور پھر بکری کا دودھ اور مرغی کے انڈے ہیں ناں۔'' اہلیہ کے ساتھ ان بچوں کی

تصاویراب بھی میرے پاس یہاں جرمنی میں ہیں۔

7۔ ''احمد وال'' سے تبادلہ۔ایک کٹھن مرحلہ

احمد وال میں رہتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے۔اب میں اس ماحول سے اکتا گیا تھا۔معمول کے مطابق میں پنجاب گیا۔بچوں کو گھر چھوڑ کر واپسی پر میں لاہور اپنے چیف میڈیکل افسر سے ملا اور اپنے احمد وال میں دو سالہ قیام کا ذکر کر کے تبدیلی کی درخواست کی۔اُنہوں نے درخواست منظور کی اور تسلی دلائی کہ وہ جلد ہی کسی اور جگہ تبادلہ کر دیں گے۔واپس آ کر میں آرڈرز کا انتظار کرنے لگا۔

میرا خیال تھا کہ پنجاب یا سندھ میں کہیں بھی تبدیلی ہو جائے تو ٹھیک ہی ہے۔بلکہ کوئٹہ سے پشاور تک ہر سٹیشن میرے لئے قابلِ قبول تھا۔اصل غرض تو اس ویرانے سے نکلنا تھا۔کسی خاص سٹیشن کے بارے میں میری کوئی خواہش یا مرضی تھی نہ میں اُن حالات میں کوئی ایسی خواہش پال سکتا تھا۔میرا سارا زور دعا پر تھا خصوصاً دعائے استخارہ پر۔

دو تین ہفتہ بعد ہی مجھے تبدیلی کا خط مل گیا۔میں بہت خوش ہوا اور حیران بھی۔نہ صرف اس لئے کہ تبدیلی ہو گئی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ تبدیلی ''وزیر آباد'' ہو گئی تھی۔احمد وال جتنا بنجر، ویران اور سنسان تھا۔وزیر آباد اتنا ہی سرسبز و شاداب، بارونق اور آباد علاقہ تھا۔لیکن میری خوشی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وزیر آباد میرا سسرال بھی تھا۔''ایسا ہو سکتا ہے'' یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔جس کو بھی اس بات کا علم ہوتا وہ یہی کہتا کہ اس تبدیلی کے پیچھے بھاری سفارش یا رشوت کارفرما ہوگی۔یار لوگ تو سال بھر سے یہ کہہ رہے تھے کہ کسی سفارش یا ''دینے دِلانے'' کے بغیر تم احمد وال سے نکل نہ سکو گے۔''من پسند'' سٹیشن تو بہت دور کی بات تھی۔

تبدیلی کے آرڈر ملنے کے بعد مَیں بے چینی سے اُس ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا تھا جس نے آ کر مجھ سے چارج لینا تھا۔ایک ماہ گزر گیا۔پھر دو ماہ گزر گئے لیکن وہ ڈاکٹر نہ آیا۔میں پھر چھٹی پر لاہور گیا اور چیف سے ملا۔انہوں نے بتایا کہ جس ڈاکٹر کو بھی تمہاری جگہ لگاتا ہوں وہ نوکری چھوڑ دیتا ہے لیکن احمد وال جانے پر تیار نہیں ہوتا۔تاہم انہوں نے یقین دلایا کہ وہ کسی نہ کسی کو میری جگہ بھیج دیں گے۔

یہ صورت حال بہت پریشان کُن تھی۔اب میں محسوس کرنے لگا کہ میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔کوئی ڈاکٹر میری جگہ آنے کو تیار نہیں تھا اور بغیر کسی کو چارج دیئے میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔میں یہ سوچ کر اور بھی فکرمند ہو رہا تھا کہ پنجاب میں توجوڑ توڑ ہوتا رہتا ہے اور سفارشیں بہت چلتی ہیں۔ایسا نہ ہو کہ ان تبدیلی کے آرڈرز میں کوئی ردّ و بدل ہو جائے اور ''وزیر آباد'' جیسا سٹیشن میرے ہاتھ سے نکل جائے۔جوں جوں دیر ہو رہی تھی میرے خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔میرے اس ''اعتکاف'' کے بعد یہ تبادلے کا خط ''عید کا چاند'' بن کر آیا تھا۔لیکن یہ ''چاند رات'' تھی کہ ختم ہونے

میں ہی نہ آ رہی تھی۔

8۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے میری سن لی اور عجب انداز سے میری رہائی کا بندوبست فرمایا۔ ایک ڈاکٹر کی غلطی کی وجہ سے چیف میڈیکل افسر نے اس کو فوری طور پر برطرف کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے معافی مانگی۔ منت سماجت کی اور سفارش کروائی تو C.M.O. نے کہا کہ اگر ملازمت چاہتے ہو تو جاؤ احمد وال جا کر چارج لے لو۔ وہ ڈاکٹر احمد وال آنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی دوسری جگہ اس کو بھیج دیا جائے لیکن C.M.O. نہیں مانا۔ پھر ڈاکٹر نے کئی اعلیٰ افسروں سے مل کر ان سے یہ درخواست کی وہ سب مل کر ایک وفد کی شکل میں C.M.O. سے ملیں اور سفارش کریں کہ دیگر خالی جگہوں میں سے کسی جگہ اس کو لگا دیا جائے ان خالی جگہوں کی لسٹ بھی ڈاکٹر نے وفد کو دے دی تھی۔ وفد ملا تو C.M.O. نے سفارش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ''وہ ڈاکٹر بڈھا بھی تو وہاں دو سال سے پھنسا ہوا ہے۔ اگر وہ وہاں دو سال گزار سکتا ہے تو یہ وہاں چند ماہ کیوں نہیں گزار سکتا۔ اگر یہ وہاں چلا جائے تو چند ماہ بعد اس کو کسی دوسری جگہ تبدیل کر دوں گا۔'' چنانچہ مایوس ہو کر وہ ڈاکٹر روتا پیٹتا احمد وال آیا اور بہت بددلی اور بڑبڑاتے ہوئے مجھ سے اس نے چارج لیا۔ یہ سب تفصیل اس نے مجھے خود بتائی تھی جب میں نے اس سے اس کی ناراضگی اور برہمی کی وجہ پوچھی تھی۔ جب تک چارج مکمل ہو کر دستخط نہیں ہوئے۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا رہا تھا کہ یہ کسی لمحہ بھی چارج لینے سے انکار کر سکتا ہے۔ شام کو جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا تو وہ پہاڑوں، ریت سے بھرپور جھکڑ اور ویرانے کو دیکھ کر گھبرا جاتا اور ٹہلنے لگتا تھا۔ مجھے سامان پیک کرتے دیکھتا تو اس کا دل ڈولنے لگتا۔ سٹیشن کے دوسرے سٹاف نے تعاون کیا اور اس کو لے کر گھومتے رہے اور حوصلہ دلاتے رہے تھے۔ آخری دن جب اس نے چارج رپورٹ پر دستخط کئے تو میں نے بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایسا کرتے دیکھ لیا۔ فوراً اپنے آپ کو گالی دے کر کہا ''میں بھی بڑا اوہ ہوں جو آپ سے چارج لے لیا۔'' ہوتے ہوتے اڑھائی سال بعد وہاں سے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ دوسرے ہی روز میں ''لُنڈو'' ٹرین سے احمد وال سے وزیر آباد کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

وزیر آباد میں ملازمت کے سات سال

(چند واقعات)

وزیر آباد میں اچھی مخلص اور مستعد جماعت تھی۔ اکثر دوست مجھ سے پہلے ہی واقف تھے۔ امیر جماعت میاں غلام احمد صاحب اور قائد مجلس ماسٹر عنایت اللہ صاحب کی رہنمائی میں مجھے عملی طور پر یہاں جماعتی کاموں میں حصہ لینے کی توفیق ملتی رہی تھی۔ ان دنوں وزیر آباد اور اردگرد کے شہروں میں ''تربیتی کلاسز'' اور ''تبلیغی اجلاسات'' ہوتے رہتے تھے۔ ان میں صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کی شمولیت بہت پُرکشش ہوتی تھی اور ان کی تقاریر بہت مقبول اور مشہور تھیں۔ امیر صاحب اور قائد صاحب کی معیّت میں، مَیں بھی ان اجتماعات میں شامل ہوتا تھا اور وہاں مجھے ان صاحبزادگان سے ملاقات کا موقع مل جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان سے اچھی شناسائی ہوگئی تھی۔

1۔ اظہارِ شفقت

ایک دفعہ جہلم میں تبلیغی اجلاس کے بعد یہ دونوں صاحبزادگان صبح بس کے ذریعہ وزیر آباد آئے اور یہاں سے ٹرین پکڑ کر آگے ربوہ جانا تھا۔ ریلوے کالونی میں میری رہائش جی۔ ٹی روڈ کے بس سٹاپ کے بالکل قریب تھی۔ امیر صاحب وزیر آباد اور قائد صاحب کو صاحبزادگان کے پروگرام کا علم تھا۔ اُنھوں نے بس سٹاپ پر ان کا استقبال کیا اور میرے گھر کا ذکر کیا کہ وہ سامنے ہے۔ اس پر دونوں صاحبزادگان از راہ شفقت کچھ دیر کے لئے میرے گھر تشریف لائے تھے۔ چونکہ ٹرین کی روانگی کا وقت قریب تھا لہٰذا ناشتہ میں نے ٹرین میں پیش کیا تھا اور حافظ آباد تک ہم اُن کے ساتھ گئے تھے۔ دورانِ سفر مختلف موضوعات پر ان کی گفتگو سے فیضیاب ہوئے تھے۔

2۔ تبلیغی جلسہ۔ مسلّح پولیس کے پہرہ میں

غالباً 1963ء کی بات ہے کہ جماعت وزیر آباد نے غلّہ منڈی میں نماز عشاء کے بعد ایک تبلیغی جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک احمدی دوست ''صوفی صاحب'' کی غلّہ منڈی میں دوکان تھی۔ اس دوکان پر سٹیج بنایا گیا اور سامنے کھلی جگہ پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ احتیاطاً امیر صاحب نے مقامی مجسٹریٹ سے بات کر کے جلسہ کے لئے تحریری اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ مقررّ کے طور پر صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب سے درخواست کی گئی جو اُنھوں نے قبول کر لی تھی۔ تاہم صدر صاحب صدر انجمن احمدیہ اور ناظر صاحب امور عامہ کو حفاظتی نقطہ نظر سے تشویش تھی۔ مکرم امیر صاحب اور قائد صاحب نے اس سلسلہ میں پوری ذمہ واری قبول کی اور ہر طرح سے انتظام کرنے کا یقین دلایا تب کہیں جا کر اجازت ملی تھی۔

جلسہ کے روز تھانیدار نے امیر صاحب کو کہا کہ اُس کی اطلاع کے مطابق نقص امن کا خطرہ ہے۔ لہٰذا آپ جلسہ نہ کریں۔ امیر صاحب نے مجسٹریٹ کا اجازت نامہ دکھا کر کہا کہ ہمیں اجازت مل چکی ہے اور ہم یہ جلسہ ضرور کریں گے۔ اس پر تھانیدار امیر صاحب کو لے کر مجسٹریٹ کے پاس گیا اور حالات بیان کر کے اجازت نامہ منسوخ کرنے کی درخواست کی۔ مجسٹریٹ نے تھانیدار کو ڈانٹ کر کہا:

''یہ بھی اس ملک کے شہری ہیں۔ ان کو جلسہ کا حق حاصل ہے۔ اگر خطرہ ہے تو تم کس لئے ہو۔ تمہارے پاس سپاہی بھی ہیں اور اسلحہ بھی۔ جاؤ اور جا کر ان کی حفاظت کا انتظام کرو۔'' پھر مجسٹریٹ نے تھانیدار سے مزید کہا تھا۔

''میں جلسہ کے دوران یہاں دفتر میں ہی بیٹھوں گا اور دیکھوں گا کہ تم حفاظت کا کیسا بندوبست کرتے ہو۔'' (غلہ منڈی اور کچہری اُن دنوں قریب قریب ہی تھے)

عشاء کے بعد ہم سب خدّام اپنی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے تھے۔ کرسیوں کے پیچھے میں بھی ڈیوٹی پر تھا۔ صاحبزادگان کو ایک مخصوص راستہ سے خدّام کی حفاظت میں سٹیج پر لایا گیا تھا۔

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ تھانیدار پولیس کا ایک دستہ لے کر پہنچ گیا اور اہم مقامات پر اس نے رائفل بردار سپاہی کھڑے کر دیئے تھے۔ اس سے ماحول پر خاموشی اور رعب سا طاری ہو گیا تھا اور ہماری بھی تشویش کچھ کم ہوئی اور حوصلے بڑھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عجب طریق سے حفاظت کا انتظام فرما دیا تھا۔ جو کوشش جلسہ کو بند کرانے کے لئے کی گئی تھی۔ اُسی کوشش کو اللہ تعالیٰ نے جلسہ کی حفاظت اور کامیابی کا ذریعہ بنا دیا تھا۔

شہر میں اُن دنوں مخالفت کی رو چل رہی تھی اور کسی نہ کسی رنگ میں گڑ بڑ کا بہت خطرہ تھا لیکن خدا کے فضل سے بڑے سکون سے جلسہ سنا گیا اور بخیریت اختتام پذیر ہوا تھا۔ صاحبزادگان بھی محسوس کرتے تھے کہ جماعت وزیر آباد نے بھاری ذمہ واری قبول کی ہے۔ جلسہ ختم ہوتے ہی صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب نے سٹیج پر سجدۂ شکر ادا کیا تھا۔ ربوہ میں بھی بڑی فکرمندی کے ساتھ جلسہ سے متعلق خبر کا انتظار تھا چنانچہ رات کو ہی فوری طور پر خیریت سے جلسہ کے اختتام کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔

3۔ وقف عارضی

1964ء میں مجھے ''جاکے چیمہ''، ضلع سیالکوٹ میں دو ہفتہ وقف عارضی میں گزارنے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچ کر میں صدر جماعت سے ملا۔ انہوں نے چند اور دوست بھی بلا بھیجے۔ میری رہائش کا سوچنے لگے۔ مولانا ابوالعطاء صاحب کے بھائی ماسٹر عنایت اللہ صاحب کے ہاں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کھانے کا انتظام واقف کو خود کرنا ہوتا ہے لیکن وہاں میرے

لئے کھانا تیار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے کھانے کا خرچہ ادا کر کے اُن سے پکوانا چاہا۔ پکانے کو تو سب تیار تھے لیکن خرچہ لینے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ بالآخر کسی بیوہ خاتون سے بات کر کے انہوں نے یہ مسئلہ حل کیا۔

دن کے وقت اکثر دوست مصروف ہوتے تھے لہٰذا مغرب عشاء میں کچھ حاضری ہو جاتی اور کچھ درس و تدریس اور مسئلے مسائل ہو جاتے۔ میں میڈیکل بکس بھی ساتھ لے گیا تھا۔ طبی امداد کا بھی وہاں موقع ملتا رہا۔ فارغ وقت میں مطالعہ کرتا یا اِدھر اُدھر گھوم کر تبلیغ کا موقع تلاش کرتا۔ وہاں کیتھولک عیسائیوں کا سنٹر تھا۔ کچھ وقت گزار آتا ''انگریز فادر' وہاں رہتے تھے۔ لیکن ملاقات سے انکاری تھے۔ البتہ پروٹسٹنٹ چرچ میں پادری سے گفتگو ہوئی۔ کچھ دیر اس سے ہلکی پھلکی بات چیت ہوئی اور اس کی تبلیغ سنی۔ جب میں نے کچھ سوال اٹھائے اور وضاحت طلب کی تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ کچھ سوچ کر اس نے بائیبل بند کر دی اور کہا ''میں سمجھ گیا آپ کون ہیں۔ آپ سے بات نہیں ہو سکتی۔'' میں نے کچھ اصرار کیا تو بولا ''نہیں۔ آپ سے بات کی اجازت نہیں۔'' مکرم ماسٹر عنایت اللہ صاحب کا بیٹا عبدالوہاب دیہاتی زندگی میں Adjust ہونے میں میری راہنمائی کرتا رہا۔ یہ دو ہفتے اس گاؤں میں ایک دلچسپ، گو قدرے کٹھن، تجربہ تھا۔

4۔قادیان دارالامان کی زیارت

دسمبر 1964ء میں قافلے کے ساتھ جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کی سعادت ملی۔ سرکاری ملازم ہونے کے ناطے مجھے محکمہ سے N.O.C. لینا تھا۔ درخواست تو اکتوبر میں ہی دے دی تھی اور پیروی بھی کرتا رہا لیکن جب دسمبر تک نہ ملا تو تشویش ہوئی۔ دفتروں کے چکر لگا لگا تھک گیا تھا۔ روانگی سے صرف ایک دن پہلے ملا۔

امرتسر میں قادیان جانے والی ٹرین تیار تھی۔ امیگریشن نے سب کو جلدی جلدی فارغ کر دیا لیکن میرا پاسپورٹ دیکھا تو روک لیا۔ ایک سردار جی میرا پاسپورٹ لے کر کہیں چلے گئے اور میں ایک طرف کھڑا رہا۔ سارا قافلہ ٹرین پر سوار ہو چکا تھا اور ٹرین چھوٹنے کو تھے۔ میں گھبراہٹ میں بار بار پوچھتا کہ میرا پاسپورٹ دیں۔ بالآخر سردار جی آئے۔ پاسپورٹ دیا اور کہا ''جلدی کر گڈی جان والی اے۔'' پُل پر سے دوسرے پلیٹ فارم تک جانے کا وقت نہ تھا۔ میں لائنوں میں سے کود کر ٹرین پر سوار ہوا۔ قادیان میں جس کمرے میں ہم ٹھہرے اس کے متعلق بتایا گیا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ تین دن زندگی کا ایک عظیم روحانی تجربہ تھا اور مسجد مبارک، مسجد اقصیٰ، بیت الدعاء اور بہشتی مقبرہ میں ادا کردہ نمازیں، نوافل اور مانگی دعائیں زندگی کا ایک انمول سرمایہ ہیں۔ انڈیا کے احمدی دوستوں سے میل ملاقات بہت ایمان افروز تھی۔ کیرالہ کے چند نوجوان لڑکوں کے اخلاص اور پیار نے بہت متاثر کیا۔ ہم پاکستانی احمدیوں کو وہ خاص محبت اور عزت سے دیکھتے تھے۔ دولڑکے تو دن بھر میرے ساتھ رہتے اور جماعتی

حالات اور حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی صحت کے متعلق پوچھتے رہتے۔ ان کی فکر دیکھ کر میں حیران ہوتا کہ کیرالہ میں تو عیسائیوں کا کافی زور ہے اور وہاں کے نوجوانوں میں یہ اخلاص۔ آتے ہوئے ہم سب بہت اداس تھے۔ ان کا پیار مجھے آج تک محسوس ہوتا ہے۔

5۔ ''ظالمانہ حرکت''

وزیر آباد میں پبلک جلسے کے بعد جماعت احمدیہ حافظ آباد نے بھی بعد دوپہر ایک پبلک جلسے کا انتظام کیا تھا۔ وزیر آباد سے ہمارے امیر صاحب، قائد صاحب اور بعض دیگر دوست شامل ہوئے تھے۔ میں بھی گیا تھا۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب مہمان خصوصی تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اور مسجد میں نمازیں ادا کرنے کے بعد جلسے میں جانا تھا۔

مسجد میں حضرت میاں صاحب نے اپنا جوتا اُتارا اور ہاتھ میں پکڑ کر مسجد کے اندر لکڑی کے بکس میں رکھ دیا۔ میں نے بھی اپنا جوتا وہیں ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ نماز کے بعد جب میں نے اپنا جوتا اُٹھایا تو ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں حضرت میاں صاحب کا جوتا بھی اٹھا لیا تھا۔ اور باہر لا کر رکھ دیا۔ میں جھک کر اپنا جوتا پہن رہا تھا کہ حضرت میاں صاحب آئے اور جوتا پہنتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور زور سے چٹکی لے کر میرے کان میں کہا ''یہ کیا حرکت کی ہے آپ نے ''ظالمانہ''۔ کندھے پر چٹکی خاصی زور سے لی تھی اور میں دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں کندھے کو سہلاتا ہوا، آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چل رہا تھا اور دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ

''حرکت مجھ سے شاید ظالمانہ ہی سرزد ہوگئی ہے۔ میں اس قابل نہ تھا کہ وہ جوتے اٹھا سکتا۔''

6۔ مرغّن اور متبرک ناشتہ

ایک دفعہ اپنی مجلس کے خدّام کے ساتھ میں خدّام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع میں شمولیت کے لئے ربوہ گیا۔ میں اس وقت اپنی مجلس کا قائد تھا۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب صدر مجلس خدام الاحمدیہ تھے۔ صبح کی نماز کے بعد ہم بھُنے ہوئے چنوں کا ناشتہ کر رہے تھے کہ مکرم میاں صاحب آئے اور مجھے الگ بلا کر کہا ''گھر سے اطلاع ملی ہے کہ بچّی کو رات بھر سخت بخار رہا ہے۔ آپ میرا سائیکل لے جائیں اور جا کر بچّی کو دیکھ کر مناسب علاج کر آئیں۔''

میں روانہ ہونے لگا تو آپ نے کہا ''ملازمہ سے کہہ دینا کہ وہ آپ کو ناشتہ کروا دے۔'' میں نے رُک کر عرض کی کہ ''نہیں میاں صاحب، اس کی ضرورت نہیں، میں واپس آ کر ناشتہ کرلوں گا۔''

آپ نے پھر مجھ سے کہا ''نہیں، نہیں، تکلّف نہ کریں۔ ملازمہ سے کہہ دینا''

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر معذرت کرتے ہوئے عرض کی ''نہیں میاں صاحب رہنے دیں، میں ملازمہ سے ایسا کہہ نہ پاؤں گا۔''

اس پر مکرم میاں صاحب نے جیب سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر اچھی طرح تین چار دفعہ تہہ کر کے خود میری جیب میں ڈال دیا اور فرمایا یہ رقعہ گھر جا کر دے دینا۔ اب میرے پاس کوئی عذر نہ تھا چنانچہ میں نے جا کر ملازمہ کو رقعہ دے دیا اور پھر بچی کا معائنہ کیا اور بازار جا کر ٹیکے اور دوا خریدی اور آ کر بچی کا علاج کیا اور ضروری ہدایات دیں۔ جونہی میں فارغ ہوا۔ ملازمہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کو کہا اور پھر اچھا مرغن اور متبرّک، ناشتہ آ گیا۔

اجتماع میں واپس آ کر میں نے مکرم میاں صاحب کو سائیکل واپس کی اور بچّی کی بیماری اور علاج کے متعلق بتایا۔ پھر آپ نے پوچھا "وہ ناشتہ!" میں نے عرض کی "جی میں نے کرلیا ہے۔" پھر پوچھا "ٹھیک سے کیا تھا یا تکلّف ہی کرتے رہے۔" اجتماع کے چند روز بعد مجھے مکرم میاں صاحب کا خط ملا۔ جس میں "بچی کے کامیاب علاج" پر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔

خط ہاتھ میں لئے میں دیر تک بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ میری ایک حقیر سی خدمت کی یہ قدر دانی، .... یہ تو ان کا احسان تھا مجھ پر کہ موقع دیا۔

ورنہ خدمت کے لئے کچھ کم نہ تھے خدمت گزار

7۔ خوش اخلاقی "طریقۂ واردات"

1968ء کی بات ہے کہ ایک روز ایک پولیس افسر میرے دفتر میں آیا اور تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ یہاں نیا آیا ہے۔ لہٰذا ملنے چلا آیا ہے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اچھا مذہبی رجحان رکھتا تھا اور حافظِ قرآن بھی تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں ہماری دوستی ہوگئی۔ وہ میرے مذہبی رجحان، داڑھی اور خوش اخلاقی کا اکثر ذکر کرتا تھا۔

ایک روز وہ آیا تو کچھ سنجیدہ سا دکھائی دیا۔ میں نے بیٹھنے کو کہا تو بولا کہ "آپ ان مریضوں سے فارغ ہولیں میں باہر انتظار کرتا ہوں۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔" میں فارغ ہوا تو وہ آ کر بیٹھ گیا اور کہا "آپ سے ایک بات پوچھنی ہے گو مجھے یقین ہے کہ وہ بات بالکل غلط ہوگی۔ آپ ایسے آدمی سے ایسی توقع نہیں۔" میں نے کہا "کیا ہو گیا، بات کیا ہے، آپ پوچھیئے۔"

وہ بولے "سٹیشن کے بُک سٹال پر کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ آپ مرزائی ہیں۔ ویسے میں نے تو وہیں کہہ دیا تھا کہ ایسا ہو نہیں سکتا معاف کرنا۔ صرف تسلّی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے کہا "حافظ صاحب! اوّل تو مجھ میں کوئی خوبی ہے نہیں۔ لیکن اگر آپ کو کوئی نظر آئی ہے تو حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ وہ صرف اور صرف میری احمدیت کی وجہ سے ہی ہو

گی۔ میں خدا کے فضل سے احمدی ہوں۔''

میری بات سن کر اُسے صدمہ ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔

''نہیں، آپ ایسا شخص ضائع نہیں ہونا چاہیئے ۔ آپ مجھے موقع دیں کہ میں آپ کی اصلاح کر سکوں۔''

میں نے فوراً جواباً کہا: ''ضرور، ضرور، یہ آپ کا احسان ہوگا اگر آپ مجھے بہتر راستہ دکھا سکیں۔''

چنانچہ اس کے بعد ان کی رہائش گاہ پر دو ملاقاتیں ہوئیں۔ زیادہ تر ''ختمِ نبوت'' پر بات ہوتی رہی۔

میرے پاس ایک ''دو ورقہ'' تھا جس کا عنوان تھا ''ختم نبوت اور بزرگان دین'' یہ ''دو ورقہ'' لاہور کی جماعت نے شائع کیا تھا اور 1954ء میں مسجد احمدیہ دہلی دروازہ لاہور سے میں نے نماز جمعہ کے بعد حاصل کیا تھا۔ (اب 2009ء تک بھی وہ دو ورقہ میرے پاس موجود ہے)

حافظ صاحب سے دوسری ملاقات کے آخر میں مَیں نے وہ حوالے دکھا کر ان سے پوچھا کہ ''امت کے سب بزرگانِ دین گزشتہ چودہ سو سال میں وہی عقیدہ رکھتے تھے جو جماعت احمدیہ پیش کرتی ہے۔ اب آپ بتائیں میرے لئے کیا حکم ہے۔ میں کیا کروں۔

کچھ سوچ کر وہ بولے: ''آپ کا کیس خاصا بگڑ چکا ہے۔ اصلاح مشکل ہے۔''

یہ ''خوش اخلاقی دراصل آپ لوگوں کا طریقۂ واردات ہے۔''

8۔ جواب طلبی اور تبادلہ

حافظ صاحب نے میری ''اصلاح'' کا اب دوسرا طریقہ استعمال کیا۔ اوپر میری رپورٹ کر دی۔

کچھ عرصہ بعد حکام بالا نے مجھے لاہور طلب کیا۔ چیف میڈیکل افسر نے میز کی دراز سے ایک رپورٹ نکال کر مجھے سنائی۔ لکھا تھا۔

''وزیر آباد کا ریلوے میڈیکل افسر ایک کٹڑ مرزائی ہے۔ یہ اپنا زیادہ تر وقت مرزائیت کی تبلیغ میں صرف کرتا ہے۔ اس کی خدمات کے صلہ میں مرکز نے اس کو ضلع قائد مقرر کیا ہے۔ ہسپتال مرزائیوں کا اڈا بن کر رہ گیا ہے............''

چیف نے کہا کہ یہ رپورٹ ''اُوپر'' سے موصول ہوئی ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ میں نے وضاحتاً کہا کہ یہ تو درست ہے کہ میں احمدی ہوں اور یہ کہ میں ضلع قائد ہوں۔ باقی باتیں غلط ہیں۔ میں گھر میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ پھر میں نے پولیس افسر کا بتایا کہ اس نے خود گھر اپنے بلایا تھا اور اب شکایت کر دی ہے۔ اس جواب طلبی کے چند دن بعد مجھے تبدیلی کا خط مل گیا۔ مجھے پھر بلوچستان کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے احتجاج کیا کہ میں پہلے ہی اس علاقہ میں کام کر چکا

ہوں۔اب پھر اُدھر بھیجنا زیادتی ہے۔کئی ماہ تک میں نے مختلف ذرائع سے کوشش جاری رکھی اور بالآخر مجھے کندیاں تبدیل کر دیا گیا۔چنانچہ 1969ء میں مَیں وزیرآباد سے کندیاں چلا گیا۔

کندیاں سے وقف کی درخواست

1970ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے افریقہ کے دورہ سے واپس آ کر ''نصرت جہاں سکیم'' کا آغاز فرمایا اور ڈاکٹرز اور ٹیچرز کو اس سکیم کے تحت وقف کرنے کی تحریک فرمائی۔ میں نے حضور کا ارشاد سنتے ہی وقف کی درخواست سیکرٹری صاحب مجلس نصرت جہاں مکرم مولانا محمد اسماعیل منیر صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔

وقف کی درخواست ردّ

دو تین ہفتہ تک جب درخواست کا کوئی جواب نہ آیا تو میں نے سوچا کہ ربوہ جا کر پتہ کرنا چاہئے کہ میری درخواست کا کیا بنا۔ چنانچہ ربوہ پہنچ کر میں مکرم سیکرٹری صاحب ''مجلس نصرت جہاں'' سے اُن کے دفتر میں ملا اور اپنی درخواست کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ

''درخواست تو آپ کی پہنچ چکی ہے لیکن ہمیں یا تو ایسے ''فریش گریجویٹس'' کی ضرورت ہے جو یہاں اپنی ملازمت وغیرہ شروع کرنے سے پہلے تین سال تک افریقہ جا کر خدمت کر آئیں۔ یا پھر ایسے ریٹائرڈ ڈاکٹرز درکار ہیں جو چند سال وقف کر کے خدمت کر آئیں۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ آپ اپنی بارہ بارہ سال کی ملازمت چھوڑ کر باہر جائیں۔''

میں نے جواباً کہا کہ حضور نے تو ایسی کوئی تخصیص نہیں فرمائی تھی اور ڈاکٹرز کو عمومی طور پر مخاطب فرمایا تھا۔ لہٰذا میں نے درخواست دے دی۔ آگے آپ جیسا مناسب خیال کریں۔

میری درخواست گویا ردّ ہو چکی تھی۔ سیکرٹری صاحب کی بات میں خاصا وزن تھا۔ نظر ثانی کی بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ............''

دربارِ خلافت سے وقف کا ارشاد

میں انتہائی مایوسی کے عالم میں سیکرٹری صاحب کے دفتر سے نکلا اور گول بازار سے ہوتا ہوا دفاتر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں مجھے مکرم جی۔ ایم۔ اختر صاحب مل گئے [1] یہ ریلوے کے ریٹائرڈ افسر تھے اور وزیر آباد سے میرا جو تبادلہ ہوا تھا اس سلسلہ میں انہوں نے میری اچھی مدد کی تھی۔

اختر صاحب نے میرا ہاتھ ایسا پکڑا کہ اپنے گھر تک نہ چھوڑا۔ ہم باتیں کرتے چلتے گئے۔ میں نے اپنی وقف کی درخواست اور پھر اپنی مایوسی کا بھی ذکر کیا۔ دو تین بار میں نے اُن سے اجازت چاہی اور کہا کہ مجھے دفتروں میں کام ہے۔ ہمشیرہ سے بھی ملنا ہے اور پھر شام کی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور ہاتھ نہ چھوڑا۔ گھر جا کر کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا ''نماز ظہر کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو مسجد مبارک میں نماز پڑھتے ہیں، پھر چلے جانا۔'' مجھ

---

[1] مکرم جی۔ ایم۔ اختر صاحب ریلوے کے اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے اور ناظر اعلیٰ ثانی کے طور پر ربوہ میں متعین تھے۔ ریلوے حکام ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سے انکار نہ ہوسکا۔ میں نے دوسرے سب پروگرام ختم کر دیئے اور اُن کے ساتھ مسجد چلا گیا۔

اختر صاحب پہلی صف میں عین محراب کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں تیسری صف میں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اختر صاحب مڑے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے آگے بلانے لگے۔ میں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے ہی اُن سے کہا کہ ''نہیں، میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔'' لیکن وہ بضدر ہے اور مجھے مجبوراً آگے جانا پڑا۔ انہوں نے اپنے پاس میرے لئے جگہ بنائی۔

ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ کھڑکی کھلی اور حضور تشریف لے آئے۔ حضور کی نظر مجھ پر پڑی تو حضور نے فرمایا ''او! تم وقف کیوں نہیں کرتے، تم تو ہمارے شاگرد ہو۔'' میں نے فوراً عرض کی ''حضور میری درخواست تو پہلے ہی مجلس نصرت جہاں کے دفتر میں پہنچ چکی ہے۔'' اختر صاحب نے حضور سے میرا تعارف کراتے ہوئے میرا نام بتایا اور کہا کہ یہ ریلوے میں .... '' حضور نے اختر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ کیا تعارف کرار ہے ہیں ان کا۔ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ میرے شاگرد ہیں۔''

نماز کے بعد اختر صاحب نے مجھے مبارک باددی اور کہا کہ ''چھوڑیں اب درخواست کو، جائیں جا کر تیاری کریں۔ آپ کو تو حکم ہو گیا ہے۔''

ربوہ سے واپس کندیاں آتے ہوئے میں ٹرین میں بیٹھا حیران ہو کر یہ سوچتا رہا کہ کیا عجب اسباب بنائے اللہ تعالیٰ نے۔ پہلے مجھے اچانک ربوہ لے گیا۔ وہاں سیکرٹری صاحب نصرت جہاں کے دفتر میں مجھے پہلے مایوسی دکھائی اور پھر وہاں سے پریشان نکلا تو حقیقتاً ہاتھ سے پکڑ کر کشاں کشاں دربار خلافت میں پہنچا دیا۔ جہاں میری مایوسی خوشی میں بدل گئی اور میری ردشدہ درخواست شرف قبولیت پاگئی۔

شاگردی کے حوالے سے حضور کا فرمان میرے لئے خاص طور پر خوشی اور اطمینان کا باعث تھا کہ اس سے میرے وقف میں حضور کی رضا اور دعا اور خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت شامل ہو گئی تھی۔ اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ ''شرف شاگردی'' بھی مجھے حضور ہی کے ایک فرمان کے طفیل حاصل ہوا تھا۔

تقرری اور تیاری

ربوہ سے واپس آئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ مجھے سیکرٹری صاحب نصرت جہاں سکیم کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ حضور نے میری تقرری نائیجیریا کے شہر ''اجی بواوڈے (Ijebuode)'' میں کر دی ہے۔ میں اپنی ڈگری کی مستند نقول مکرم فضل الٰہی صاحب انوری امیر جماعت نائیجیریا کو ارسال کر دوں اور میں اپنے پاسپورٹ بنوانے کی کارروائی شروع کر دوں۔

میں نے اپنی ڈگری کی نقل مکرم امیر صاحب نائیجیریا کو بھیج دی۔ تقریباً ایک ماہ بعد مجھے نائیجیریا میڈیکل کونسل کا خط ملا کہ میری ڈگری ان کو قبول ہے۔ اور یہ کہ میں اب اپنے تجربہ کے سرٹیفکیٹ پیش کروں۔ اسی طرح مجھے یہ بھی اطلاع مل گئی تھی کہ اجی

بواوڑے جماعت نے ایک دومنزلہ عمارت جو پہلے نیشنل بنک کے استعمال میں تھی، کلینک کے لئے مخصوص کر لی ہے۔ یہ اطلاعات میرے لئے حوصلہ افزا تھیں۔ البتہ پاسپورٹ بنوانے کی کارروائی نے ناک چنے چبوا دیئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نائیجیریا پہنچ کر یہ دونوں ''حوصلہ افزا'' اطلاعات بھی خاصی حوصلہ شکن ثابت ہوئی تھیں جیسا کہ آگے ذکر آ جائے گا۔ اور پھر انہی تین مشکلات کا ہی کیا ذکر، حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم موڑ، مسئلہ یا مرحلہ ایسا نہیں آیا جو بغیر کسی روک رکاوٹ اور غم فکر کے حل ہو گیا ہو۔ قدم قدم پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ مصرعہ یاد آیا۔

ع۔ ''آنکھ کے پانی سے یارو کچھ کرو اس کا علاج''

پاسپورٹ کا حصول

میں نے پاسپورٹ کے لئے درخواست بڑی احتیاط سے تیار کی تھی۔ میانوالی میں رانا بشیر احمد صاحب مجسٹریٹ تھے۔ یہ وہی ہیں جو پہلے فوج میں تھے۔ انہوں نے درخواست کی تیاری میں بہت مدد کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ پولیس رپورٹ کے لئے درخواست واپس ضلع پولیس کو بھیجی جاتی ہے۔ بہتر ہے پولیس کلیرنس پہلے ہی لے کر درخواست کے ساتھ پاسپورٹ آفس راولپنڈی ارسال کی جائے۔ چنانچہ اس پولیس رپورٹ کے حصول میں بھی انہوں نے مدد کی تھی۔ درخواست روانہ کرنے کے چند دن بعد میرا خیال تھا کہ راولپنڈی جا کر اس کی پیروی کروں گا۔ اس غرض کے لئے میں نے کسی واقفیت یا سفارش کا ذکر رانا بشیر احمد صاحب سے کیا تو انہوں نے ایک بہت اچھا مشورہ دیا۔

کندیاں کے قریب چشمہ بیراج کی تعمیر ہو رہی تھی۔ فرنچ کمپنی ''ڈومیز بوری'' اس بیراج کی تعمیر میں شامل تھی اور اس کی کالونی کندیاں سے چند میل کے فاصلے پر تھی۔ کمپنی کے ہسپتال کا ڈاکٹر چند ماہ کے لئے فرانس گیا تو کمپنی نے مجھے شام کو دو گھنٹہ کے لئے ملازم رکھ لیا۔ اُن کی گاڑی مجھے لے جاتی اور چھوڑ جاتی تھی۔

رانا بشیر احمد صاحب نے بتایا کہ پنڈی کے پاسپورٹ افسر کا باپ جو ایک ریٹائرڈ پولیس افسر تھا۔ اس کالونی میں سیکورٹی افسر ہے۔ اس سے مل لو۔ چنانچہ میں نے اس سے مل کر بیٹے کے نام ایک سفارشی خط حاصل کر لیا۔ میں بہت خوش تھا۔ بھلا اس سے بہتر سفارش اور کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن......شاید...... پاسپورٹ افسر کے باپ کی سفارش حاصل کر کے میں کچھ زیادہ ہی خوش ہو گیا تھا اور اس خوشی میں اپنے ''آسمانی باپ'' کو بھول گیا تھا۔ اور میرے ''باپ'' کو یہ بات پسند نہ آئی۔

میں خط لے کر پنڈی گیا اور بعد دوپہر پاسپورٹ آفس پہنچا۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا بلڈنگ کے اندر گیا تو برآمدہ میں ایک بابو سے سامنا ہوا۔ سانولا رنگ لمبے بال اور منہ میں پان تھا۔ بڑی شستہ اُردو میں بولا۔

''فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں''

میں نے کہا کہ مجھے پاسپورٹ افسر سے ملنا ہے۔ اس نے کہا ''صاحب تو اس وقت دفتر میں نہیں۔'' میں خاموش رہا تو اس

نے پوچھا ''کیا کوئی پاسپورٹ کی درخواست لائے ہیں۔'' میں نے کہا کہ درخواست تو ہفتہ بھر پہلے ارسال کر چکا ہوں۔ اب تو لینے آیا ہوں۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میرا نام سن کر اُس نے کہا:

''ہاں درخواست تو آپ کی پہنچی تھی لیکن وہ پولیس رپورٹ کے لئے گئی ہے۔''

میں نے فوراً کہا کہ پولیس رپورٹ تو میں نے لے کر ساتھ لگائی تھی۔

کچھ سوچ کر اس نے کہا ''اچھا تو آئیں پھر دفتر میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''

میں نے کہا ''مجھے صاحب سے ملنا ہے۔ ان کے نام ایک پیغام بھی ہے میرے پاس۔''

اس کا موڈ ''آف'' ہو گیا۔ بڑی بے رخی سے بولا ''اچھا تو پھر مل لیجئے کل صاحب سے'' اور وہ چلا گیا۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا کہ کارروائی کا آغاز کچھ اچھا نہیں ہوا۔ میں وہاں سے نکلا اور لوگوں سے پوچھتا ہوا پاسپورٹ افسر کی کوٹھی جا پہنچا۔

پاسپورٹ افسر سے ملا۔ خط دیا۔ وہ کچھ دیر پوچھتا رہا کہاں جانا ہے۔ کیا ارادہ ہے۔ پھر اس نے کہا کہ ٹھیک ہے صبح دفتر آ جائیں۔ وہاں سے میں مسجد احمدیہ آ گیا اور وہیں رات گزاری۔

صبح جب پاسپورٹ آفس پہنچا تو وہ کلرک بابو بھی وہیں تھا۔ ہم نے دُور سے ہی ایک دوسرے کو دیکھا۔ کافی دیر بعد صاحب آئے۔ میں نے سلام کیا اور وہ مجھے ساتھ لے کر دفتر آ گئے۔ میں ایک طرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور صاحب کے سامنے فائلوں کے ڈھیر لگ گئے۔ کلرک آتے جاتے رہے اور وہ فائلوں کا مطالعہ کر کے دستخط کرتے رہے۔

کوئی آدھ پون گھنٹہ بعد صاحب نے ایک کلرک سے اُسی بابو کو بلانے کے لئے کہا۔ وہ کلرک گیا اور آدھ گھنٹہ بعد آیا اور صاحب کو بتایا کہ ''وہ شارٹ لیو Leave پر گیا ہے۔''

پھر آدھ گھنٹہ بعد صاحب نے پوچھا تو کلرک نے کہا ''جی ابھی واپس نہیں آیا۔''

اب صاحب کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ صاحب نے کلرک کو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ان کو ساتھ لے جائیں اور جب وہ آئے تو کہہ دینا کہ ان کا کام کر دے۔''

میں اس کلرک کے ساتھ گیا تو دیکھا کہ وہ بابو دفتر میں ہی تھا۔ فائل دیکھ کر اس نے کہا کہ میں فائل کو چیک کروں گا۔ آپ دو روز بعد آ جائیں۔ میں نے کہا ''میں بہت دُور سے آیا ہوں اور چھٹی بھی ختم ہو رہی ہے۔'' بڑی مشکل سے وہ مانا اور کہا کہ اچھا کل آ جائیں۔

اگلے روز گیا تو بابو دفتر میں نہ تھا۔ انتظار کرتا رہا۔ میں پھر صاحب سے ملا۔ اس نے پھر اسی طرح ایک ڈیڑھ گھنٹہ بٹھا کر کسی کلرک کے سپرد کر دیا کہ جب وہ بابو آئے تو اس سے کہنا کہ ان کا کام کر دے۔ خود صاحب ایک بجے کے قریب گھر چلے گئے اور میں بابو کا انتظار کرتا رہا۔ بعد دوپہر وہ بابو نظر پڑا تو بولا ''کام بہت ہے۔ وہ چیک نہیں کر سکا۔ کل آنا۔'' میں سخت پریشان

ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بابو ناراض ہے۔ صاحب کے قابو میں نہیں۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔

اگلی صبح پہنچا تو میں نے کلرکوں سے سنا کہ صاحب تو آج دفتر نہیں آئیں گے۔ اور بابو کے متعلق سنا کہ وہ دو ماہ کی چھٹی انڈیا جا رہا ہے کل سے۔ آج شاید ایک دو گھنٹہ کے لئے دفتر چکر لگائے۔

سنتے ہی مجھ پر جیسے بجلی سی گری۔ میں یہ سوچ کر سخت پریشان ہو گیا کہ یہ بابو اگر چھٹی پر جا رہا ہے تو مجھے ''صاحب سے ملنے کی سزا'' دینے کے لئے یہ جاتے ہوئے میری فائل کہیں اِدھر اُدھر کر جائے گا۔ اور پھر جو ہو گا وہ سوچ سوچ کر میں نڈھال ہو رہا تھا۔ سارا پلان گڑبڑ ہو گیا تھا۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میری چھٹی ختم ہو رہی تھی اور پاسپورٹ کے حصول کا امکان دُور سے دُور تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ میں اس یقین کے ساتھ آیا تھا کہ دو روز میں پاسپورٹ لے کر واپس کندیاں آ جاؤں گا اور پھر اس کو سیکرٹری صاحب تک پہنچا دوں گا جو جلد مانگ رہے تھے۔

میں واپس مسجد آ گیا اور ایک چارپائی پر مایوسی سے بے حال گر پڑا۔ سوچتا رہا کہ یہ سفارش کے چکر میں پڑا ہی کیوں۔ بابو سے ہی بات کر کے مسئلہ حل کر لیتا لیکن اب تو بات بگڑ چکی تھی اور کوئی حل سوجھ نہ رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ باپ کی سفارش کے باوجود وہ پاسپورٹ افسر کس قدر بے بس اور بے حس تھا۔ یا پھر شاید یہ سب کچھ ملی بھگت ہی تھی۔ جسم تھکا ہوا تھا۔ دماغ پریشان اور دل بھرا ہوا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور وضو کر کے جا اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور خوب گڑگڑایا۔

نوافل سے فارغ ہوتے ہی مایوسی کے بادل چھٹنے شروع ہو گئے۔ اچانک جماعت کے ایک دوست کسی کام سے مسجد آئے۔ مجھے دیکھا تو پوچھا ''کیا بنا، ہوا کچھ مسئلہ حل؟''

میں نے ساری بات ان سے کہہ دی اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ ہمارے ایک احمدی دوست D.S.P. ہیں۔ نام ان کا فردوس ہے۔ ان سے جا کر ملیں۔ پتہ بھی انہوں نے بتا دیا۔

میں جب D.S.P صاحب کے دفتر پہنچا تو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد دفتر میں ذرا پیٹی ڈھیلی کر کے آرام کر رہے تھے۔ بڑی توجہ سے انہوں نے میری بات سنی اور فوراً پاسپورٹ آفس کے ہیڈ کلرک کو فون کیا۔ اور اس سے میری درخواست، بابو کی چھٹی اور میرے خدشات کا ذکر کیا۔ فون کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ کل صبح جا کر ہیڈ کلرک سے مل لینا۔

اگلے روز میں صبح ہی ہیڈ کلرک سے جا ملا۔ سلام کر کے میں نے فردوس صاحب کے فون کا حوالہ دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ کلرک نے عبدالرحمٰن نامی ایک کلرک کو آواز دی اور میز کی دراز سے بابو کے دفتر کی چابی نکال کر اس کو دی اور کہا کہ ''ان کو ساتھ لے جائیں اور ان کا کیس دیکھیں۔''

سفید شلوار قمیض میں ملبوس، عبدالرحمٰن ایک نوجوان لڑکا تھا۔ دفتر جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا ''میری نہیں جی عادت، لوگوں کو تنگ کرنے کی۔'' میں نے اس کی بات کو سراہتے ہوئے کہا ''اچھی عادت ہے یہ۔'' اس کی اس بات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کلرکوں کو علم ہے کہ مجھے تنگ کیا گیا ہے۔ دفتر پہنچ کر وہ میری فائل ڈھونڈنے لگا لیکن وہ مل نہ رہی تھی۔ وہی بات ہوئی جس کا خطرہ تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ پہلے دن جب بابو نے میری فائل دیکھی تھی اور مجھے اگلے روز آنے کو کہا تھا تو جاتے ہوئے میں نے مڑ کر کھڑکی میں سے دیکھا تھا کہ وہ میری فائل لے کر بائیں جانب کونے کی طرف گیا تھا۔ میں نے اُدھر اشارہ کر کے عبدالرحمٰن سے کہا کہ وہاں دیکھے۔ وہاں شیلفوں پر ڈھونڈتے ہوئے سب سے اوپر پرانی فائلوں کے ڈھیر کے نیچے سے میری فائل برآمد ہو گئی۔ فائل ملی تو عبدالرحمٰن نے کہا کہ آپ دو تین گھنٹہ کہیں گھوم آئیں۔ میں دفتر میں نیا ہوں ذرا دفتر کو بھی دیکھ لوں اور آپ کی فائل کو بھی۔ میں باہر جانے لگا تو اس نے پوچھا ''آپ کو کتنی جلدی پاسپورٹ درکار ہیں۔'' میں نے کہا ''میں تو کئی روز سے خراب ہو رہا ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے۔ مہربانی ہو گی۔'' باہر آ کر میں کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کہیں کھانا کھایا، نمازیں پڑھیں اور ایک بینچ پر کچھ دیر آرام کیا۔

اُن حالات میں تو پاسپورٹ کے مل جانے کا امکان ہی میرے لئے بہت باعث سکون تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسی رات مجھے واپس کندیاں چلے جانا چاہئیے۔ کیونکہ میری چھٹی ایک روز پہلے ختم ہو چکی تھی۔ میں ہفتہ دس دن بعد پنڈی آ کر پاسپورٹ حاصل کر کے اُسی روز ہی شام کو واپس جا سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں دو اڑھائی بجے بعد دوپہر دفتر پہنچا۔ عبدالرحمٰن میرا منتظر تھا۔ میری خوشی اور تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دراز سے میری فیملی کے پانچ پاسپورٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ ''آسمانی باپ'' نے میری فریاد سن لی تھی اور سفارش بھی ''آسمانی بھائی'' کی ہی کام آئی۔

ملازمت سے چھٹی یا استعفیٰ

تقرّری کے بعد میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے ملازمت سے چھٹی لینی چاہئیے یا استعفیٰ دینا چاہئیے۔ اگر چھٹّی لوں تو کتنی۔ تین سال بلکہ چھ سال بھی مجھے حضور کے ارشاد کی روشنی میں کم محسوس ہوتے تھے۔ دوسری طرف یہ سوچتا تھا کہ ممکن ہے جماعت کو میرے چند سال ہی درکار ہوں۔ ''نصرت جہاں سکیم'' کے قواعد میں تو تین سال کا ہی ذکر تھا۔ اگر ملازمت چھوڑوں تو بعد میں واپس آ کر کیا کروں گا۔

میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ مجھے سیکرٹری صاحب ''مجلس نصرت جہاں'' کا خط ملا کہ حضور نے مجھے طلب فرمایا ہے۔ حضور ان دنوں ایبٹ آباد میں تھے۔ میں وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب کو بھی بلایا گیا تھا۔ ہم حاضر ہوئے۔ حضور نے ہدایات دیں۔ میں نے حضور سے پوچھ لیا کہ میں چھٹّی لوں یا ملازمت چھوڑ دوں۔ حضور نے میری مدّتِ ملازمت اور پینشن وغیرہ کا پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ صرف بارہ سال مدّتِ ملازمت ہے۔ پینشن وغیرہ کچھ نہیں ملے گا۔ حضور نے نظریں جھکا کر قدرے

توقف فرمایا، اور پھر فرمایا۔ ''چھوڑ و''

میں نے عرض کی کہ حضور میں استعفیٰ تو دے دوں گا لیکن یہ قبول نہ ہوگا کیونکہ محکمہ ریلوے میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ حکام پر اگر زیادہ ہی زور دیا جائے کہ ضرور ملازمت چھوڑنی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ Abscond کر جاؤ۔ ہم تمہارے خلاف زیادہ کاروائی نہ کریں گے۔

اس پر حضور نے قدرے سختی سے فرمایا:

''نہیں، نہیں، ہم نے کوئی کام غیر قانونی نہیں کرنا۔ تم استعفےٰ دو اور پھر اس کو قبول کروانے کی کوشش کریں گے۔'' پھر حضور نے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا:

''اختر صاحب سے کہیں کہ وہ استعفےٰ کی منظوری کے لئے کوشش کریں۔''

تیاری مکمل لیکن استعفیٰ......؟

ایبٹ آباد سے واپس آ کر میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اختر صاحب اس کی منظوری کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ اس دوران میں نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ گھر کا ساز و سامان آہستہ آہستہ خاموشی سے فروخت کرنے لگے۔

گجرات میں اچھا فرنیچر بنتا ہے۔ وزیرآباد میں قیام کے دوران وہاں سے آرڈر دے کر ہم نے ڈرائینگ روم، ڈائینگ روم اور بیڈ رومز کا فرنیچر بنوایا تھا۔ اسی طرح چائنا کا سائیکل، سلائی مشین اور بیڈ روم کے لئے ''کولر'' وغیرہ تو کندیاں آ کر ہی خریدے تھے اور بالکل نئے تھے۔ لہٰذا سامان کو فروخت کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی تھی۔ دیگر سامان بھی آہستہ آہستہ نکال دیا تھا۔ حتٰی کہ وہ زیور بھی جو اہلیہ نے پہنا نہیں تھا وہ میانوالی کے صرافہ بازار میں فروخت کر دیا تھا۔ البتہ جذباتی لحاظ سے یہ ''تیاری'' بہت کٹھن تھی خصوصاً اہلیہ کے لئے۔ جو گھر برسوں میں بڑی چاہت کے ساتھ بنایا تھا۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں دو چار ماہ میں ختم ہو گیا تھا۔ اس تیاری کے دوران ''خاموشی'' ہماری مجبوری بھی تھی اور ہمارے لئے ضروری بھی۔

میری تیاری تو چند ماہ میں مکمل ہو گئی لیکن میرا استعفےٰ منظور نہ ہوا۔ اور یہ صورتِ حال میرے لئے بہت پریشان کُن تھی۔ اختر صاحب کی سب کوشش ناکام نظر آ رہی تھی۔ اس خیال سے ہی دل بیٹھنے لگتا تھا کہ اب اگر میری روانگی میں کوئی رکاوٹ پڑتی ہے تو کیا بنے گا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کیونکہ ایک تو میں رختِ سفر باندھ چکا تھا۔ میری حالت اس مسافر کی طرح تھی جو گھر بار بیچ کر بال بچوں سمیت پلیٹ فارم پر بیٹھا ہو اور اُسے یقین نہ ہو کہ وہ ٹرین پر سوار ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔

دوسرے مشرقی پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ سرحدوں پر فوجی نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی اور یہ خطرہ تھا کہ ڈاکٹروں کے اخراج پر پابندی نہ لگ جائے۔ ان حالات نے استعفےٰ کی منظوری کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔

تیسرے یہ پریشانی تھی کہ گھریلو فرنٹ پر سب عزیز و اقارب ڈرے سہمے سے تھے۔ ان کے نزدیک میرا اس طرح بارہ سالہ ملازمت کو چھوڑ چھاڑ کر اور گھر بار کو بیچ باچ کر پردیس جانا ایک پاگلانہ اقدام تھا۔ کہتے ہیں ناں کہ

It is always dangerous to change horses in the midst of stream.

اور یہاں تو میں زندگی کے عین منجدھار میں بیوی بچوں سمیت گھوڑے بدل رہا تھا۔ لہٰذا ان عزیز و اقارب کے یہ خدشات اپنی جگہ بجا تھے کہ میں نے اپنے ساتھ اپنے بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔

حلق میں کانٹا۔ اور اس سے نجات

مذکورہ بالا بھیانک پس منظر میں میرے لئے ازبس ضروری تھا کہ میں جلد از جلد اپنی اگلی منزل ''نائیجیریا'' پہنچ جاؤں لیکن یہ ''استعفیٰ'' میرے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا اور اس خوف و ہراس اور گھبراہٹ کے عالم میں میری حالت بھی ایسی مچھلی سے کم نہ تھی۔

اور پھر ایک دن اچانک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ''ون یونٹ'' توڑ دیا گیا ہے اور صوبے بحال کر دیئے گئے ہیں۔ اور سنٹرل گورنمنٹ کے ادارے ریلوے وغیرہ کے انچارج مکرم ایم۔ ایم احمد مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ون یونٹ(One Unit) کیا ٹوٹا ''بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا''۔ میں اخبار لے کر سیدھا ربوہ پہنچا اور وہاں سے تعارفی خط لے کر اسلام آباد گیا۔ تب کہیں جا کر میری جان چھوٹی اور میں اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو سکا۔

حضور سے الوداعی ملاقات:

تیاری کے دوران یوں تو حضور سے کئی بار ملا۔ تاہم افریقہ پرواز سے قبل ایک الوداعی ملاقات کے لئے میں بورے والا سے ربوہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ حضور اسلام آباد میں ہیں۔ دوسرے روز میں ربوہ سے اسلام آباد پہنچا۔ گیٹ مین نے کہا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ کوٹھی کے پیچھے جاؤ اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر پرائیویٹ سیکرٹری سے ملو۔ میں گیا اور مکرم بشیر احمد رفیق صاحب سے ملا جو ان دنوں پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ وہ تعلیم الاسلام کالج کے زمانے سے مجھے جانتے تھے۔ میں نے مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ حضور کی اہم ملاقاتیں جاری ہیں۔ ملاقات کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے بہت کہا کہ دو روز کا لمبا سفر کر کے آیا ہوں اور پھر افریقہ جا رہا ہوں لیکن اُنہوں نے مجبوری ظاہر کی اور مشورہ دیا کہ دعا کے لئے خط لکھ کر چلے جاؤ۔

میں تھکا ہارا، افسردگی اور مایوسی کے عالم میں وہاں آدھ پون گھنٹہ بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ میں کتنا لمبا سفر کر کے آیا۔ اور پھر کہاں جا رہا ہوں۔ یا قسمت یا نصیب۔ بالآخر میں اٹھا اور سلام کر کے نمناک آنکھوں اور بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترا اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی گیٹ سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک کوٹھی کا ایک دروازہ کھلا۔ حضور نے اپنے مہمان کو رخصت کیا اور پھر مجھ سے پوچھا ''ملاقات کرنی ہے۔'' میں اثبات میں صرف سر ہلا سکا کہ حلق تو

بالکل خشک تھا۔ اگلے لمحہ میں حضور کے ساتھ کمرے میں تھا۔ حضور نے تیاری اور روانگی کا پوچھا۔ نصائح کیں۔ دعاؤں اور معانقہ کے ساتھ مجھے رخصت فرمایا۔ واپسی پر میری تھکاوٹ دور ہو چکی تھی اور میں بہت خوش تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ حضور سے ملاقات ہوگئی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ایک دفعہ پھر خدائے رحیم وکریم نے عجب انداز سے میری مایوسی کو خوشی میں بدلا۔ سچ ہے کہ انسان کوئی سعادت حاصل نہیں کرسکتا۔ ''تا نہ بخشد خدائے بخشندہ''

تعلیم الاسلام کالج لاہور

ہاکی میچ - '' عزیزم عبدالرحمٰن آج پریکٹیکل کریں گے ''

اور یہی '' شرفِ شاگردی '' آگے چل کر میری زندگی کا ایک بابرکت موڑ اور انمول سرمایا
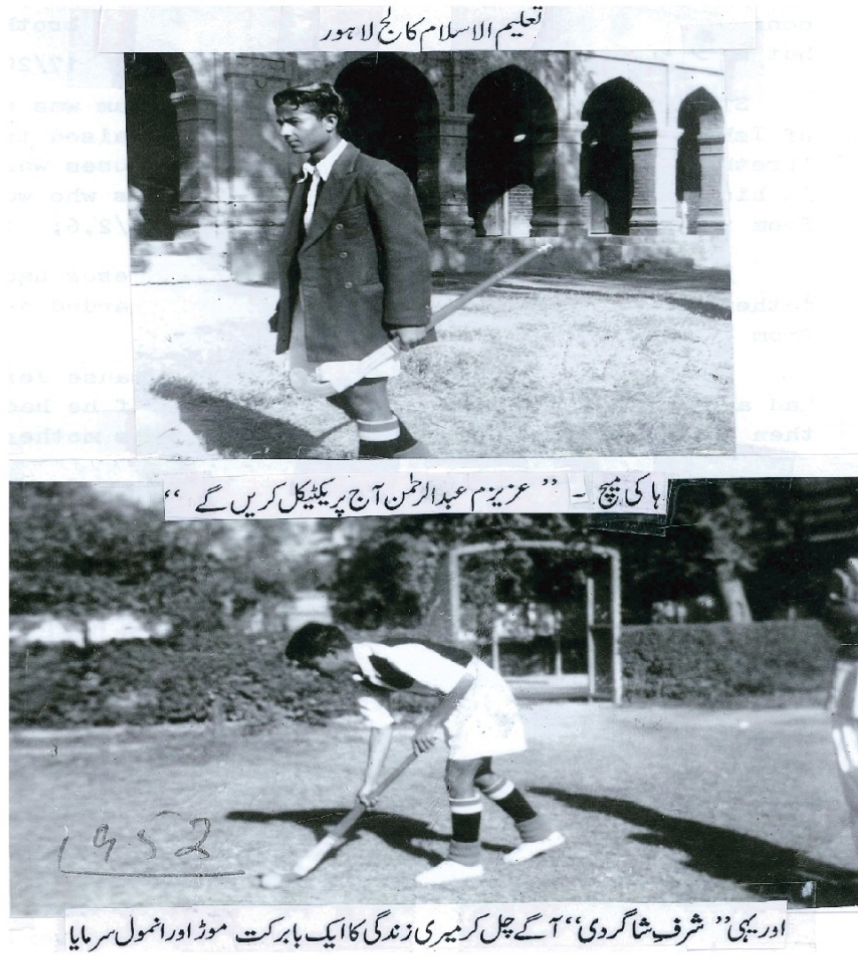
کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں
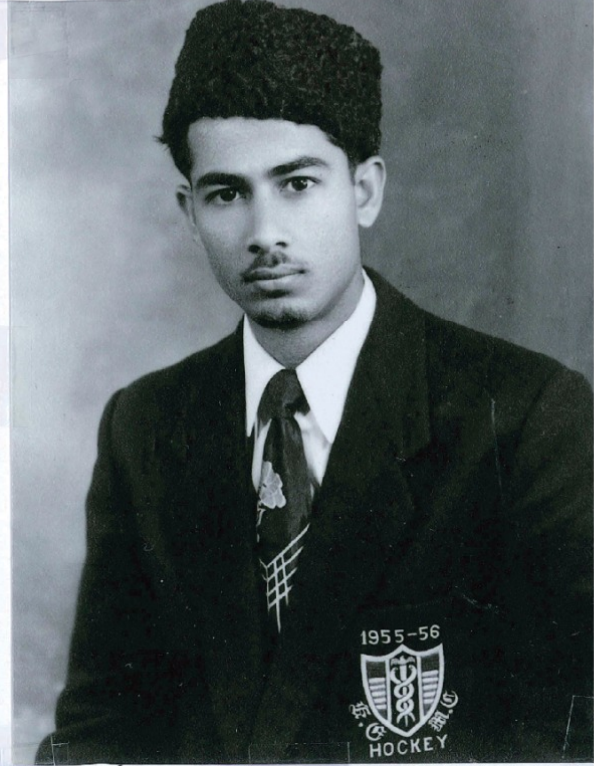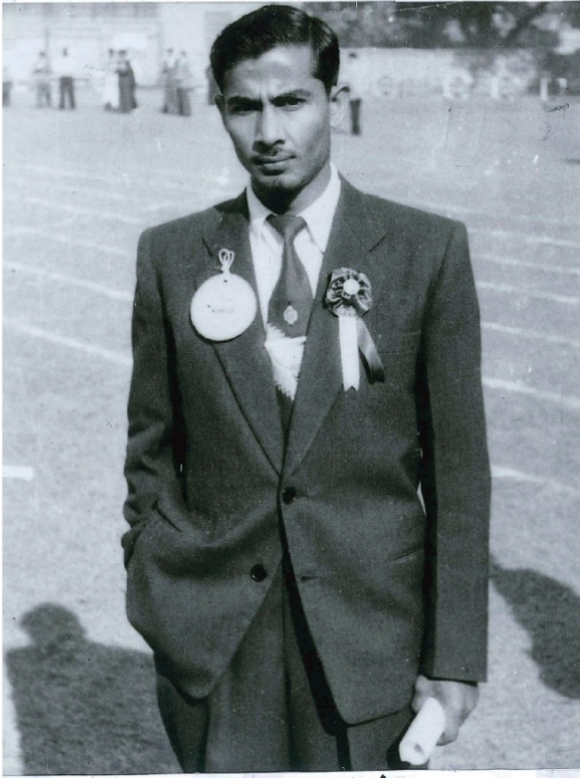
" اُسے کہہ دیں کہ میری جگہ کسی اور لڑکے کو ساتھ لے جائے۔ میں شیو نہیں کرونگا۔ "
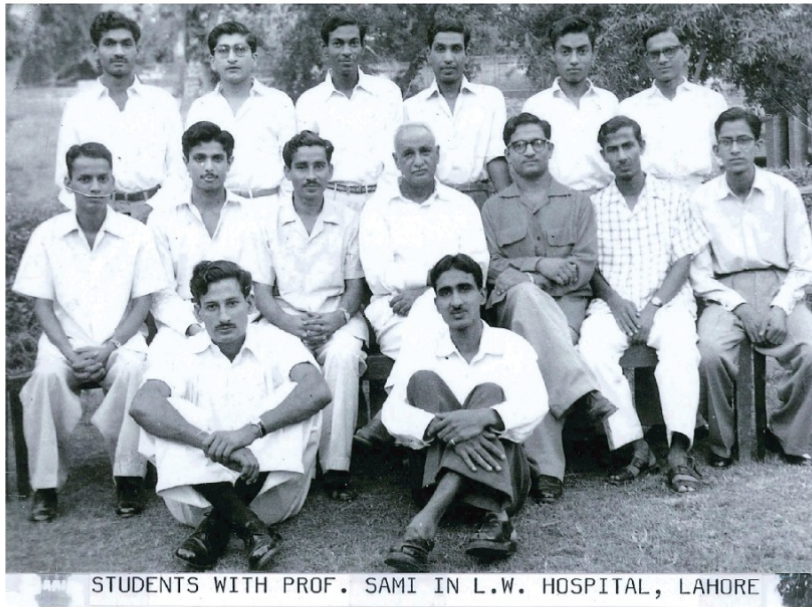
STUDENTS WITH PROF. SAMI IN L.W. HOSPITAL, LAHORE

KING EDWARD MEDICAL COLLEGE, LAHORE

ANNUAL SPORTS
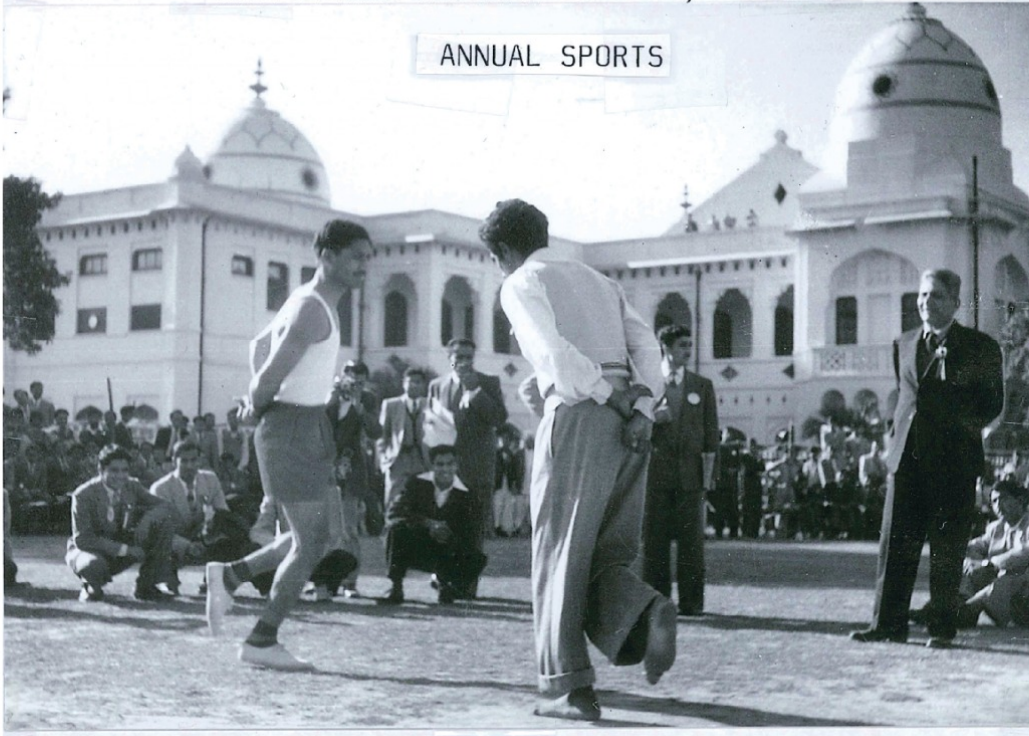
PROFESSORS GETTING READY FOR THE RACE

(PRINCIPAL)
COL. ELAHI BAKHSH DR. AMEER-UDDIN DR. RIAZ QADEER

امرتسر (انڈیا) جاکر گیلنسی میڈیکل کالج کی ہاکی ٹیم کے ساتھ میچ

میچ تو ہم ہار گئے۔ لیکن امرتسر کی سیر اچھی ہوگئی تھی۔ گولڈن ٹمپل بھی دیکھا

البتہ میرے اس 'اعتکاف' میں جس بات نے خلل ڈالا وہ میری شادی تھی
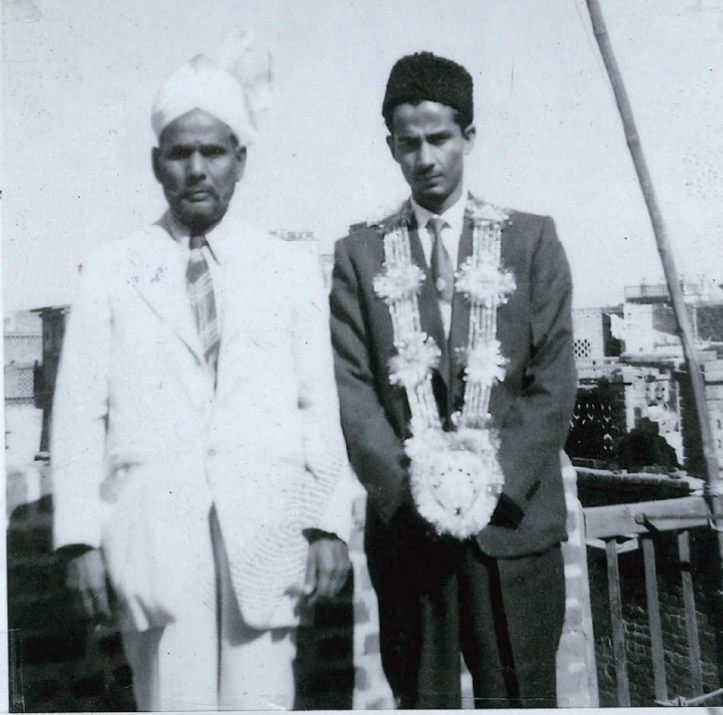
والد صاحب
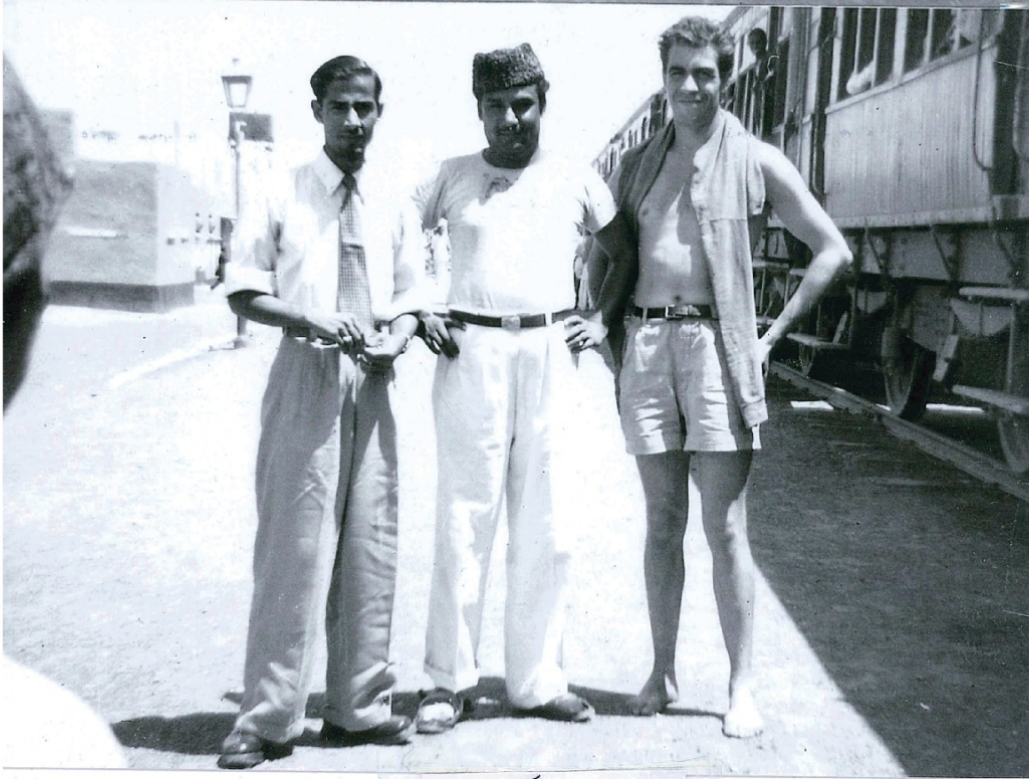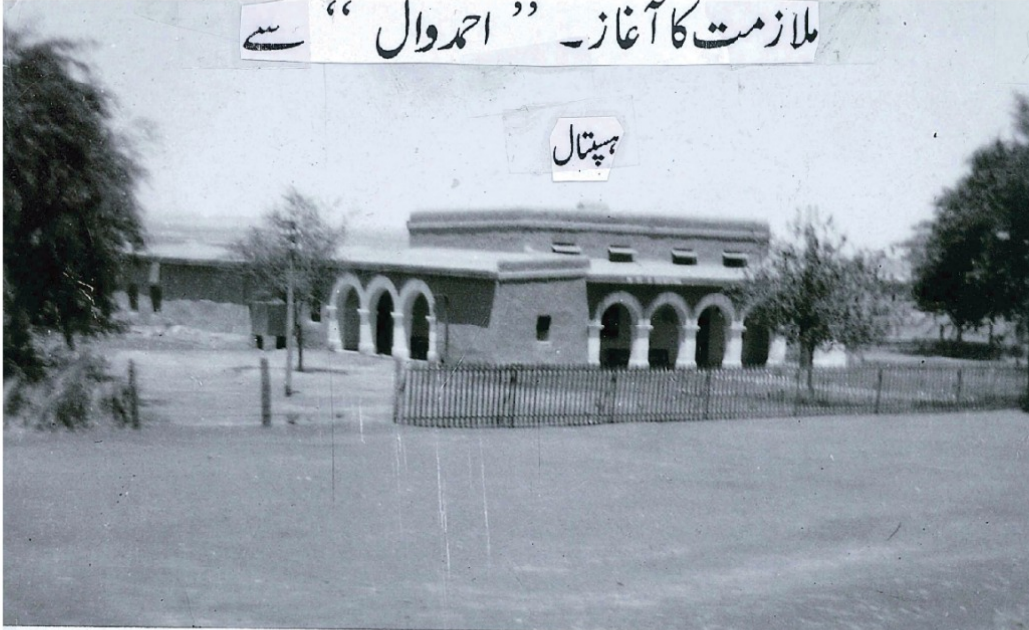
تھرو ٹرین کا غیر ملکی مسافر۔

بنگلہ۔ باغیچہ خوب تھا

انور اور ڈسپنسر

انور۔ بیٹا اور ابراھیم بلوچ احمدی۔

خزاں کے پہلے چند روز
اُداسی اور تنہائی
عبداللہ اچھا باورچی تھا
بلّو کتا
''لنڈو'' ٹرین سے احمد وال سے وزیر آباد کیلیے

وزیر آباد میں ملازمت کے سات سال، جواب طلبی اور تبادلہ

یہ ''خوش اخلاقی دراصل آپ لوگوں کا طریقۂ واردات ہے۔''

''وزیر آباد کا ریلوے میڈیکل افسر ایک کٹڑ مرزائی ہے۔ یہ اپنا زیادہ تر وقت مرزائیت کی تبلیغ میں صرف کرتا ہے۔ اس کی خدمات کے صلہ میں مرکز نے اس کو ضلع قائد مقرر کیا ہے............''

کندیاں کے افسران کے ساتھ

اس جواب طلبی کے چند دن بعد مجھے تبدیلی کا خط مل گیا۔ چنانچہ 1969ء میں مَیں وزیر آباد سے کندیاں چلا گیا۔ (اور 1970 میں کندیاں سے وقف کی درخواست دے دی۔ اور نائیجیریا چلا گیا۔)

صفدر نذیر (مربی سلسلہ) اوران کے والد نذر محمد نذیر

صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب — چھوٹا بیٹا

ان دنوں وزیر آباد اور اردگرد کے شہروں میں ''تربیتی کلاسز'' اور ''تبلیغی اجلاسات'' ہوتے رہتے تھے۔ان میں صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کی شمولیت بہت پُرکشش ہوتی تھی اوران کی تقاریر بہت مقبول اور مشہور

میاں مبشر احمد جو مئی 2010ء میں دارالذکر۔ لاہور میں شہید ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹہ — امیر جماعت میاں غلام احمد — قائد مجلس ماسٹر عنایت اللہ — میاں اکبر علی

باب سوم

نائیجیریا میں میرے پہلے سات سال

(بھائی کے نام ایک طویل خط)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ سے الوداعی ملاقات کے بعد 13 ستمبر 1971ء کو میں بیوی بچوں سمیت لاہور سے نائیجیریا کے لئے پرواز کر گیا۔ میری والدہ اور بہن بھائی یہی سمجھتے تھے کہ میں تین سال کے لئے جا رہا ہوں۔ اپنے اصل پروگرام کے بارے میں مَیں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ تین سال بعد جب چھٹی پر واپس آؤں گا تو کھل کر بات کرلوں گا۔

ادھر نائیجیریا آ کر میں مشکلات میں پھنس گیا اور پروگرام کے مطابق چھٹی پر پاکستان نہ جاسکا۔ اُدھر میری ضعیف والدہ اور بہن بھائی میری واپسی کے منتظر رہے۔ بھائیوں سے خط و کتابت کرتے وقت میں واپسی کے پہلو کو ٹال جاتا یا خاموش رہتا۔

بالآخر سات سال بعد جب 1978ء میں میرا چھٹی پر جانے کا پروگرام بنا تو روانگی سے تقریباً دو ماہ قبل میں نے اپنے بڑے بھائی عبدالرحیم بھٹہ صاحب (حال امیر ضلع وہاڑی) کو ایک طویل خط لکھ کر اُن مشکل حالات و واقعات سے آگاہ کیا جو نائیجیریا آ کر مجھے درپیش آئے اور جو میری واپسی میں مانع رہے۔ اس خط میں اُس تائید و نصرت الٰہی کا بھی ذکر کیا جو خلیفۂ وقت کی دعاؤں کے طفیل میرے شاملِ حال ہوئی اور جس سے میری مشکلات آسان ہوئیں۔

اُس خط کی مدہم سی کاربن کاپی میرے پاس محفوظ رہی۔ اُس خط کو بعض وضاحتوں کے ساتھ اب تیس سال بعد پھر قلمبند کر رہا ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

از نائیجیریا

27 مئی 1978ء

بھائی جان۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

............(صفحہ ۳ سے آگے) یہ باتیں تو میں نے یونہی آپ کی معلومات کے لئے لکھ دی ہیں۔ ان کا میرے پاکستان نہ آنے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سرکاری نہیں خدائی ملازمت میں ہوں جہاں عام شرائطِ ملازمت عائد نہیں ہوتیں۔ پس ایک ہی سکیل ہے جو اس ملازمت میں شرط ہے۔ اور وہ ہے اس کی رضا کا حصول، باقی باتیں تو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں............ سال پر سال گزرتے گئے اور میں حسب وعدہ پاکستان نہیں آیا۔ آپ کی پریشانی مجھ تک پہنچتی رہی لیکن اس بارہ میں کوئی رائے قائم کرنے

سے پہلے میری چھوٹی سی بات سن لیں۔ البتہ

''کہانی مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی''

آج سے سات سال پہلے جب میں پاکستان میں یہاں آنے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے علم تھا کہ ابھی میری رجسٹریشن ''نائیجیریا میڈیکل کونسل'' میں نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے کونسل کی شرائط کے مطابق تیاری کر رکھی تھی اور یقین تھا کہ کوئی مشکل نہ ہو گی۔ ڈگری کے ساتھ وہ ''تجربہ'' کے سرٹیفکیٹ بھی مانگتے تھے اور وہ میں نے یہاں D.M.O سے حاصل کر لئے تھے۔ یہ بات بھی میرے علم میں آئی تھی کہ ہمارے ڈاکٹرز کو نائیجیریا میڈیکل کونسل سے رجسٹریشن حاصل کرنے میں کچھ دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن ''دشواری'' کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ سیکرٹری صاحب نصرت جہاں کے ساتھ حضور سے ملاقات کے دوران حضور نے سیکرٹری صاحب سے کہا تھا۔

''ہم کب تک ڈاکٹروں کو نائیجیریا سے آگے دوسرے ملکوں میں بھیجتے رہیں گے وہاں ہم نے سکول کھول دیئے ہیں۔ خرچ ہو رہا ہے اور آمد اتنی نہیں۔''

پھر حضور نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تم وہاں جاؤ اور اپنی رجسٹریشن کے لئے Fight کرو۔''

اس ''Fight'' کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ مجھے تسلی تھی کہ میری تیاری مکمل ہے اور ادھر امیر صاحب نائیجیریا کی طرف سے آمدہ اطلاعات سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں اجی بواوڈے شہر میں ایک دومنزلہ عمارت جو پہلے نیشنل بنک کی عمارت رہ چکی ہے۔ مقامی جماعت نے ریزرو کر رکھی ہے۔ ''نیشنل بنک'' کے حوالے سے اس عمارت کے معقول ہونے میں شک نہ ہوسکتا تھا۔ پس پاکستان سے روانگی سے پہلے میں مطمئن تھا کہ جاتے ہی رجسٹریشن کرا کر میں کام شروع کر دوں گا۔ لیکن یہاں آ کر میں پریشانیوں میں گھر گیا۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پریشان کُن فون کال

دراصل میری پریشانیوں کا آغاز تو لاہور ایئرپورٹ سے ہی ہو گیا تھا۔ 13 ستمبر 1971ء کو جب ہم انتظار گاہ میں جمع تھے تو آپ کو یاد ہوگا کہ انکوائری پر ایک ٹیلیفون سننے کے لئے میرے لئے اعلان ہو رہا تھا۔ وہ ''کال'' بہت پریشان کُن تھی۔ کراچی سے جماعت کے کوئی عہدہ دار بتا رہے تھے کہ نائیجیریا سے تار آیا ہے کہ میری رجسٹریشن بطور ڈاکٹر نہ ہو سکے گی۔ میں نے جواباً کہا تھا کہ ''یہ بات حضور کو بتائی جائے۔ حضور کو علم ہے کہ میری رجسٹریشن ابھی تک نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود حضور نے مجھے کہا ہے کہ میں جاؤں اور جا کر رجسٹریشن کی کوشش (Fight) کروں۔ اب میں اپنی مرضی سے یہ سفر ملتوی نہیں کرسکتا۔'' اُن صاحب نے کہا کہ ''ہم نے آپ کو اطلاع دے دی ہے۔ آگے آپ کی مرضی'' اور فون بند ہو گیا۔

ایسے سفر میں حواس تو پہلے ہی کچھ ''باختہ'' سے ہوتے ہیں۔ اوپر سے اگر کوئی پریشان کُن خبر مل جائے تو ہوش قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میری طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بچوں سمیت غیر ملک میں ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہونے والے کی نازک حالت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ اس پر اس ''فون کال'' نے کیا ستم نہ ڈھایا ہوگا۔ آپ لوگوں کو تو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ کسی دوست کا فون تھا۔ لیکن میاں غلام احمد صاحب اور ماسٹر عنایت اللہ صاحب کو جو وزیر آباد سے الوداع کہنے آئے تھے، میں نے الگ لے جا کر پوری بات بتا دی تھی۔ اور اُنہوں نے میرے فیصلہ کی تائید کی تھی۔

میرا یہ سفر بہت پریشانی میں گزرا۔ مجھے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ دوران سفر مجھ سے کوئی غلطی نہ سرزد ہو جائے۔ کراچی پہنچ کر بار بار میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا کہ ''ابھی بھی وقت ہے۔ ٹکٹ کٹاؤ اور واپس چلے جاؤ ٹرین سے۔'' بیروت میں رات ٹھہر کر صبح لیگوس کی فلائٹ لینی تھی۔ لیکن مجھے ''چیک ان'' کے لئے لیگوس کا کاؤنٹر ہی نہ مل رہا تھا۔ بہت تلاش کیا نہ ملا۔ میرے سامنے ہی ایک لائن لگی تھی۔ اس کو پھر ذرا غور سے دیکھا تو اوپر لکھا تھا ''لاغُوص''۔ بہت غصہ آیا کہ بیروت جیسے انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر ساتھ اگر انگریزی میں بھی "Lagos" لکھ دیتے تو کیا حرج تھا۔ مسافروں کی عربی کا امتحان لینے کا یہ انداز تو بالکل ٹھیک نہیں لگا تھا۔

رجسٹریشن میں مشکلات

بیروت سے اُڑے تو ''لاغُوص'' اترے۔ امیر صاحب مکرم فضل الٰہی انوری صاحب موجود تھے۔ میرے ساتھ ایک اور ڈاکٹر صاحب بھی مع فیملی وقف کر کے آئے تھے۔ امیر صاحب کے ساتھ مشن ہاؤس پہنچے۔ یہ لیگوس کے ایک بہت گنجان آباد علاقے میں تین منزلہ عمارت ہے۔ اس کی تیسری منزل کو لکڑی کی دیواروں سے کاٹ کر کمروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اُن دنوں اکثر کمرے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انہی میں سے ایک کمرہ مہمانوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ دوسری فیملی کو اس میں ٹھہرا دیا گیا جبکہ ہم دوسری منزل پر امیر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے۔ اڑھائی فٹ چوڑے، چار گدے امیر صاحب نے فوری طور پر خرید ے اور ہم اُن کو Sitting Room میں ڈال کر سو جاتے۔ دوسرے ہی دن امیر صاحب ہم دونوں ڈاکٹرز کو لے کر میڈیکل کونسل گئے۔ ہم نے رجسٹریشن کے متعلق بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہم پھر دو تین بار گئے۔ بحث کی۔ لیکن وہ نہ مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں لیگوس میں ہم House Job کریں۔ دوسری کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ ہمارے تجربہ کے سرٹیفکیٹ کافی نہ سمجھے گئے۔ ہفتہ دس دن کے بعد دوسرے ڈاکٹر صاحب کو تو آگے ایک اور افریقہ کے ملک بھیج دیا گیا لیکن میں کچھ اڑ گیا اور پھر اڑا ہی رہا۔ کونسل کا خیال ہوگا کہ یہ بھی دو چار مزید چکر لگا کر چلا جائے گا۔

اُوپر مہمان خانہ خالی ہوا تو ہم اس میں شفٹ ہو گئے۔ اس 10'x12' کمرے میں دو اڑھائی فٹ چوڑے بیڈز تھے۔ ہم اوپر نیچے گدے ڈال کر سو رہتے۔ کھانے کے لئے ہم امیر صاحب کے ہاں جاتے تھے۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ مجھے میرا

الاؤنس ملا تو امیر صاحب نے مشورہ دیا کہ اوپر باتھ روم کے ساتھ ایک کچن بھی ہے چھوٹا سا۔ اس میں کچھ پرانا سامان پڑا ہے۔ اس کی صفائی وغیرہ کروا کر آپ استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بازار سے ضروری سامان خریدا اور اس کو استعمال کرنے لگے۔ اب وہ کمرہ ہمارا مکمل گھر تھا۔ فرش لکڑی کا تھا۔ بچوں سے پانی گر جاتا تو نیچے امیر صاحب کے کمرے میں ٹپک پڑتا۔ جس سے ہمیں گھبراہٹ، شرمندگی ہوتی، بچے اچھل کود، پکڑ دھکڑ کرتے تو شور ہوتا۔ جس سے دفتر کا سٹاف پریشان ہوتا۔ نیچے امیر صاحب بھی ڈسٹرب ہوتے ہوں گے۔

نصرت (میری اہلیہ) اس صورتحال سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ اجی بواوڈے (Ijebu-ode) کے بنک کی دومنزلہ عمارت کا ذکر اس نے پاکستان میں ہی سن پڑھ لیا تھا۔ اب وہ حیران تھی کہ اس کا ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ پوچھتی کہ کہاں ہے اب وہ عمارت۔ نکلتے کیوں نہیں اب اس قید سے۔ میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ کیا بتاتا کہ میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ رجسٹریشن کے مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔

ڈیڈلاک

وہ ایام بہت ہی پریشان کُن تھے۔ میڈیکل کونسل کے چکر لگا لگا کر ہم تھک گئے تھے۔ میرے ''تجربہ'' کے ثبوت وہ قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ اور میں یہاں لیگوس میں ہاؤس جاب کرنے پر تیار نہ تھا۔ ایک ''ڈیڈلاک'' پیدا ہو گیا تھا۔ بقول اُن کے وہ قانون کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اس بارے میں کوئی نرمی ممکن ہی نہ تھی۔ ادھر میں نے بہت سے ڈاکٹروں، وکیلوں اور دوستوں سے مشورے کئے۔ سفارشیں کروائیں۔

صبح نکلتا شام کو گھر آتا۔ اہلیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اب وہ پریشان اور غصّہ میں رہنے لگی تھی۔ بار بار وہ پوچھتی کہ وجہ کیا ہے۔ نکلتے کیوں نہیں یہاں سے۔ میرے پاس اب ''بہانے'' ختم ہو رہے تھے۔ میں اس کے غصہ کی تاب نہ لاتے ہوئے اکثر وقت امیر صاحب کے دفتر میں گزارنے لگا تھا۔ حضور کو دعاؤں کے لئے خط لکھا کرتا۔ احمدیہ مسجد قریب ہی تھی۔ وہاں چلا جاتا اور حالِ دل کہتا۔

ایک دن امیر صاحب نے مشورہ دیا کہ ''فیڈرل کمشنر آف ہیلتھ'' سے ملنا چاہئے۔ چنانچہ وفد کی صورت میں اس سے ملے۔ اس نے ہمیں ہر طرح کے تعاون کی پیشکش کی لیکن قانون کے آگے اس نے بھی معذرت کی۔ کوئی صورت نہ تھی اب اس مشکل سے نجات کی۔ دعاؤں کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

قانونی نکتہ

''جسٹس بکرے (Bakaray)'' نصرت جہاں بورڈ کے صدر تھے۔ وہ کبھی کبھی ملتے۔ مختلف پہلوؤں پر بات ہوتی۔ ایک دن وہ آئے اور مجھے انہوں نے قانون کی موٹی سی کتاب دی اور کہا کہ اس میں میڈیکل کونسل کی رجسٹریشن والا قانون بھی

ہے۔اس کو پڑھ لو۔ یہ قانون الگ میڈیکل کونسل میں چھپا ہوا موجود تھا اور میرے پاس بھی تھا اور میں کئی دفعہ پڑھ بھی چکا تھا۔ تاہم میں نے وہ موٹی کتاب لے لی اور رات کو دیکھنے لگا۔اچانک میری نظر ایک نکتہ پر ٹھہر گئی۔ مجھے اس میں روشنی کی کرن نظر آئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ میری خوش فہمی ہے۔ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر میں نے امیر صاحب سے بات کی اور کہا کہ میں جسٹس بکرے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔انہوں نے فون ملا دیا۔ میں نے بات کی تو اُن کو بھی میری دلیل میں وزن محسوس ہوا۔ اور انہوں نے اُسی وقت ایک چوٹی کے مسلمان وکیل مسٹر حسینی سے رابطہ کروادیا۔امیر صاحب اور میں وکیل سے ملے تو اس کو بھی میری بات میں وزن معلوم ہوا۔اس نے کہا کہ ''کل صبح آٹھ بجے آجائیں۔کونسل چل کر بات کریں گے۔''

دوسرے روز ہم میڈیکل کونسل پہنچے اور خاموشی سے انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ پہلے کچھ تاک جھانک ہوئی۔ کھُسر پھُسر ہوئی۔ پھر رجسٹرار خود آیا اور وکیل صاحب کو بڑے تپاک سے دفتر میں لے گیا۔ہم بھی اندر چلے گئے۔ بڑی سی میز کے گرد بیٹھتے ہی رجسٹرار نے کہا کہ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ اس ڈاکٹر نے آپ جیسے وکیل کو ناحق تکلیف دی۔خواہ مخواہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ہم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔قانون واضح ہے............''

وکیل صاحب نے کہا کہ ''میں تو صرف ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانے آیا ہوں جو اس ڈاکٹر نے اُٹھایا ہے۔''اس پر دونوں طرف کتابیں کھُل گئیں۔ میں نے بھی اپنی کتاب کھول لی۔وکیل نے بات کی۔رجسٹرار نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تو وکیل نے سیاق سباق سے وضاحت کو رد ّکر دیا۔رجسٹرار نے تسلیم کیا کہ ''کچھ سُقم رہ گیا ہے اس کو ٹھیک کرلیا جائے گا''اور پھر کہا کہ ''ہم تو اکثر ڈاکٹرز (غیر ملکی) کو یہاں ہاؤس جاب پر مجبور کرتے رہے ہیں یا واپس جانے پر۔'' پھر رجسٹرار نے امیر صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ اگر آپ عدالت میں جائیں تو ممکن ہے جیت جائیں لیکن یہ آپ کے مشن کے لئے ٹھیک نہ ہوگا............

ہم باہر آئے تو وکیل نے کہا کہ اب آپ سوچ لیں۔اگر چاہیں تو عدالت میں جاسکتے ہیں۔میں نے حضور کی خدمت میں سارے حالات لکھ کر مشورہ کی درخواست کی۔جلد ہی حضور کی طرف سے ہدایت آ گئی۔فرمایا تھا کہ

''نہیں،لڑائی نہیں کرنی،ہم خدمت کے لئے گئے ہیں۔دعا کررہا ہوں۔آپ کوشش جاری رکھیں۔''

مجھے حضور نے ہدایت دی تھی کہ ''جاؤ۔وہاں جاکر Fight کرو''اور اب فرمایا کہ ''لڑائی نہیں کرنی''۔ مجھے یہی سمجھ آئی کہ حضور کا منشاء کچھ ایسا ہے کہ ؎ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اب دعا کا ہتھیار استعمال ہوگا اور پھر حضور کی دعاؤں نے اپنا کرشمہ دکھا دیا۔

چند روز بعد میں میڈیکل کونسل گیا تو ان کا روّیہ بدل چکا تھا۔رجسٹرار اچھی طرح پیش آیا۔اب میرے تجربہ کے سرٹیفکیٹ قابلِ قبول نظر آنے لگے تھے۔میرا وار کارگر ہو چکا تھا بغیر لڑائی کے۔رجسٹرار نے ایک سرٹیفکیٹ میں چند الفاظ کے اضافے کو کہا تھا۔جو میں نے پاکستان میں لکھ کر دوبارہ بنوالیا۔میں رجسٹرڈ ہوگیا تھا۔ناممکن ممکن ہوگیا تھا۔حضور کو تار کے ذریعہ اطلاع دی گئی۔

فالحمد للّٰہ ۔ جب حضور نے مجھے فرمایا کہ جاؤ۔ جا کر فائٹ کرو۔ تو میں معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھ نہ سکا تھا۔ حضور بہت فکر مند تھے کہ نائیجیریا میں آمد کم اور خرچ زیادہ ہے اور میڈیکل کونسل ڈاکٹروں کو ٹکنے نہ دیتی تھی۔ جس غیر معمولی انداز سے یہ مسئلہ حل ہوا اس سے ظاہر ہے کہ حضور کی خصوصی دعاؤں سے یہ رکاوٹ دور ہوئی۔

دومنزلہ کچی عمارت

رجسٹریشن کی رکاوٹ دور ہوئی تو ہم فوری طور پر کلینک کے آغاز کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''ڈاکٹر صلاحُو'' ایک مخلص احمدی اور بڑے پاپولر ڈاکٹر تھے۔ میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے تھے۔ امیر صاحب نے اُن کو ساتھ لیا اور مجھے لے کر ''اجی ابواوڈے'' گئے اور وہاں صدر جماعت سے کہا کہ ہمیں وہ عمارت دکھائیں جو اُنہوں نے کلینک کے لئے ریزرو کر رکھی ہے۔ دیکھا تو وہ ایک پرانی، متروکہ اور کچی عمارت تھی (Mud House) ۔

صدر جماعت نے کہا کہ ''نیچے کلینک اور اوپر رہائش ہو جائے گی۔ کچھ دنوں میں ضروری مرمت کر لیں گے۔'' اور پھر پچھواڑے کی طرف صحن میں ایک چھوٹی سی چاردیواری (غسل خانہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''وہاں ایک نلکا ہے۔ پانی کے استعمال کے لئے آپ کو وہاں جانا ہوگا۔ عمارت کچی ہے۔ اوپر پانی استعمال نہیں ہوسکتا۔ عمارت کے بیٹھ جانے کا خطرہ ہے۔''

میں نے دیکھا تو گھوم گیا۔ ہمت کی سنبھل گیا۔ قریب تھا کہ کچھ کہتا لیکن سوچا واقف زندگی ہوں۔ زبان نہ کھولنا ہی زیب دیتا ہے۔ جو ''رشتہ'' جماعت نے تجویز کیا ہے۔ اچھی بیٹیوں کی طرح اس کو قبول کرنا ہی سعادت مندی ہے۔ میں خاموش رہا اور اسی عمارت کی سرکاری منظوری کے لئے ہم وہاں سے سیدھے شہر کے ہیلتھ افسر کے ہاں چلے گئے۔ ہیلتھ افسر پیش تو اچھی طرح آیا لیکن کلینک کی اجازت میں لیت ولعل کرنے لگا۔ اس نے مختلف قسم کے اعتراضات اٹھائے۔ لیکن جب ہم نے زیادہ ہی زور دیا تو بالآخر وہ رضامند تو ہوگیا لیکن کہا:

''اچھا میں یہ تو منظوری دے دیتا ہوں کہ آپ کا مشن یہاں کلینک کھول لے لیکن میں وہ عمارت استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جو آپ تجویز کر رہے ہیں۔ وہاں کسی زمانے میں نیشنل بنک ہوتا تھا۔ اُس کا مینجر میرا دوست تھا اور میں وہاں جایا کرتا تھا اور وہ بہت بوسیدہ ہے اور کوئی شخص زندگی کا بیمہ کرائے بغیر اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ وہ پبلک استعمال کے قابل نہیں۔ جائیں اور کوئی بہتر عمارت تلاش کریں۔''

اس کے الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ جیسے وہ میرے دل کی بات جان گیا ہو۔ میری جان میں جان آئی۔ اور پھر ہم دوبارہ کسی مناسب مکان کی تلاش میں گھومنے لگے جو نہ ملا۔ اگر کوئی اچھا مکان ملتا تو وہ مشن کی بساط سے بڑھ کر ہوتا۔ مشن کی مالی حالت ان دنوں خاصی کمزور تھی۔ (پانچ سو پاؤنڈز جو کلینک کے آغاز کے لئے مجھے دیئے گئے تھے وہ بھی لندن سے منگوائے گئے تھے۔) مناسب مکان کی تلاش کے لئے چند دن تک تو بعض دوست مجھے اپنی کار میں لئے گھومتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ

دوستوں کی دلچسپی کم ہوگئی۔ میں کہاں تک اکیلا تلاش کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پھر میں امتحان میں پڑ گیا تھا۔

اکارے(Ikare) جانے پر غور

مشن ہاؤس کے اُس کمرے میں رہتے ہوئے پونے چار ماہ ہونے کو آئے تھے۔ بیوی بچے تو پہلے ہی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ اب میں بھی پریشان سے پریشان تر ہوتا گیا۔ نصرت کے اُس دَور کے خطوط سے اُس کی پریشانی اور بے چینی آپ تک پہنچتی رہی تھی۔ اصل حالات سے وہ ''اُس وقت'' تک بے خبر تھی۔ ''اس وقت'' تک کیا، اب تک بے خبر ہے۔ بچوں کو تو میں دوچار سوگز کے دائرہ میں سیر کرالاتا تھا۔ لیکن نصرت تو بالکل مقیّد ہو کر رہ گئی تھی۔ مکرم امیر صاحب کی فیملی اس کے لئے ایک اہم سہارا تھی۔ وہ نیچے جا کر کچھ وقت گزار آتی۔ مکرم وزیری عبدُ وجو امسال جلسہ سالانہ ربوہ پر نائیجیریا کے وفد کے قائد تھے اکثر ملتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی مرسڈیز میں ہمیں سمندر کی سیر کرائی تھی۔ مکرم امیر صاحب نے دو تین دفعہ مشورہ دیا کہ اگر ''اجی بواوڈے'' میں مکان نہیں ملتا تو ایک اور شہر ''اکارے (Ikare)'' چلے جائیں۔ وہاں کی جماعت ڈاکٹر کا مطالبہ کرتی ہے اور ان کے پاس جگہ بھی ہے۔ لیکن میں اس بات پر قائم تھا کہ حضور نے مجھے ''اجی بُواوڈے'' کے لئے بھیجا ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔ لیکن جب دیکھا کہ دیر ہو رہی ہے۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر مجھے کام شروع کرنا چاہئے۔ تو میں نے امیر صاحب کی بات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

دسمبر 1971ء میں نائیجیریا کا جلسہ سالانہ منعقد ہوا۔ دُور دُور سے احمدی احباب آئے۔ انہی میں اکارے کے دوست بھی تھے۔ میں اُن سے ملا اور اُن سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں آ جاؤ۔ مکان وغیرہ ہے۔ میں نے تسلی کی کہ وہ تو پکی اینٹوں کا ہے۔ پانی، باتھ روم کا بھی پوچھا۔ یہ شہر اجی بواوڈے سے قدرے بڑا ہی ہوگا۔ احمدیہ مسجد بھی تھی۔ میں نے اکیلے جا کر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ امیر صاحب تو پہلے ہی کہہ چکے تھے چنانچہ اکارے کے ایک دوست کے ساتھ میں نے جانے کا پروگرام بنالیا تاکہ جائزہ لے سکوں۔ امیر صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر پسند آ جائے تو وہاں ٹھہر کر ضروری تیاری کر کے واپس آنا۔ تقریباً تین سو میل کا فاصلہ تھا۔

منہ میں 'انگارہ'

ایک شام پبلک وین (Van) میں ہم لیگوس سے پہلے اباداں پہنچے۔ وہاں سے ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد اکارے کی وین لینی تھی۔ میرا ساتھی تو کہیں ادھر اُدھر گھومنے چلا گیا۔ شاید کھانا کھانے گیا ہو۔ دوپہر کے گیارہ بجے ہوں گے۔ اباداں ویسٹ افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ گاڑیوں کا یہ اڈا بہت بڑا تھا۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں۔ میں بھی کسی چائے کی دوکان کی تلاش میں گھوما، لیکن نہ ملی۔ بعض سٹالوں پر لوگ چاول پر سُرخ شوربہ ڈالے کھاتے نظر آئے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ مرچیں بہت تیز کھاتے ہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں کوئی یوروپین تو ہوں نہیں۔ مرچیں تو ہم بھی کھاتے ہیں۔ ذرا تھوڑی تھوڑی لگا کر

کھالوں گا۔ میں ایک پلیٹ لے کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ چھوٹا سا لقمہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ یوں لگا جیسے سلگتا انگارہ منہ میں رکھ لیا ہو۔ تڑپ کر اٹھا۔ پانی کے بار بار گھونٹ لیے۔ پسینہ آ گیا۔ آنکھ ناک بہہ نکلی۔ میں گھبرایا کہ یہاں تو ''بقا'' کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ابھی تو ابتدا ہے آگے آگے کیا ہوگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعہ خالص افریقی ماحول میں اکیلا جا رہا تھا۔ کہاں ٹھہروں گا۔ کیا کھاؤں گا۔ میں کچھ فکرمند ہو گیا تھا۔

''کیلا'' خدا کی بڑی نعمت ہے۔ لاہور میں ٹی۔ آئی۔ کالج کے باہر ایک ریڑھی سے میں اکثر خریدا کرتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا اور یہاں یہ نعمت عام ہے۔ میں نے کچھ کیلے خریدے۔ کچھ کھائے اور ایک دو ایمرجنسی کے طور پر رکھ لئے۔

اکارے (Ikare) کا سفر

ابادان سے گاڑی اکارے کے لئے روانہ ہوئی۔ کچی پکی، اچھی بُری سڑکوں پر جنگلات میں بل کھاتی اور پہاڑوں سے پہلو بچاتی وہ تیزی سے آگے بڑھتی رہی۔ ندی نالوں کو عمر رسیدہ لکڑی کے کانپتے، کراہتے پلوں کے ذریعہ عبور کرتی تو دل دہل جاتا۔ بعض پُل تو اتنے ضعیف اور ناتواں تھے کہ دُور سے ہی زبانِ حال سے پکار اٹھتے کہ بھری گاڑی اُن کے بس کا روگ نہیں۔ لہٰذا مسافر اور گاڑی دونوں ہی ان کو پیدل عبور کرتے۔ دوسرے مسافر تو بڑی بے پرواہی اور بے رحمی سے پار کر گئے لیکن میں نے تو اُن کی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی نرمی اور خدا خوفی سے پار کیا۔ پُل کیا تھے پل صراط تھے۔ لمبائی میں کم لیکن گہرائی میں خوفناک (بھائی گھبرائیں نہیں اللہ مالک ہے)

راستے میں بعض بہت اچھے اور بڑے شہروں میں سے بھی گزرے۔ شام کے وقت ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑے سے درخت کے نیچے گاڑی رُکی۔ مسافر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے ٹہلنے لگا۔ قریب ہی ایک کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک سؤر کا بچہ تلاشِ معاش میں گھوم رہا تھا۔ خیر وہ ایسا ''بچہ'' بھی نہ تھا۔ آپ اس کو ''لڑکا'' کہہ سکتے ہیں۔ اتنا قریب سے میں نے اس جانور کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ مجھے تو وہ کچھ بے ضرر سا لگا تھا۔ اور اس کی غربت پر کچھ ترس بھی آیا تھا۔ بھائی! اس میں بُرا منانے والی کونسی بات ہے۔ حرام اس کا گوشت کھانا ہے، اس پر ترس کھانا تو نہیں۔ مڑ کر دیکھا تو گاڑی میں مسافر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے مجھ سے کہا۔ Oyinbo, you never saw pig before میں کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ (Oyinbo سفید آدمی) افریقہ میں ہم ایشین بھی ''سفید فام'' ہی شمار ہوتے ہیں۔

مغرب سے کچھ پہلے گاڑی اکارے پہنچ گئی۔ ایک مٹیالے سے رنگ کی پرانی سادہ سی دو منزلہ عمارت کے سامنے رُکی۔ سامنے ٹین کی چھتوں والا برآمدہ تھا جس میں بنچ پر بچے بیٹھے تھے اور چھوٹی سی پگڑی سر پر لپیٹے اور ہاتھ میں چھڑی لئے ایک شخص ان کو سبق یاد کروا رہا تھا۔ میں ابھی گاڑی سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے ایک ڈبہ نما Van آتی دکھائی دی۔ وین آئی اور آکر ہماری گاڑی کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ میرے گائیڈ نے مجھے جلدی سے بتایا کہ یہ صدر جماعت

الحاجی اجی جولا (عزیز اللہ) کا بیٹا ''ادریس اجی جولا'' ہے۔ پیشہ میں وکیل ہے۔ وکیل صاحب ملے اور کہا ''اچھا تم ہو وہ ڈاکٹر جس کے متعلق سنا تھا کہ آ رہا ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر بولے۔'' یہاں تم کہاں ٹھہرو گے۔ آ ؤ میرے ساتھ۔''

اکارے میں قیام

میں ٹیکسی سے نکلا اور اس کی وین میں بیٹھ گیا۔ شہر کے باہر سڑک کے کنارے چند نئی عمارتیں تھیں۔ انہی میں سے ایک دو منزلہ کوٹھی وکیل صاحب کی تھی۔ اوپر مہمانوں کے لئے الگ یونٹ تھا۔ اچھا ماڈرن تھا سب کچھ۔ موصوف انگلینڈ سے قانون کی ڈگری کے ساتھ ایک انگریز خاتون بھی بیاہ لائے تھے۔ اچھی سلجھی ہوئی مسلمان خاتون تھیں۔ صبح خالص انگلش ناشتہ ملتا اور کھانا بھی ملاجلا خوب تھا۔ افریقن ڈش بھی اگر یورپین ہاتھ سے بنے تو وہ ایشین سی بن جاتی ہے۔ اسی طرح اُن کے بچے بھی میرے بچوں کے ہم عمر ہی نہیں ''ہم رنگ وروپ'' بھی تھے۔

''بخار'' پر راضی

اگلی صبح میں وکیل صاحب کے ساتھ ان کے والد سے جو صدر جماعت تھے، اُسی مٹیالی سی بلڈنگ میں ملنے گیا۔ وہاں جماعت کے دوسرے احباب بھی جمع تھے۔ اس کے بعد میں وکیل صاحب کے ساتھ مناسب مکان کی تلاش میں دو چار دن گھومتا رہا۔ ایک دو پسند کر لئے۔ پھر جماعت کی الگ میٹنگ ہوئی۔ اس میں وکیل صاحب نے ہمارے پسند کردہ مکان کی منظوری لینی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی مشکل نہ ہوگی۔ لیکن فیصلہ یہ سنایا گیا کہ جس بلڈنگ میں ''صدر جماعت الحاجی اجی جولا'' رہتے ہیں اسی کا ایک حصہ جو الگ تھلگ تھا، وہ جماعت پیش کرتی ہے۔ اس میں ضروری ردّ وبدل میری خواہش کے مطابق ہو جائے گا لیکن رہنا وہیں ہوگا۔

مجھے اس فیصلہ سے مایوسی ہوئی۔ اگر یہ بات تھی تو تین چار دن تک ہمیں مکان تلاش کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ اجی بواوڈے میں وہ خستہ، بوسیدہ اور کچی عمارت دیکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب مجھے ہر دوسری عمارت غنیمت لگنے لگی تھی۔

بھائی جان! آپ سے ایک دفعہ سنا تھا کہ ''موت کو دیکھ کر انسان، بخار پر راضی ہو جاتا ہے۔'' رات بھر سوچتا رہا۔ اور پھر میں اس ''بخار'' پر راضی ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر میں نے جماعت کے مجوزّہ ''رشتہ'' پر ہاں کر دی تھی۔ بعد میں جب میں وہاں شفٹ ہو گیا تو مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ جماعت کا فیصلہ درست تھا۔ وہ کئی لحاظ سے میرے لئے بہتر ثابت ہوا۔ وہ بلڈنگ جماعت کا سنٹر تھا۔ دوست آتے جاتے رہتے۔ وہیں اجلاس ہوتے۔ گویا ''بخار'' جلد ہی اُتر گیا تھا۔

فضلِ الٰہی

وہ وکیل صاحب مجھے میرا پسندیدہ مکان تو نہ دلا سکے۔لیکن اکارے میں میرے قیام کے سلسلہ میں ایک اہم بنیادی کردار ادا کر گئے۔اُس روز اُن کا اچانک آنا اور ٹیکسی سے اُچک کر مجھے اپنے گھر لے جانا ایک بہت بڑا فضل الٰہی تھا۔لیکن یہ کتنا بڑا فضل الٰہی تھا اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب بعد میں مجھے صدر جماعت کے پڑوس میں اس بلڈنگ میں رہنا پڑا۔اس کے ہاں ایک رات بھی ٹھہرنا میرے لئے بہت بڑا ابتلاء ہوتا۔اور میں نہ تو وہاں چند روز ٹھہر سکتا اور نہ وہ فیصلہ کر سکتا جو میں نے کیا۔

ان کی انگریز اہلیہ بعد میں نصرت کی اچھی سہیلی ثابت ہوئی۔وہ اپنی ہی کمپنی کی ڈائریکٹر تھی اور دفتر آتے جاتے اپنے سسر صدر جماعت کو سلام کرنے ٹھہر جاتی۔ بزرگوں سے سلام و دعا اور اُن کا خاص ادب آداب یوربا قبائل کی ایک بڑی اچھی خصوصیت ہے۔اگر وقت ہوتا تو وہ اُوپر نصرت سے بھی ملتی۔شام کو تو چائے پیتی اور آپس میں یہ کچھ 'دُکھ سُکھ' بھی 'پھرول' لیتیں۔ وہ بتاتی کہ جب وہ یہاں آئی تھی تو کن حالات سے گزری تھی۔اس کے قصے ہمارے لئے حوصلہ افزا بھی تھے اور سبق آموز بھی۔ نصرت نے کچھ انگریزی بھی اس سے باتیں کر کے سیکھ لی تھی۔ایک دن وہ آئی اور نیچے سے ہی نصرت کو ہیلو گڈ مارننگ کہا اور پھر پوچھا۔"How are you?"

نصرت نے جواب دیا۔"I am all right but my head is not all right." وہ ہنسی اور کہا "Oh, no Mrs. Bhutta you don't say like that"

شہر "اکارے"

اس بلڈنگ کے الگ حصے میں تین کمرے اوپر تھے اور تین نیچے۔ نیچے میں نے فوری طور پر ایک قریبی ترکھان سے پارٹیشن کروائی۔اسی طرح بینچ، میز کرسیاں بنوائیں۔ کچھ بازار سے خریدیں۔اوپر رہائش کے لئے ایک کمرہ تو کچن بن گیا۔ چار لوہے کے بیڈز اور گدے خریدے۔کچھ ضروری ردّوبدل کروایا۔واپس لیگوس جانے سے پہلے میں نے مارکیٹ کا جائزہ لیا تو بہت مایوسی ہوئی۔ وہاں آٹا چاول، جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ نایاب تھے۔سبزیاں سوائے بھنڈی کے اور دالیں سوائے لوبیہ کے، نہ ملتی تھیں، چائے، مکھن، گھی اور دیگر مصالحہ جات یہ سب کچھ بڑے شہروں میں خاص سٹورز سے ملتے تھے اور یہ شہر لیگوس، ابادان اور بینن وہاں سے تین سو، دوسو اور ڈیڑھ سو میل دُور تھے۔اس لحاظ سے تو یہ علاقہ میرے لئے بنجر، بیابان سے کم نہ تھا۔ چھوٹا گوشت بھی نہ ملتا تھا۔(ایک دفعہ مقامی چاول پکانے کی کوشش کی تھی۔کھانا تو درکنار پکانا بھی ممکن نہ تھا۔ جونہی اُبال آیا۔سارے گھر میں سخت بُو پھیل گئی۔اُسی طرح اُبلتا برتن اٹھا کر فوری طور پر الحاجی کی بیٹی کو دے دیا۔ان کی تو عید ہو گئی تھی۔ایک دن محکمہ زراعت کا آدمی کلینک آیا تو اس بدبُو کی میں نے شکایت کی اور وجہ پوچھی۔اس نے بتایا کہ لوگ مونجی کو پانی میں گلنے سڑنے دیتے ہیں۔جس سے چاول میں بُو پڑ جاتی ہے۔اب ہم ان کو ماڈرن طریقے سکھا رہے ہیں۔) بایں ہمہ میں نے وہاں رہنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اپنی واپسی کا دن مقرر کیا اور بلا تکلّف کھانے کی ضروری ہدایات دے کر میں واپس لیگوس آ گیا اور امیر صاحب کو اپنے جائزہ اور

فیصلہ سے مطلع کیا۔

لیگوس کی "Fight" کے بعد اب میں اکارے کے محاذ پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جائزہ سے ظاہر تھا کہ وہاں سب سے نازک پہلو بچوں کا ہوگا۔ ایسی مہم جوئی میں زنانہ ساتھ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتا ہے۔

بھائی جان! مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ بچوں کو نہ لے جاؤ۔ تین سال لگا کر آ جانا۔ لیکن بات ''تین سال'' کی ہوتی تب ناں۔ میری نیت میں ''فتوز'' تو شروع سے ہی تھا۔ اور اب میں فکرمند تھا۔ یہاں مجھے حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔

جس ملاقات میں حضور نے مجھے ''رجسٹریشن کے لئے فائٹ'' کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اُسی ملاقات کے دوران حضور نے سیکرٹری صاحب ''مجلس نصرت جہاں'' سے کسی عہدہ دار کے بارے میں کچھ پوچھا۔ سیکرٹری صاحب نے بتایا کہ حضور ''اُن کو لکھا ہے۔ جواب نہیں آیا۔ پھر یاددہانی کا خط لکھوں گا۔'' اس پر حضور مسکرائے اور فرمایا ''جب ہم انگلینڈ میں پڑھتے تھے تو پروفیسر سے یہ فقرہ سنا تھا۔ "A man with wife is less than a man" اُس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔''

پھر سیکرٹری صاحب نے ایک ''لیڈی ٹیچر'' کا ذکر کیا اور کہا کہ ''حضور اُن کی درخواست آئی ہے۔'' انہوں نے وقف کیا ہے۔'' حضور نے شادی کا پوچھا تو بتایا کہ ''نہیں، حضور وہ شادی شدہ نہیں۔'' اس پر حضور نے فرمایا۔ ''میں اُس کو ایسے تو باہر نہیں بھجوا سکتا۔ کسی ٹیچر یا ڈاکٹر سے اس کی شادی کرواؤ۔'' پھر حضور نے میری طرف دیکھا اور کہا ''یا پھر اس کی دوسری شادی کرادو۔''

بھائی جان! میں تو کانپ ہی اٹھا تھا۔ شکر ہے کہ حضور نے حکم نہیں دیا۔ ورنہ میری کیا مجال تھی کہ میں کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ کرتا اور آج مجھ پر یہ بات صادق آتی کہ

"A man with two wives is no man at all"

اکارے میں قیام

اکارے روانگی کے دن سے پہلے میں نے جو رقم بھی میرے پاس تھی اس کا کھانے پکانے کا سامان از قسم آٹا، چاول، دالیں، سبزیاں، جام کی شیشیاں وغیرہ خرید لیں۔ دو اڑھائی ماہ کا راشن ہوگا۔ ایک وین (van) کرائے پر لی گئی۔ اس میں سامان لادا اور ایک اکارے کے دوست کے ساتھ روانگی کے لئے مقررہ دن ہمیں مکرم امیر صاحب نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

نقل مکانی اگر اجنبی علاقے کی طرف ہو تو پریشانی اور گھبراہٹ تو ہوتی ہے۔ پاکستان سے روانہ ہوتے ہوئے بھی گھبراہٹ اور پریشانی ہوئی تھی اور اندیشہ ہائے دُور دراز نے گھیرا تھا۔ لیکن وہ حالت نہ ہوئی تھی جو لیگوس سے اکارے روانہ ہوتے ہوئے ہوئی۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت ہمت جوان تھی، امیدیں روشن تھیں۔ مشن کی طرف سے ''انتظامات'' مکمل تھے۔ اپنی تیاری میں کمی نہ تھی اور یقین تھا کہ بس جاتے ہی رجسٹریشن کرا کر کام شروع کر دوں گا۔ لیکن یہاں آ کر تین چار ماہ تک جو ہچکولے کھائے۔ اُن سے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور یہ بات کھلی کہ راہِ خدا میں سفر کرنے والوں کو اس کی ذات کے سوا کسی کا سہارا نہیں اور نہ یہ سفر ابتلاؤں سے خالی ہوسکتا ہے۔ خواہ کتنے ہی انتظامات اور بندوبست کرلو۔ اگر اس کی رضا حاصل کرنی ہے تو آزمائش شرط ہے۔ اگر کامیابی لینی ہے تو ''امتحان'' دینا ہوگا۔ کوئی شارٹ کٹ نہیں۔

مجھے یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ میرا اصل سفر تو اب شروع ہو رہا ہے۔ لیگوس میں تو اپنا مشن تھا۔ امیر صاحب تھے، ہم وطن بھی تھے، ہر چیز دستیاب تھی، اور اس طرح زندگی تقریباً نارمل ہی تھی۔ لیکن بایں ہمہ غیر متوقع طور پر پریشانیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ اب تو میں بالکل ہی اجنبی ماحول میں جا رہا تھا جہاں کا ''باوا آدم'' حقیقتاً نرالا تھا۔ دُور دُور تک کوئی ہم زبان، ہم وطن نہ تھا، سوچتا تھا کہ اب اگر کوئی اونچ نیچ ہوئی تو کیا بنے گا۔

دوسری طرف مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ان لوگوں کے پاس جا رہا ہوں جن کے لئے میں بھی تو ویسا ہی اجنبی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ میری ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میرا اُن کے ساتھ ایک ایسا روحانی اور آفاقی رشتہ ہے جو سب علاقائی، لسانی اور رنگ و نسل کی حدود کو مٹا دیتا ہے۔ میں اُن سے مل کر زمین پر آسمانی بادشاہت کے قیام کی اُس مہم میں کچھ حصہ دار بننا چاہتا تھا۔ جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ

؎ ''قضائے آسماں است ایں بہر حالت شود پیدا''

ڈر تھا تو یہ کہ اب جب کہ ''لبِ بام'' دو چار ہاتھ رہ گیا ہے۔ میرے گناہوں، خطاؤں اور ابتلاؤں کا بوجھ کمند کو کہیں توڑ نہ ڈالے۔ میں انگلی کو لہو لگانے سے کہیں محروم نہ رہ جاؤں۔

گاڑی شہری حدود سے باہر نکل کر تیزی سے بھاگنے لگی تو میں اپنے ہی ہموم و غموم میں گم ہوگیا۔ آنکھوں پر رومال رکھے اور خوف و امید کے درمیان لٹکا، میں ساری راہ دعاؤں میں مصروف رہا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کشتی میں سوار ہوتے وقت کی اور حضرت موسیٰؑ کی دعا مدین میں داخل ہوتے وقت کی خاص طور پر لبوں پر جاری رہی۔ یہ دعائیں میں نے لیگوس کے قیام کے دوران ہی یاد کی تھیں کہ اس سے پہلے ان کی اہمیت اور افادیت کا عرفان نہ تھا۔ دعائیں کرتے کرتے میرا ذہن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی طرف چلا گیا اور پھر میں نے سوچا۔ جیسے میں ایک بہت چھوٹا سا ابراہیم ہوں۔ نصرت ایک بہت حقیر سی ہاجرہ ہے اور بچے بہت ننھے سے اسماعیل ہیں اور یہ گاڑی ایک بڑا سا گدھا ہے جس پر چند دن کا راشن لاد کر میں ایک ''غیر ذی زرع' علاقے میں بسنے جا رہا ہوں۔ بس ایسے ہی خوف و خیالات میں سفر کٹ گیا۔ اس دفعہ راستے میں نہ پہاڑ آئے نہ جنگلات، نہ ندی آئی نہ نالے۔ آئے ہوں گے، پل بھی، مگر مجھے تو یوں لگا جیسے ''ڈائرکٹ فلائٹ'' ہو کہ اکارے پہنچ گئے۔ دوست موجود تھے۔ کچھ لجنات بھی تھیں۔ کھانا ٹھیک تھا۔ نمازوں کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگے۔ بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف ہم پاکستان سے ساتھ لائے تھے۔ اس طرح سٹین لیس سٹیل کی پلیٹیں، گلاس، چمچے، چھری، کانٹے بھی لائے تھے۔ گویا میں ''کیل کانٹے'' سے لیس ہو کر ساحلِ افریقہ پر اترا تھا۔ بھائی جان! آپ میری تیاری پر شک نہیں کر سکتے۔ باقی ''لڑائی'' تو میری ابھی جا رہی ہے۔

ع۔ آغاز تو میں کر دوں، انجام خدا جانے''

کلینک کا آغاز

سال 1972ء کے آغاز کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے کلینک کا آغاز ہو گیا اور حضور کے ارشاد کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ حضور نے ہم ڈاکٹرز کو ہدایت فرمائی تھی کہ

''آپ کو پانچ سو پاؤنڈز ملیں گے۔ اسی میں آپ نے رہائش اور کلینک کا آغاز کرنا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ آپ Develop کر سکتے ہیں۔ وہاں Revolution کے طریق پر نہیں بلکہ Evolution کے طور پر کام کرنا ہے۔''

آہستہ آہستہ کلینک چل نکلی۔ ضروری اخراجات پورا ہونے کے علاوہ کچھ بچت بھی ہونے لگی تھی۔ بچوں کو سکول میں داخل کرا دیا۔ ہم کچھ سکون سے رہنے لگے۔ ڈیڑھ دو ماہ تک وہ راشن چلا اور پھر وہ ختم ہونے لگا۔ آٹے کا دوسرا بیگ کھولا تو اس میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ شاید دو اڑھائی ماہ کا راشن لانا توکّل کے خلاف تھا۔ اب مقامی غذا کو بھی استعمال میں لانے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ میں نے جماعت کے دوستوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک دوست ہر ماہ ٹرک لے کر لیگوس اپنا کاروباری سامان خریدنے جاتے ہیں۔ وہاں وہ احمدیہ مسجد میں ٹھہرتے ہیں اور مشن ہاؤس بھی جاتے ہیں۔ میں نے امیر صاحب کے نام خط لکھ کر ایک لسٹ ان کے ہاتھ بھجوا دی۔ امیر صاحب نے سامان خرید کر اُن کو دے دیا۔ اس طرح ہر ماہ ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے سپلائی لائن کھول دی تھی۔ مرغی انڈا تو وہاں ملتا ہی تھا۔ چھوٹا گوشت بھی ایک قریبی گاؤں سے خرید لاتے تھے۔

پانی کا مسئلہ وہاں بہت ٹیڑھا تھا۔ جب میں وکیل صاحب کے ہاں ٹھہرا تھا اور پھر اب آ کر دو تین ہفتہ تک تو پانی نکلے

میں بہت خوب آتا تھا لیکن پھر ایک دن نہ آیا۔ دوسرے دن میں نے صدر جماعت سے بات کی تو اُس نے بتایا کہ یہ تو اکثر اسی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ تمہیں سٹور کر لینا چاہئیے تھا۔ مجھے تو کسی نے بتایا نہ تھا۔ دو تین دن بعد آیا۔ تو میں نے بازار سے ٹب، بالٹیاں، جیریکین خرید کر سٹور کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی بعض اوقات پانی لمبا غائب ہو جاتا تو قریبی گاؤں سے لانا پڑتا۔ صدر جماعت الحاجی اجی جولا (عزیز اللہ) کے تو بچے بچیاں سروں پر بالٹیاں ٹکائے قریبی پہاڑیوں کے دامن میں چشموں سے لے آتیں تھیں۔ پہلی دفعہ اس نے مجھے بھی ایک بالٹی دی تھی۔ خاصا گدلا پانی تھا۔

بارش اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے لیکن اس رحمت کی قدر ہمیں یہاں آ کر ہی ہوئی۔ بارش برستی تو پہلی ایک دو بوچھاڑ سے ٹین کی چھتیں دھل جاتیں۔ پھر پانی اچھا صاف بہتا، ہم پلاسٹک کے وہ برتن لائن لگا کر رکھ دیتے اور پانی اکٹھا کرتے۔ رات کو برستی تو "ہڑ بڑا" کر اٹھتے اور پانی بھرنے لگتے۔ رک رک کر برستی تو ساری رات ہی یہ سلسلہ چلتا۔ ہم کیا سارا شہر ہی اس طرح پانی بھرتا جیسے سحری میں لوگ اٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح شہر میں رونق سی ہو جاتی۔ موسلا دھار بارش میں پانی بھرتے تو ساتھ ساتھ استعمال میں بھی لاتے جاتے۔ کپڑے دھوتے بچوں کو نہلاتے۔ استعمال شدہ پانی ٹائیلٹ فلش کرنے کے لئے دو بالٹیوں میں ریزرو بھی کر لیتے۔ خاص کر اس وقت جب پانی دوسرے گاؤں سے ایک دوست کی مدد سے اس کی گاڑی میں لانا پڑتا۔ یہ حال صرف "اکارے" کا ہی نہ تھا اور بہت سے شہروں میں بھی پانی کا یہی حال تھا اور اب اس "اجی بواوڈے" میں بھی پانی غائب ہوتا ہے لیکن یہاں دو ٹینک رکھوائے ہیں۔ البتہ جب وہ ختم ہو جائیں تو یہاں بھی پرابلم ہوتا ہے۔

دو چار ماہ ہمیں وہاں اکارے میں Adjust ہونے میں لگ گئے۔ پھر ہم کچھ اُداس سے رہنے لگے۔ اردگرد سو میل کے دائرے میں کوئی ہم وطن، ہم زبان نہ تھا۔ کوئی انڈین بھی نہ تھا۔ نصرت تو بالکل تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ وکیل صاحب کی انگریز بیوی گاہے گاہے آ جاتی تو زبان کے مسئلہ کے باوجود یہ گپ شپ کر لیتی۔ بھائی! ان عورتوں کی ایک اپنی زبان بھی ہوتی ہے جو یونیورسل ہے۔ یہ اس کے ذریعہ آپس میں سمجھ سمجھا لیتی ہیں۔ بس ایک اپنے میاں کی زبان ہی ان کو سمجھ نہیں آتی۔

چند ماہ بعد سرکاری ہسپتال میں ایک مسلمان مصری ڈاکٹر آ گیا۔ ڈاکٹر "البرائے (Alburaey)" نام تھا۔ اس کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ امیر صاحب سے مشورہ کے بعد میں نے ایک پرانی گاڑی خرید لی تھی۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں نے اُس مصری ڈاکٹر کو "مسلمان" لکھا ہے۔ ایک دفعہ اُس کے ہاں کوئی پارٹی تھی اردگرد شہروں میں بہت سے مصری ڈاکٹر اور انجینئر کام کرتے تھے۔ وہ سب آئے۔ اچھی رونق تھی۔ میں ان کو مسلمان سمجھ کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ مصری ڈاکٹر اٹھا اور ایک طرف جا کر اس نے انگلیوں سے کراس (+) کا نشان بنا کر مجھے اشارۃً سمجھایا کہ یہ سب عیسائی ہیں۔ مجھے بڑا عجیب لگا کہ مصر میں تعلیم یافتہ طبقہ اس کثرت سے عیسائی ہے حالانکہ مصر تو عیسائی طاقتوں کی کالونی نہیں رہا۔

تنہائی اور اجنبیت کے ساتھ اب ہمیں وطن کی یاد بھی بہت آنے لگی تھی۔ بس خاموشی سے بالکونی سے شہر کا نظارہ کرتے رہتے۔ ہم میاں بیوی آپس میں بات بھی کرتے تو کیا اور کہاں تک۔ بس گُم سُم سے رہنے لگے تھے۔ گو ہماری یہ خاموشی خاموش نہ تھی۔ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ رات کو جب یہ سب لوگ سو جاتے تو میں اکیلا وہاں کھڑا شہر اور آسمان کو دیکھتا۔ چاند ستاروں کے سوا ہر چیز مختلف اور اجنبی تھی۔ چاند کو دیکھ کر قدرے سکون سا ہوتا کہ یہ تو وہی ہے جو گھر میں دیکھا کرتا تھا۔ تاروں کی ''کھتی'' وہی ہے جس سے ''بی جی'' وقت کا اندازہ لگایا کرتی ہیں۔ سوچتا کہ میں کہاں سے کہاں آ گیا اور کن کن مراحل سے گزر کر آیا۔ وقت کا اندازہ کر کے سوچتا کہ اس وقت والدہ کیا کر رہی ہوں گی۔ بھائی کہاں ہوں گے۔ پھر یہ یادیں دعاؤں کی صورت دھار لیتیں۔ عشاء کی نماز مَیں عموماً کچھ ایسی ہی کیفیت کے بعد شروع کرتا۔

سال ڈیڑھ سال کلینک اچھی چلی، پھر کام نرم پڑ گیا۔ مریض کم ہوئے تو آمد بھی کم ہو گئی۔ تاہم اتنی ہوتی رہی کہ کلینک کے اخراجات پورے ہو جاتے۔ بچت کوئی خاص نہ ہوتی۔ جس ماہ اخراجات زیادہ ہوتے آمد بھی زیادہ ہو جاتی۔ ایک دفعہ گاڑی میں بڑی مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ کافی خرچ اٹھا۔ اُس ماہ آمد اُسی قدر زیادہ ہو گئی۔ آمد کو بڑھانے کے لئے میں اردگرد کے گاؤں میں بھی ایک دو دن کے لئے جانے لگا۔ چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں Yamoye نامی تھا۔ وہاں کی جماعت کے لوگ آئے اور کہا کہ ایک روز کے لئے میں وہاں آیا کروں۔ جماعت سے مشورہ کے بعد میں نے ایک دن مقرر کر دیا۔ وہ دوست روزانہ ہی یاددہانی کے لئے آ جاتے۔ میں نے کہا کہ کیوں بار بار آتے ہو۔ کیا اعتبار نہیں۔ وہ کہنے لگے بات یہ ہے کہ ہم نے گاؤں میں سب کو بتا دیا ہے کہ ایک ''مسلمان ڈاکٹر'' آیا کرے گا لیکن لوگوں کو یقین نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر وہ ڈاکٹر ہے تو مسلمان نہیں ہو سکتا اور اگر وہ مسلمان ہے تو ڈاکٹر نہیں ہو سکتا۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''باہر کی ساری دنیا جو تعلیم یافتہ ہے وہ عیسائی ہے۔ صرف تم جاہل لوگ ہی مسلمان رہ گئے ہو۔'' اب اگر تم نہیں آئے تو ہماری بہت سبکی ہو گی۔ میں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ اب تو میں ہر صورت وہاں آیا کروں گا۔ چنانچہ میں نے وہاں باقاعدہ جانا شروع کر دیا۔ میرا وہاں صرف جانا ہی تبلیغ کا ذریعہ تھا۔ وہ کیتھولک گاؤں تھا اور وہ کیتھولک یورپین نرسیں ہفتہ میں ایک بار وہاں علاج معالجہ کے لئے آیا کرتی تھیں۔

تبلیغ کا آغاز

میں کہہ رہا تھا کہ کام کم ہو گیا تو میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ جس مقصد سے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے وہ پورا ہو نہیں رہا۔ وقت ضائع ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ تم صرف ڈاکٹر ہی نہیں مشنری بھی ہو۔ فارغ وقت میں تبلیغ ہی کرو۔ چنانچہ میں نے بائیبل اور کتابیں نکالیں اور مطالعہ اور تبلیغ شروع کر دی۔

پاکستان سے روانگی سے قبل ایک ملاقات میں حضور نے نصیحت فرمائی تھی کہ ''وہاں سیاست میں حصہ نہیں لینا۔ نظام جماعت کی پابندی کرنی ہے۔'' میں نے پوچھ لیا۔ ''حضور تبلیغ کی اجازت ہو گی۔'' حضور نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور فرمایا ''تو

اور کس لئے بھیج رہے ہیں تمہیں وہاں۔''

اب سوچتا ہوں کہ یہ تنگی حالات حضور کے اسی ارشاد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے تھی شاید۔

اخبار میں جوابی مضمون

صدر جماعت کی یہ بلڈنگ جماعتی اور میڈیکل سنٹر تو تھی ہی۔ اب یہ تبلیغی سنٹر بھی بن گئی۔ بحث مباحثے ہونے لگے۔ میں چھوٹے موٹے مضامین لکھنے لگا۔ مقامی جماعت شہر اور دیہات میں تبلیغی جلسے کرتی تو مجھے بھی ساتھ لے جاتی۔ وہاں مجھے تقریر بھی کرنی پڑتی اور سوالوں کے جواب بھی دینے پڑتے۔ انفرادی طور پر ملاقات کر کے بھی تبلیغ کرتا۔ ایک مشہور ملکی اخبار کے سنڈے ایڈیشن "The Sunday Sketch" میں جماعت کے خلاف ایک بڑا سخت مضمون شائع ہوا۔ یہ اباداں یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات وعربی کے انچارج نے جو کسی وقت احمدی رہ چکا تھا، لکھا تھا۔ میں نے فوراً اس کا مفصل جواب تیار کر کے روانہ کر دیا اور ایڈیٹر سے درخواست کی کہ مکمل شائع کر دے تو بہتر ہوگا۔ اگلے ہی سنڈے میرا جواب شہ سرخیوں کے ساتھ دو بڑے صفحات پر پھیلا شائع ہو گیا۔ بعض اور دوستوں کے جواب بھی اور احمدیہ مشن نائیجیریا کا جواب بھی بعد میں شائع ہوا تھا۔ اسی پروفیسر نے بعد میں یہ ساری بحث "Islam vs Ahmadiyya in Nigeria" کے عنوان سے بیروت سے شائع کروائی۔ (see appendix)

اب امیر صاحب کو میری ان ''حرکات'' کا علم ہو گیا اور انہوں نے جلسہ سالانہ پر میری تقریر رکھنی شروع کر دی۔ "Warri" عیسائیت کا گڑھ ہے۔ وہاں شہر کے ''کنگ جارج میموریل ہال'' میں ایک بین المذاہب سیمینار منعقد ہوا۔ موضوع تھا۔ ''گناہ نجات اور نجات کا حصول۔'' پتہ نہیں امیر صاحب کو کیا سوجھی کہ اسلام کی نمائندگی کے لئے مجھے مقرر کر دیا۔ میں نے بہت معذرت کی اور سمجھایا کہ اپنے جلسہ کی تو بات اور ہے۔ یہاں تو اسلام کی عزت کا سوال ہے۔ میں ہر لحاظ سے کمزور ہوں اور ایسے پبلک لیکچر کا تجربہ بھی نہیں۔ اور پھر اس جنگل میں مضمون کی تیاری بھی بہت مشکل ہے۔ بہت معذرت کی لیکن امیر صاحب نے میری ایک نہ سنی اور گرتے پڑتے مجھے مضمون تیار کرنا پڑا اور دو سو میل کا سفر طے کر کے میں اکارے سے ''واری'' وقت پر پہنچ گیا۔ میری تقریر آخری تھی۔ بھرا ہوا ہال، چکا چوند روشنیاں اور مجھ سے پہلے مقررین کی پُر اعتماد تقریریں، یہ سب کچھ میرے لئے بہت زیادہ تھا۔ احساسِ کمتری غالب آنے لگا۔ نروس ہو گیا۔ میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ٹہل کر اپنے آپ کو قائم کیا۔ دعا کی اور جب میرا نام پکارا گیا تو میں باہر سے سیدھا سٹیج پر گیا۔ خدا کے فضل سے بڑے اعتماد سے تقریر کی۔ کسی مقرر پر تقریر کے بعد سوال نہیں کئے گئے تھے لیکن مجھ پر عیسائیوں نے سوال کئے۔ میں نے مدلّل جواب دیئے اور مسلمان حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

بعد میں میرا مضمون اخبار میں اور کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوا۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس سیمینار کے انعقاد میں مکرم برادرم شکیل احمد صاحب منیر نے، جو اُن دنوں واری میں پروفیسر تھے، بنیادی کردار ادا کیا تھا اور بعد میں جب وہ Warri سے Owerri چلے گئے تھے تو وہاں بھی انہوں نے ایسا ہی

سیمینار منعقد کروایا تھا اور اُس میں بھی مجھے اسلام کی نمائندگی کی سعادت ملی تھی۔

جون 1974ء کے ہنگامے

1974ء کا سال آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ کلینک کی حالت ویسے ہی مندی تھی۔ بس گزارہ ہو رہا تھا۔ آئندہ چند ماہ میں میرے تین سال پورے ہونے کو تھے۔ لہٰذا واپس پاکستان چھٹی پر جانے کا خیال بھی آنے لگا تھا۔ لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ احساسِ ندامت اور ناکامی غالب تھا۔ جماعت کی وہ خدمت کر نہ پایا تھا جس کی اُمید اور تمنا لے کر یہاں آیا تھا۔ سوچتا تھا کہ کس منہ سے جاؤں گا اور کیا بتاؤں گا آپ لوگوں کو کہ کیا کر آیا ہوں۔ البتہ نصرت تو دن گن رہی تھی۔ پاکستان جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

لیگوس میں رہتے ہوئے میں نے ایک ریڈیو خرید لیا تھا۔ جس پر ہم ''ریڈیو پاکستان'' کی خبریں سن لیتے تھے۔ جون 1974ء میں جماعت کے خلاف ہنگاموں اور گھیراؤ جلاؤ کی خبریں سنیں تو پریشان ہو گئے۔ یہ فسادات تھے کہ پھیلتے ہی جا رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ یہ کنٹرول کیوں نہیں ہو رہے۔ ''بھٹو'' تو اپنا ''آدمی'' ہے۔ یہ دیکھ کیا رہا ہے۔ کوئی بیان نہیں۔ کوئی مذمت نہیں۔ حیران تھا کہ ان حالات میں یہ ''شمالی علاقہ جات'' کے دورے پر کیا کر رہا ہے۔ محسوس تو ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ تو بعد میں کھلا کہ ''کچھ کالا'' نہیں۔ ساری دال ہی کالی تھی۔ یہ آگ اس ''اپنے'' کی ہی لگائی ہوئی تھی۔

ع ''کہ بامن ہرچہ کرد ایں آشنا کرد''

چند دن یہ ہنگامے جاری رہے پھر اچانک 2 جون کو ریڈیو سے یہ خبر سنی۔

''آج ملک میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا سوائے بورے والا میں آتشزدگی کے ایک واقعہ کے..........''

سنتے ہی مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ ''ہمارے گھر کی خیر نہیں۔'' فوراً ذہن میں آیا ''اگر واقعہ معمولی ہوتا تو استثنائی طور پر ذکر نہ ہوتا۔'' ماضی کی مخالفت اور حملے یاد آئے۔ دل گھبرانے لگا۔ بھائی جان! کالج کے زمانے میں غالب کے اس شعر کا پس منظر آپ نے سمجھایا تھا۔

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ پس منظر اُس روز مجھ پر صادق آ رہا تھا لیکن میں اُس قیدی پرندے کی طرح کسی خوش فہمی میں نہ تھا۔ میں ڈر سہم سا گیا کہ ''رُودادِ وطن'' کہتے ہوئے۔ ''میرے ہمدم'' نے جس ''بجلی کی خبر'' ڈرتے ڈرتے مجھے ''اس قفس'' میں سنائی ہے۔ وہ ہو نہ ہو ''میرے ہی آشیاں'' پر گری ہے۔ ''والدہ کہاں ہوں گی''۔ ''بھائیوں کا کیا بنا۔'' ہم سخت پریشان ہو گئے۔

میں نے امیر صاحب سے رابطہ کر کے انہیں اس خبر اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ اس بارہ میں

پاکستان سے پتہ کریں۔ اسی شام مغرب کی نماز کے بعد صدرِ جماعت نے اچانک اعلان کیا کہ آؤ پاکستان میں شہید ہونے والوں کی نماز جنازہ غائب پڑھ لیں اور نماز شروع کر دی۔ سنتے ہی میری حالت غیر ہوگئی کہ کیا ان میں......

ہفتہ دس دن کے بعد امیر صاحب نے اطلاع دی کہ گھر تو جلا دیا گیا ہے۔ شکر ہے جانیں بچ گئی ہیں اور وہ ربوہ میں پناہ گزین ہیں۔ ان ہی حالات میں نصرت کو شدید اعصابی تکلیف ہوگئی اور Benin ٹیچنگ ہسپتال لے جانا پڑا اور مجھے معدہ میں Ulcer کی تکلیف ہوگئی جس کا اعلان آپ نے الفضل میں پڑھا تھا۔ اور جس پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا تھا کہ جوان آدمی کے ''جگر میں زخم'' تو سمجھ میں آتا ہے یہ معدے میں زخم کا غیر شاعرانہ سا عارضہ تم کیا لے بیٹھے ہو۔

پاکستان میں ملازمت چھوڑ کر آیا تھا اور بقول امیر صاحب میں ''کشتیاں جلا کر'' ساحلِ افریقہ پر اترا تھا۔ لہٰذا مستقل واپسی تو پہلے ہی ممکن تھی نہ میں اس کا حوصلہ پاتا تھا۔ اب تو یار لوگوں نے گھر بار ہی جلا دیا تھا چھٹی پر جانا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ آپ نے بھی اور منان نے بھی تفصیلی خطوط کے آخر میں یہی مشورہ دیا تھا کہ کہیں آ نہ جانا۔ اس پس منظر میں یہاں اپنی تنگی حالات زیادہ بھیانک محسوس ہونے لگی تھی۔ ''نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن'' کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کروں۔ یوں لگتا تھا جیسے بند گلی میں ہوں، سامنے دیوار ہے اور کوئی معجزہ ہی اس صورتحال سے بچا سکتا ہے۔ کوئی شکوہ و شکایت دل میں تھی نہ زبان پر۔ دعائیں ہی میرا اوّل اور آخر سہارا تھیں اور دل میں ایک گونہ سکون تھا کہ میں خدا کی خاطر اس صورتحال سے دوچار ہوں اور وہی اس اندھیرے میں روشنی اور اس ''دیوار میں شگاف'' پیدا کر سکتا ہے۔ میری تو یہی کوشش اور خواہش تھی کہ صبر واستقامت کا دامن نہ چھوٹے اور قبلہ درست رہے۔ خواہ حالات کوئی بھی رخ اختیار کریں۔

اجے بواوڈے میں تقرری

اور پھر اچانک صورتحال کچھ بدلی۔ امیر صاحب مکرم محمد اجمل صاحب ایک روز آئے۔ وہ دورہ پر تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا کہ ''اب کیا ارادہ ہے۔ یہاں تو محض وقت ضائع ہو رہا ہے۔ واپس تم جا نہیں سکتے۔'' میں نے کہا کہ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اگر کچھ کہوں بھی تو شکایت ہوگی۔ آپ خود دیکھ لیں۔ انہوں نے کہا کہ ''Jos کے ڈاکٹر صاحب واپس جا رہے ہیں۔ اچھا شہر ہے۔ چلتی کلینک ہے وہاں چلے جاؤ۔'' پھر انہوں نے بتایا کہ ''ویسے تو ''اجی بواوڈے'' میں بھی تمہارے جانے کے بعد جماعت نے نئی بلڈنگ بنائی ہے۔ لیکن نئے ہسپتال کو چلانا بہت محنت کا کام ہوگا اور تم تو پہلے ہی کافی Suffer کر چکے ہو۔'' میں نے کہا کہ ''مجھے حضور نے اجی بواوڈے کے لئے بھیجا تھا۔ شہر بھی دیکھا بھالا ہے۔ بہتر ہے مجھے وہیں لگا دیں۔'' اس پر امیر صاحب نے کہا کہ اس کے لئے پھر تم حضور کو درخواست لکھو۔ چنانچہ میں نے جملہ حالات لکھ کر درخواست حضور کی خدمت میں ارسال کر دی۔ حضور نے منظور فرمائی اور ایک دفعہ پھر میں ٹرک میں سامان لاد کر قسمت آزمائی کے لئے واپس اُسی شہر کی طرف چل پڑا جہاں تین سال پہلے پریشان حال گھوما تھا۔ حالات تو بدلے تھے لیکن دل خوف زدہ تھا۔ نیا آغاز نہ جانے کیسا رہے۔

جنوری 1975ء میں یہاں کلینک کا آغاز کیا۔ قریب ہی رہائش کے لئے ایک فلیٹ بھی مل گیا۔ ٹھیک ہی تھا۔ آہستہ آہستہ کام روبترقی ہوتا گیا۔ چند ماہ میں ہسپتال بارونق ہوگیا۔ امیر صاحب آتے رہے اور حوصلہ بڑھاتے رہے۔ میں حضور کی خدمت میں دعا کے لئے لکھتا رہا۔ کام تو چل رہا تھا لیکن دل میں دھڑکا سا تھا کہ اکارے میں بھی تو شروع میں کلینک اچھی چلی تھی۔ پھر جلد ہی کام ڈاؤن ہوگیا تھا۔

بہرحال خدا کے فضل سے کام چلتا رہا اور میں خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ مشن کی مالی خدمت کی بھی توفیق پاتا رہا۔ نائیجیریا میں ''نصرت جہاں فنڈ'' کچھ زیادہ مضبوط نہ تھا۔ ہم ڈاکٹر کچھ زیادہ کامیاب نہ رہے تھے اور اخراجات مشن کے بہت تھے کیونکہ سکول کھل گئے تھے۔

کام کرتے مجھے سال بھر ہی ہوا ہوگا کہ ایک روز امیر صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ''تمہارے ہسپتال کی Boom نے تو ''نصرت جہاں فنڈ'' کی کایا پلٹ دی ہے۔'' ادھر خود میری کایا پلٹ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ مجھ ایسا ناکارہ انسان اور خدمتِ دین کی یہ توفیق۔ پھر دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور اگلے سال یہ ترقی دن چوگنی تو رات آٹھ گنی ہوگئی اور میں اس توفیق اور اللہ تعالیٰ کی عنایت پر حیران سے حیران تر ہوتا گیا۔

چند ماہ قبل امیر صاحب پھر ایک دفعہ آئے اور ایک خط کی فوٹوسٹیٹ مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ''لو اس کو فریم کرا کر رکھ لو۔'' یہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے خط کی نقل تھی جو حضور انور نے امیر صاحب کو لکھا تھا۔ اس خط میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اجی بواُوڈے ہسپتال کی رجسٹریشن پر خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور پھر لکھا تھا کہ

''اللہ تعالیٰ ڈاکٹر بُھٹّہ صاحب کو جزائے خیر دے کہ اُن کی وجہ سے اجی بواُوڈے ہسپتال بجٹ میں سب سے آگے نکل گیا ہے۔''

خط پڑھا تو میں تو گھوم گیا۔ سر پکڑ لیا۔ یا اللہ تو مشتِ خاک کو اس طرح بھی نوازتا ہے۔ خدمتِ دین کی توفیق دینے لگے تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس مٹی میں تو نم تک نہیں۔ مجھے تو کوئی علم نہ تھا کہ دوسرے ہسپتالوں کی آمد کیا ہے اور نہ ہی کسی موازنے کا خیال مجھے آسکتا تھا کہ میں تو ایک بوجھ تھا جماعت پر اور ڈاکٹر کم اور ''بیمار'' زیادہ تھا۔ یہ تو محض حضور کی ذرہ نوازی تھی کہ لکھ دیا کہ ''ڈاکٹر بُھٹّہ کی وجہ سے'' آگے نکل گیا۔ ورنہ خدا اور اُس کا خلیفہ خوب جانتے ہیں کہ یہ محض حضور کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی بندہ نوازی تھی۔ اکارے بھی تو اجی بواوڈے جتنا بڑا شہر تھا۔ لیکن یہی ڈاکٹر بھٹّہ مریضوں کے انتظار میں برسوں وہاں پریشان بیٹھا رہا اور مریضوں کی تلاش میں قریہ قریہ مارا مارا پھرا تھا۔ لیکن اتنی توفیق نہ پاسکا کہ چند سو پاؤنڈز ہی دین کی خاطر بچا کر دے سکے۔ پھر یہ ترقی ''ڈاکٹر بُھٹہ'' کی وجہ سے کیسی؟

ایسا بے کار شخص اگر اس شہر ''اجی بواوڈے'' میں اب دین کی مالی و حالی خدمت کی خاطر خواہ توفیق پا رہا ہے تو ظاہر ہے یہ ''بُھٹّہ'' کی ڈاکٹری نہیں۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ ہی کی ''کیمیا گری'' ہے۔ سب واقفِ حال لوگ یہی کہتے ہیں کہ حضور نے تمہیں

اس شہر کے لئے بھیجا تھا اور تمہارے کام میں برکت یہاں ہی پڑی۔ میری کار خاصی پرانی تھی لیکن کام چل رہا تھا۔ جب مصروفیات بڑھنے لگیں تو کچھ پریشانی ہونے لگی۔ دوست احباب اکثر مشورہ دیتے کہ اب گاڑی بدل ہی لو۔ بعض تو ایک اچھی مقبول گاڑی کا نام لے کر کہتے کہ ''وہ ہونی چاہئیے آپ کے پاس''۔ میں ٹالتا رہا کہ نہیں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ پھر جب زیادہ ہی تنگ کرنا شروع کیا تو میں نے امیر صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''بوڑھی گھوڑی کو لال لگام لگا کر'' کب تک کام نکالو گے۔ اب حضور کی خدمت میں درخواست دے ہی دو۔ چنانچہ میں نے درخواست لکھ دی اور حضور انور نے از راہِ شفقت منظور فرمائی اور پھر کچھ ہی عرصہ میں ایک نئی اور مقبول کار میرے پاس تھی۔ **فالحمد للہ**.

میرا فلیٹ بھی اچھا تھا لیکن قدرے چھوٹا تھا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے پھر اس میں پانی کی کمی بہت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ شہر کے اونچے علاقے میں تھا اور پانی وہاں کم ہی پہنچتا تھا۔ شہر میں بہت سے فلیٹ تعمیر ہوئے اور ہو رہے ہیں لیکن وہ شہر کے دوسرے علاقے میں ہیں اور ہسپتال سے دور جانا مجھے گوارا نہ تھا چنانچہ میں اُسی فلیٹ میں گزارہ کرتا رہا۔ بہت سے پاکستانی اور انڈین اُن دنوں سرکاری ملازمت میں یہاں آ گئے ہیں اور ارد گرد آباد ہو رہے ہیں۔

ایک روز میں شہر سے گھر آ رہا تھا تو ایک پاکستانی دوست سے ملاقات ہوئی۔ وہ فلیٹ کی تلاش میں تھے۔ میں نے کہا کہ اس علاقے میں فلیٹ کہاں! وہ بولے آپ کے ہسپتال کے قریب ہی گلی میں بڑے اچھے فلیٹ بنے ہیں لیکن وہ اتنے اچھے ہیں کہ ہم لے نہیں سکتے۔ میں گیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے بھی وہ کچھ زیادہ ہی ''اچھے'' لگے۔ تین بیڈروم، ایک گیسٹ روم، دو باتھ، دو ٹائلٹ، ماڈرن کچن، ڈائننگ و ڈرائینگ رومز، سٹورز، الماریاں، برآمدہ، حفاظتی جنگلہ اور پانی کے لئے اوپر ٹینک۔

میں کچھ مایوس سا ہو گیا۔ مالک مکان سے ملا تو میری مایوسی درست نکلی۔ دوسری طرف مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ہسپتال سے دور جانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے یہ فلیٹ میرے لئے ہی بنایا ہو لیکن بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔ دو چار دن بعد میں نے محسوس کیا کہ مالک چاہتا ہے کہ میں ہی اس فلیٹ کو لے لوں۔ ''سفید فام'' کرائے دار بہتر خیال کئے جاتے ہیں شاید۔ اس نے میرے لئے کرایہ کم کر دیا۔ میں نے مقامی جماعت سے مشورہ کیا اور امیر صاحب کو اطلاع دی۔ وہ آئے، دیکھا تو کہا کہ فوراً لے لو۔ بہت اچھا سودا ہے۔ اور اس طرح چند روز بعد ہی میں شہر کے ایک بہت اچھے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ **فالحمد للہ**

ہسپتال سے کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ سڑک کے سامنے گراؤنڈ فلور پر میں ہوں اور اوپر اب سرکاری ہسپتال کا چیف میڈیکل افسر اور ہیلتھ افسر جس نے میرے ہسپتال کا معائنہ کیا اور رجسٹریشن کی تھی، وہ آ گیا ہے۔ اچھا ملنسار آدمی ہے۔ ڈیڑھ سال قبل نصرت کا اپریشن اسی نے کیا تھا۔ یہ وہ نہیں جسے ہم سات سال پہلے ملے تھے۔ وہ ریٹائر ہو گیا ہے۔ یہ نیا آیا ہے۔

اکارے میں ہمارے لئے ایک بڑا مسئلہ تنہائی اور اجنبیت کا احساس تھا۔ میرا تو وقت کٹ ہی جاتا تھا لیکن نصرت کے لئے یہ دور بہت ہی کٹھن تھا۔ یہاں اجی بواوڈے میں دو گھرانے اپنے تھے اور غنیمت تھے۔ پھر جلد ہی سننے میں آنے لگا کہ

گورنمنٹ اپنے وفود ایشیائی ممالک میں بھیج کر وہاں سے ٹیچرز بھرتی کر رہی ہے۔ اور پھر چند ماہ بعد ہی انڈیا، پاکستان اور فلپائن وغیرہ سے ہندو، سکھ، مسلمان خاندان ہمارے ارد گرد آہستہ آہستہ آباد ہونے لگے۔ چند احمدی بھی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رونق ہو گئی ہے۔ سب نو وارد لوگ شروع میں کچھ سہمے اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ انہیں معلومات اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم ان کی ہر طرح سے مدد کرتے رہے اور اس طرح پھر میل ملاپ شروع ہو گیا۔ اب تو اتوار کے روز گھر کے سامنے تین تین چار چار گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ نصرت مہمان نوازی کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں ہی زیادہ تنہائی کی شکایت تھی اور ''آنڈ گوانڈ'' کی یاد ستاتی تھی۔ تمہاری تو خدا نے کچھ زیادہ ہی سن لی ہے۔ اب بھگتو! ملنے والوں کی اتنی ورائٹی ہو گئی ہے کہ Selective ہونا پڑ گیا ہے ہمیں۔

تقریر، تحریر اور تبلیغ کا سلسلہ خدا کے فضل سے یہاں بھی جاری ہے۔ ایک تو یہ میرا شوق ہے اور دوسرے مجھے یہ احساس ہے کہ یہاں جو کاٹ رہا ہوں، وہ وہی ہے جو اکارے میں بویا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرا ذاتی اور ذوقی خیال ہو گا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہو کہ جن مہینوں میں مَیں تبلیغ میں مصروف رہا، انہیں مہینوں میں ہسپتال کی مصروفیت میں بھی اضافہ ہوا۔ جب اُدھر ڈھیلا ہوا تو اِدھر بھی معاملہ سست ہو گیا۔ اور یہ میں گزشتہ تین سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اس ریکارڈ کو میں کہاں لے جاؤں۔ میں تو ''خرابیِ حالات'' سے ڈرا ہوا ہوں۔ اور اب اگر ان کی صحت کچھ بحال ہوئی ہے تو اس کو قائم رکھنے کے لئے میں ہر نسخہ، بلکہ ہر ٹونہ ٹوٹکا بھی استعمال کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے خدا اگر میرے دونوں شوق پورے کر رہا ہو تو بھائی! اعتراض کیا ہے۔

سہانا سُپنا

بچپن میں آپ سے ہاکی سیکھی اور کالج لائف میں کھیلتا رہا۔ وزیر آباد میں ٹینس سیکھی اور دو تین سال ہی کھیل پایا تھا کہ کندیاں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں وقف کیا اور نائیجیریا آنے کی تیاری میں لگ گیا۔ تیاری کے دوران آئندہ کی ممکنہ مشکلات کے ڈراؤنے خواب وخیالات میں کبھی گم ہو جاتا تو ایسے میں کبھی کبھی سہانے سپنے بھی دیکھنے لگتا کہ ''کیا بعید خدا میرا ٹھکانہ ایسے شہر میں کر دے جہاں میرا کلینک ہو۔ اچھا سا گھر ہو۔ گاڑی ہو اور شہر میں ٹینس کلب ہو جہاں میں............ نہیں نہیں واقف کے لئے ایسا سوچنا زیب نہیں دیتا۔'' میں سر کو جھٹک کر یہ تصوراتی گھراؤندے توڑ دیتا۔ ''یہ راہ کٹھن ہوتی ہے۔ ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔'' اور پھر جو مشکلات پاکستان میں روانگی سے قبل اور پھر یہاں آکر کئی سال تک دیکھیں وہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ صبر واستقامت کی توفیق بخشی۔

اب یہاں ''اِجی بواُوڈے'' آکر ڈاکٹروں اور افسروں سے میل ملاقات میں پتہ چلا کہ یہاں ایک کلب ہے جہاں یہ لوگ ٹینس کھیلتے ہیں۔ چند روز جا کر دیکھتا رہا اور پھر میں نے کلب جائن کر لی۔ دو سال سے کھیل رہا ہوں۔ کلب جاتے ہوئے کندیاں کے ریگزاروں میں دیکھا برسوں پرانا وہ ہلکا سا سپنا نہ جانے کیسے ذہن میں اُبھر آتا ہے اور جذبات میں ہلچل مچا دیتا

ہے۔گاڑی چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ہونٹ دانتوں میں دبا لیتا ہوں اور آنسوؤں کی جھلی کو صاف کرنے کے لئے پلکوں کو جلد جلد جھپکتا ہوں۔............کوئی دعا نہ تھی۔مطالبہ نہ تھا۔نہ ہی کوئی ایسی خواہش تھی جو دل میں اٹک جائے۔بس یونہی ہلکا سا خیال تھا جو لحہ بھر کے لئے آیا اور مٹ گیا کہ ''کیا بعید! خدا میرا ٹھکانہ کسی ایسے شہر میں کر دے جہاں میرا کلینک ہو۔اچھا سا گھر ہو۔گاڑی ہو............اور ٹینس کھیلنے جاؤں۔''اللہ تعالیٰ کے حضور زبان گنگ ہے اور دل شکر سے لبریز اور سجدہ ریز۔

1971ء میں اجی بو اُوڈے شہر گھوما تھا۔اب چند سال بعد آ کر دیکھا تو نسبتاً بارونق پایا۔سڑک کے دونوں طرف پرانی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتوں نے لے لی ہے۔ان نئی عمارتوں کے درمیان وہ پرانی، خستہ حال اور کچی عمارت اب بھی کھڑی ہے جو سات سال قبل اس ناچیز کی رہائش اور کلینک کے لئے تجویز ہوئی تھی اور جس کو ہیلتھ افسر نے رد کر دیا تھا۔نہ جانے اس کو گرا کر دوبارہ کیوں نہیں تعمیر کیا گیا۔شاید اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے قائم رکھا ہے کہ وہ خدمتِ دین کی غرض سے آنے والے اس عاجز کو یاد دلاتی رہے کہ:

''اے حقیر انسان! تیرا اصل ٹھکانہ اور بساط تو وہی کچی اور خستہ عمارت ہے۔تو اگر آج اس شہر میں جہاں تو مکان کی تلاش میں مارا مارا پھرا تھا۔نئے ہسپتال میں کام کرتا ہے۔نئے فلیٹ میں رہتا ہے اور نئی کار میں گھوم رہا ہے تو یہ محض اور محض اللہ تعالیٰ کے خاص فضل اور خلیفۂ وقت کی خصوصی دعاؤں کے طفیل ہے۔''

بھائی جان! اس ''مختصر کہانی'' کی تمہید کچھ زیادہ ہی طولانی ہوگئی ہے۔یقیناً آپ کہتے ہوں گے کہ اب اصل بات کہہ بھی چکو۔بس اِک آخری کڑی اس تمہید کی عرض کر کے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

ایک خواہش

1970ء میں جب حضور نے ''لیپ فارورڈ'' پروگرام کا اعلان فرمایا تو یہ بھی فرمایا تھا کہ ''افریقہ کے دورے کے دوران اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ ایک لاکھ پاؤنڈز یہاں Invest کر دو۔'' جب میں نے وقف کا ارادہ کیا تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔''کاش خدا تعالیٰ مجھے یہ توفیق دے دے کہ میں ہی یہ رقم جماعت کے لئے پیدا کر سکوں۔''

اس مقام پر بھائی جان! مجھے معلوم ہے آپ مجھے ڈانٹ پلائیں گے کہ ''ایک تو تم یہ سپنے دیکھنے سے باز نہیں آتے۔کیا ضرورت تھی ایسا اونچا سوچنے کی جو انسان کی پہنچ سے ہی باہر ہو۔انسان کو اپنی کھال میں رہنا چاہئیے۔'' آپ کا کہنا بجا ہے لیکن یہ بھی تو کہتے ہیں کہ انسان کو نیت صاف اور ارادے بلند رکھنے چاہئیں۔ان سوچوں کو کنٹرول کون کرے۔ایک نائیجیرین دوست سے یہ محاورہ سنا تھا جو مجھے اچھا لگا۔ "He who aims at the stars, will shoot atleast beyond the roof" جو ستاروں کو نشانہ بناتا ہے۔اس کا تیر کم از کم چھت سے اوپر تک تو جائے گا ہی۔''

بہرحال بھائی! بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔اور میرا وہ خیال اُبھرتے ہی میری کمزوری اور کم مائیگی میں دب کر رہ گیا

تھا اور پھر وقف کے بعد جن مشکل حالات سے برسوں تک گزرتا رہا اُن میں تو وہ خیال اور بھی گہرا دفن ہو کر رہ گیا تھا۔ جو خود غوطے کھا رہا ہو وہ کسی کے بچت بچاؤ کا سوچ بھی کہاں سکتا ہے۔ ''گنجی دھوئے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔''

اور اب سات سال بعد...... جبکہ میں چھٹی پر گھر آنے کا پروگرام بنا رہا ہوں تو دفتر میں بیٹھے یونہی خیال آیا کہ وقف کا ایک دور ختم کر کے جا رہا ہوں، ذرا جائزہ تو لوں اپنی کارکردگی کا۔ وہاں جا کر آپ لوگوں کو کیا بتاؤں گا کہ کیا تیر مار آیا ہوں۔

اور میں یہ دیکھ کر حیران بھی ہوں اور قربان بھی کہ اُس قدیر وکریم خدا نے میری وہ مرحومہ اور مدفونہ خواہش بھی...... جس کو میں یکسر فراموش کر چکا تھا۔ چند ماہ قبل تک پوری کر دی ہے۔ گویا آٹھ سال پہلے چھوڑا ہوا میرا وہ کمزور سا تیر تو اُسی وقت ستاروں سے بھی آگے نکل گیا تھا۔

فالحمد للّٰہ رب العالمین۔ وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم۔ وعلیہ توکلت و الیہ انیب

اصل بات

بھائی جان! اصل بات عرض کرتا ہوں۔ آپ کے خطوط میں کئی بار میری واپسی سے متعلق اشارے ہوئے اور وزیرآباد سے آمدہ اور دیگر بہن بھائیوں کے تحریر کردہ خطوط میں بھی اکثر ہماری واپسی کا ذکر ہوتا رہا۔ لیکن جواب میں واپسی کے پہلو کو میں ٹال جاتا اور کبھی اشارۃً بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ مجھے کچھ سوجھ بوجھ لگتی تو میں ذکر کرتا۔ گزشتہ سات سال کی آپ بیتی کا ہلکا سا خاکہ عرض کر چکا ہوں۔ میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے لیکن بات پھر بھی کچھ لمبی ہوگئی۔ یہ سب باتیں میں ملاقات تک اٹھا رکھنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں لکھنے بیٹھ گیا۔ شاید اس لئے کہ یہ سب باتیں میں زبانی کہہ نہ پاتا۔ ان کا توضبطِ تحریر میں لانا بھی بہت مشکل ہو رہا ہے۔ اکثر جذبات پر قابو نہ رہتا اور رکنا پڑتا اور کئی روز میں جا کر یہ سب کچھ لکھ پایا ہوں۔

نہ آنے کی وجہ

حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں کہ گزشتہ سات سالوں میں کونسا مرحلہ ایسا آیا جب میری واپسی ممکن ہو سکتی تھی۔ میں نہیں آیا۔ اس لئے نہیں کہ وطن کی یاد ستاتی نہ تھی۔ اس لئے نہیں کہ بہن بھائیوں کی یاد سے دل اداس نہ ہوتا تھا۔ نہ اس لئے کہ والدہ کی یاد سے آنکھیں چھلکتی نہ تھیں۔ میں نہیں آیا کہ عملی ذمہ واریوں کے بوجھ نے جذبات کو دبا دیا تھا۔ اور اس بوجھ کو خدا تعالیٰ کی عنایات نے مزید بوجھل بنا دیا تھا۔

خدمتِ دین کی توفیق پانے کے لئے برسوں مریضوں کی راہ دیکھی لیکن حسرت ہی رہی۔ اب جبکہ سینکڑوں مریض مجھے یہ توفیق دینے کے لئے آنے لگے تو کیا میں اب حضور سے یہ کہہ دوں کہ مجھے واپس جانے دیں کہ وہاں جا کر میں نے ھَتّی کرنی ہے۔ خدمتِ دین کی خواہش سالوں دل میں پالتا رہا لیکن پوری نہ ہوئی اور اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی ہے تو کیا حضور سے یہ کہہ دوں کہ میں یہ کام جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے عزیزوں کی یاد ستاتی ہے۔ میں ایسا کہہ دوں اگر مجھے کوئی یہ یقین دلا دے کہ

میرا ایسا کہنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بدترین کفران بلکہ ''ٹھکران'' شمار نہ ہوگا۔ ایسے میں تو چُھٹی مانگتے بھی دل ڈرتا ہے۔''

یہاں آپ پوچھیں گے کہ'' آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ جب گئے تھے تو عام تاثر تو یہی تھا کہ تم نے تین یا زیادہ سے زیادہ چھ سال وقف کئے ہیں اور اب تو سات سال ہو گئے ہیں۔''

یہ بات آپ کی درست ہے اور شروع میں خیال میرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن جس اعجازی طور پر یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی اور تیاری کے دوران جس عجب انداز سے خدا تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور رُکاوٹوں کو دُور کیا۔...... اس سے روانگی سے قبل ہی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ منشائے الٰہی کچھ اور ہے۔ اور یہ کہ جس کشتی میں سوار ہونے جا رہا ہوں اس کے پتوار میرے ہاتھ میں نہیں اور نہ ہی میں اس کا رُخ، منزل اور اوقات متعیّن کر سکتا ہوں۔ از خود تو وقف کرنے کا میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ بس تحریک ہوئی اور پھر حالات کے دوش پر اُڑتا گیا اور اُڑتا چلا جا رہا ہوں۔ بس سب کچھ اللہ توکل ہی ہے۔

میرے وقف کرنے سے کچھ عرصہ پہلے آپا حمیدہ نے مجھے بتایا تھا کہ جب تم میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے گھر میں ایک روز تمہاری کوئی بات ہوئی تو ابا جی نے کہا تھا'' میرا خیال تو اس کو وقف کرنے کا تھا لیکن یہ ڈاکٹری کی طرف چلا گیا ہے۔'' مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹری کے بعد میرا یہ وقف میں آنا، ابا جی مرحوم و مغفور کی ہی دعاؤں کی تاثیر ہے اور انہی کے خیالوں، خوابوں کی تعبیر، ربنّا تقبل منا انک انت السمیع العلیم. رَب ارحمهما کما ربینی صغیرا

والسلام۔ خاکسار عبدالرحمٰن بُھٹّہ۔ اجی بواوڈے نائیجیریا

باب چہارم

احمدیہ ہسپتال ''اجی بواُوڈے'' میں میرے بارہ سال

(کچھ حالات وواقعات)

نائیجیریا میں اپنے ابتدائی سات سالوں کے کچھ حالات میں ''بھائی کے نام خط'' میں بیان کر چکا ہوں۔ وہاں میں نے لکھا ہے کہ خدا کے فضل سے اجی بواوڈے ہسپتال کا آغاز اچھا ہو گیا تھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے میری کارکردگی پر اظہار خوشنودی فرمایا تھا۔ ''اجی بواُوڈے'' ہسپتال میں میں نے 1975ء سے 1986ء تک کام کیا۔ اس بارہ سال کے عرصہ میں ہسپتال کے کام کے ساتھ ساتھ جماعتی اور تبلیغی مصروفیات بھی جاری رہیں۔

اس بارہ سالہ دور کے کچھ حالات وواقعات درج کرتا ہوں۔

غیر احمدی مولوی صاحب سے ملاقات

ستمبر 1971ء میں جب میں لیگوس مشن ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا تو امیر صاحب مولانا فضل الٰہی صاحب انوری نے بتایا تھا کہ یہاں نائیجیریا میں ایک انڈین مولوی عطاء الرحمٰن بہاری نے جماعت کے خلاف ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا نام تھا "Do you know"۔ اس کتابچے میں جماعت کے خلاف بہت سے اعتراضات درج تھے۔ ان اعتراضات میں یہ اعتراض بھی تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے معجزہ شق القمر کا انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ بکواس ہے۔'' (نعوذ باللہ)

مکرم امیر صاحب نے فوری طور پر ایک اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا "Do you accept"

اس اشتہار میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اصل حوالے کی فوٹوسٹیٹ شائع کر کے ثابت کیا گیا تھا کہ وہ اعتراض غلط تھا اور تحریف وتلبیس کا شاہکار تھا۔ اس میں تو حضور علیہ السلام نے اس معجزہ کی تصدیق فرمائی تھی اور دلائل سے اس کو سچا ثابت کیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ عیسائیوں کا یہ کہنا کہ ایسا ممکن نہیں ''محض بکواس ہے''۔ اشتہار میں چیلنج کیا گیا تھا کہ اگر مولوی صاحب وہ اعتراض سچا ثابت کر دیں تو ان کو ایک ہزار پاؤنڈ انعام دیا جائے گا۔ (اس وقت نائیجیریا کی کرنسی پاؤنڈز تھی) مولوی صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ (اس کتابچے کا مفصل جواب مکرم شکیل احمد منیر صاحب نے بعد میں "The true reformer" کے نام سے لکھا تھا اور کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔)

اب چار سال بعد 1975ء میں جب میں اجی بواوڈے آیا تو کچھ ہی عرصہ میں بہت سے ٹیچرز پاکستان، انڈیا اور فلپائن وغیرہ سے بھرتی ہو کر اردگرد آباد ہو گئے تھے۔ ان سے میل ملاپ میں کبھی تبلیغی گفتگو بھی ہو جاتی تھی۔ ایک انڈین ٹیچر آفتاب احمد بھی انہی میں سے تھے۔

ایک روز میں آفتاب صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ دروازے کے باہر ایک چھوٹے سے بینچ پر تین آدمی

بیٹھے ہیں۔ دوتو نائیجیرین تھے اور اُن کے درمیان ایک مولوی صاحب تھے جو شکل سے انڈین، پاکستانی لگتے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا اور پوچھا'' کیا آفتاب صاحب گھر پرنہیں۔''

مولوی صاحب نے کہا کہ ''نہیں۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔'' پھر مزید انہوں نے بتایا کہ وہ Ilorin سے کل آئے تھے۔ رات آفتاب صاحب کے ہاں ٹھہر کر لیگوس گئے تھے اور اب لیگوس سے واپس آئے ہیں تو صاحب خانہ گھر پرنہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کو بہت بھوک لگی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔

میں نے نام پوچھا تو بولے ''عطاء الرحمٰن بہاری''

نام سنتے ہی مجھے ان کی وہ کتاب اور محترم انوری صاحب کا چیلنج یاد آ گیا اور سوچا کہ ان سے بات کرنی چاہئے چنانچہ میں نے نام سنتے ہی ان سے کہا:

''مولوی صاحب میرا گھر بھی یہاں قریب ہی ہے۔ ہمارے آپ مہمان ہیں۔ آپ کو بھوک لگی ہے۔ چلیں میرے ساتھ۔ کھانے کے بعد میں آپ کو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔''

مولوی صاحب مان تو گئے لیکن ان نائیجیرین دوستوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''ان کا کیا کروں۔ یہ دونوں قادیانی ہیں۔ میں قریبی مسجد میں نماز پڑھنے گیا تھا۔ ان کو ساتھ لایا ہوں تا کہ ان کو قادیانیوں کے خلاف کچھ لٹریچر دے دوں۔ لیکن وہ میرے بکس میں ہے جو اندر ہے۔'' پھر مولوی صاحب نے مزید کہا کہ

''کس قدر اندھیر ہے کہ یہ قادیانی مسجد کا امام ہے حالانکہ دوسرے نماز پڑھنے والے مسلمان ہیں۔'' معاملہ بگڑتا دیکھ کر میں نے فوراً کہا۔

''مولوی صاحب یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ وہ لٹریچر مجھے دے دیں۔ میں دے دوں گا۔ آپ اٹھیں اور چلیں میرے ساتھ۔''

دونوں احمدیوں کو میں نے بھگا دیا اور مولوی صاحب کو گاڑی میں بٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے جلدی تھی کہ کہیں آفتاب صاحب آ نہ جائیں اور ''شکار'' ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

گاڑی چلاتے ہوئے میں نے سوچا کہ گھر جا کر تو ان کو پتہ چل ہی جائے گا۔ ابھی سے کچھ تمہید باندھ لی جائے ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب خود ہی بول پڑے، کہا:

''دیکھا آپ نے! یہ قادیانی کیسے سادہ جاہل لوگوں کو ورغلا لیتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''نہیں مولوی صاحب، ہم تو سنتے ہیں کہ ان میں بہت پڑھے لکھے لوگ ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان وغیرہ شامل ہیں۔

ان میں تعلیم کا معیار تو بہت بلند ہے'' ذرا ٹھہر کر میں نے کہا'' سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود ان سے بہت متاثر ہوں۔''

میری بات سن کر مولوی صاحب نے قدرے تعجب سے پوچھا:

'' کیوں! آپ ان کی کس بات سے متاثر ہو رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

'' دیکھیں ناں!۔ آپ کہتے ہیں نبوت ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے اور وہ نبی ہوں گے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ختم نبوت صرف نئے نبیوں کے لئے ہے اور پرانے نبی بے شک آتے رہیں۔ اگر آپ نے نبوت ختم کرنی ہے تو سب نبیوں پر پابندی لگائیں جیسا کہ پاکستان کی اسمبلی نے لگائی ہے۔''

میری بات سن کر مولوی صاحب نے چونک کر پوچھا۔

'' کیا کیا ہے پاکستان کی اسمبلی نے۔'' میں نے کہا۔

'' کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پاکستان کی اسمبلی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم '' مطلق آخری'' نبی ہیں۔ Absolute کا لفظ ہے فیصلہ میں۔ کسی قسم کا نیا، پرانا، ظلی بروزی، اُمتی، غیر اُمتی نبی نہیں آسکتا۔'' مولوی صاحب سن کر بولے۔

''نہیں نہیں۔ یہ تو کلمۂ کفر ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو تشریف لائیں گے۔'' میں نے کہا۔

'' مولوی صاحب! اگر آپ اپنے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے راستہ کھولیں گے تو پھر آپ '' قادیانیوں'' کو نہیں روک سکتے۔ وہ اسی راستے سے اپنے نبی کو لے آئیں گے اور مہر ختم نبوت کو توڑنے کا سارا الزام آپ پر آئے گا۔ کوئی مجبوری ہی ہوگی ناں کہ پاکستان کی اسمبلی کو ایسی سخت پابندی لگانی پڑی ہے جو آپ کے نزدیک کلمۂ کفر ہے۔''

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ گھر بھی نزدیک تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے کھانا لگایا اور ہم دونوں خاموشی سے کھاتے رہے۔ اب کے پھر خاموشی کو خود مولوی صاحب نے ہی توڑا۔ بولے۔

'' یہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں جو اسمۂ احمد والی پیشگوئی ہے۔ اس میں '' احمد'' سے مراد '' غلام احمد'' ہے۔

میں نے کھانے سے سر اٹھائے بغیر آہستہ سے جواب دیا۔

'' اگر وہ یہ کہتے ہیں تو ایسا غلط بھی نہیں کہتے''

مولوی صاحب میرے جواب پر قدرے سختی سے بولے۔

''نہیں! اس احمد سے مراد تو محمدؐ ہے۔ مرزا صاحب کا نام تو غلام احمد تھا۔''

میں نے پھر آہستگی سے جواب دیا۔

'' مولوی صاحب! قرآن میں نام '' احمد'' آیا ہے۔ اب نام '' محمد'' اس کے زیادہ قریب ہے۔ یا '' غلام احمد'' اور پھر '' غلام

احمدؐ‘‘ میں ’’غلام‘‘ تو ان کا فیملی نام تھا۔ ان کے والد کا نام غلام مرتضیٰ تھا اور بھائی کا نام ’’غلام قادر‘‘ تھا۔ ظاہر ہے کہ ’’غلام‘‘ تو سب میں مشترک ہے۔ ذاتی نام تو ان کے ’’مرتضیٰ‘‘۔ ’’قادر‘‘ اور ’’احمد‘‘ ہی بنتے ہیں۔ قرآن میں ’’اسمہٗ‘‘ آیا ہے جو ذاتی نام پر دلالت کرتا ہے نہ کہ صفاتی نام پر۔ آپ بھی تو کہتے ہیں کہ ’’احمد‘‘ سے مراد ’’محمد‘‘ ہے۔ مراد ہی ہے ناں۔ ہے تو نہیں محمد۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ اس رسول کا نام ’’احمد‘‘ ہے۔

کھانے کے بعد میں نے مولوی صاحب سے ان کی کتاب اور اس میں درج ’’شق القمر‘‘ سے متعلق اعتراض کے حوالے سے بات کی اور اس جواب اور چیلنج کا یاد دلایا جو ہم نے دیا تھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اب آپ کیا کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے آہستگی سے کہا۔

’’وہ شق القمر والا حوالہ میں نے خود اصل کتاب سے نہیں لیا تھا۔ الیاس برنی کی کتاب سے نقل کر دیا تھا۔‘‘ پھر کچھ ٹھہر کر بولے۔ ’’آپ نے اسی ایک بات کو پکڑ لیا۔ میری کتاب میں اور بھی تو بہت سے اعتراضات تھے۔‘‘

میں نے کہا ’’میں آپ سے یہی سننا چاہتا تھا کہ ہمارے مخالفین دانستہ حوالوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اور تحریف کر کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں۔‘‘ دوسرے اعتراضات کے متعلق میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے وہ حوالے خود دیکھ لئے ہیں یا الیاس برنی کی مکھی پر ہی مکھی ماری ہے۔‘‘

ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ اقبال قریشی صاحب ملنے آ گئے۔ وہ مولوی صاحب کو میرے ہاں دیکھ کر حیران ہوئے۔ مولوی صاحب نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ قریشی صاحب ساری بات سمجھ گئے۔ اور جلد ہی مجھ سے اجازت لی کہ انہیں آفتاب صاحب کے ہاں جانا ہے۔ مولوی صاحب بھی تیار ہو گئے کہ مجھے بھی لیتے جائیں۔ اس طرح وہ مولوی صاحب کو چھڑا کر لے گئے۔ یہ قریشی صاحب بھی انڈیا سے تھے اور غیر احمدی دوست تھے۔

عیسائی وکیل سے ملاقات

جب میں اجی بواُوڈے گیا تو اُس وقت مولانا مجید احمد صاحب سیالکوٹی وہاں بطور مبلغ متعیّن تھے۔ انہوں نے میری ہر طرح سے مدد اور رہنمائی کی اور ماحول سے متعارف کرایا۔ وہ تبلیغ کے مواقع بھی پیدا کرتے رہتے تھے۔ ایک شام وہ مجھے شہر کے اس علاقے میں لے گئے جہاں سرکاری افسران کی رہائش تھی۔ ہم سرکاری ’’گیسٹ ہاؤس‘‘ کے ہال میں ایک شخص سے ملے اور دیر تک گفتگو کی۔ اُس نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ کل اتوار ہے۔ آپ دس بجے میرے کمرے میں آ جائیں۔ مزید بات کریں گے۔‘‘ وہ وکیل تھا اور کسی کیس کی پیروی کے لئے ابادان سے آ کر گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آتے ہوئے ہم اس کو کچھ کتابچے دے آئے کہ وہ صبح تک ان کو دیکھ لے۔

دوسرے روز ہم اس کے کمرے میں پہنچے تو وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا اور بڑے جوش میں تھا۔ اُس نے وہ کتابچے پڑھ لئے

تھے جن میں مروّجہ عیسائی عقائد کے خلاف ٹھوس ثبوت تھے۔ اچھی گرم گرم بحث ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو میں نے کہہ دیا کہ ''اسلام کی جڑیں تو خود بائیبل میں ہیں اور بائیبل پڑھ کر تو میں بہتر مسلمان ہو گیا ہوں۔'' اس پر وہ بہت حیران ہوئے اور کہا ''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کا بائیبل کے ساتھ کیا تعلق''

میں نے بائیبل کھولی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بائیبل کی پیشگوئیوں کو شروع سے بیان کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتا رہا کہ کس طرح یہ پیشگوئی حضرت بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر چسپاں ہوتی ہے۔ میں بیان کرتا رہا اور وہ توجہ سے سنتا رہا۔ پہلو بدلتا رہا۔ شروع سے آخر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا خاکہ اس کے سامنے تھا۔ میں نے بائیبل بند کر کے اس سے پوچھا۔

''ان پیشگوئیوں کا مقصد تو دنیا کی رہنمائی کرنا ہے تا کہ دنیا سچے کو پہچان لے اور جھوٹے سے بچ جائے۔ اب اگر مقدس بانیٔ اسلام سچے نہیں تو یہ پیشگوئیاں ان کی زندگی میں پوری کیسے ہو گئیں اور کیوں ہو گئیں۔ ان پیشگوئیوں کی روشنی میں اگر کوئی شخص مقدس بانیٔ اسلام کو سچا مان کر قبول کر لیتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اگر قصور ہے تو آپ کی اس بائیبل کا جس نے اُس کی راہنمائی کی اسلام کی طرف''

پھر میں نے کہا ''اوّل تو دنیا کی کوئی اور شخصیت ایسی نہیں جس کی زندگی پر یہ پیشگوئیاں اس صفائی کے ساتھ چسپاں ہوتی ہوں جیسی وہ حضرت بانیٔ اسلامؐ کی زندگی پر ہوتی ہیں۔ لیکن بالفرض اگر یہ کسی اور کی زندگی پر بھی چسپاں ہو جائیں تو ایسی صورت میں پھر یہ پیشگوئیاں بے کار اور گمراہ کن ٹھہرتی ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے شخص کی زندگی میں بھی پوری ہو گئیں جو بقول آپ کے سچا نہیں تھا۔''

آدمی قانون دان تھا اور شریف النفس بھی۔ کچھ دیر سوچ کر بولا۔

''میں جنگل میں نہیں رہتا، ابادان میں رہتا ہوں جو ویسٹ افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ میں ان پڑھ نہیں ہوں۔ قانون کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ بڑی عمر کو پہنچ چکا ہوں اور مذہبی آدمی ہوں۔ آپ لوگ اب تک کرتے کیا رہے ہیں۔ میں اب تک ان حقائق سے بے خبر کیوں رہا۔''

میں نے مربی صاحب سے کہا کہ اس کی اس بات کا جواب اب آپ دیں۔ پھر ہم نے جماعت کی تبلیغی کوششوں کا ذکر کیا۔ تاہم تسلیم کیا کہ ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ابادان میں جماعت کا ایڈریس دیا۔ بڑے تپاک سے اس نے رخصت کیا۔

چند ماہ بعد میں ہسپتال میں تھا کہ کسی نے دفتر کی کھڑکی پر دستک دی۔ دیکھا تو وہی وکیل تھا۔ میں نے اندر آنے کو کہا تو اس نے کہا ''نہیں۔ میں جلدی میں ہوں۔ تم بھی مصروف ہو۔ میں ابادان سے لیگوس جا رہا ہوں۔ سوچا تمہیں ''ہیلو'' کرتا جاؤں۔

پھراس نے کھڑکی میں سے ہی ایک بائیبل مجھے دیتے ہوئے کہا ''امید ہے یہ تمہیں بہتر مسلمان بننے میں مدد دے گی۔''

مولوی منظور احمد چنیوٹی اور علامہ خالد محمود کی ''اجی بواوڈے'' آمد

ایک روز صبح دس گیارہ بجے کے قریب ایک نائیجیرین احمدی دوست نے ہسپتال میں مجھے اطلاع دی کہ اپنی مسجد میں تین مولوی آئے ہیں جو شکل وصورت سے آپ کے ہم وطن دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے مسجد دیکھی ہے فوٹو بنائی ہیں اور جماعت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔میں اس کے ساتھ مسجد گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔بعد میں مجھے جماعت کے دوسرے احباب نے بتایا کہ ان کا نام منظور چنیوٹی، علامہ خالد محمود ہے تیسرے کا نام یاد نہیں۔انہوں نے نائیجیرین احمدی لوگوں کو بلایا ہے کہ وہ ان سے ملیں۔ وہ سنٹرل مسجد میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہیں ہمیں بلایا ہے۔

شہر کی سنٹرل مسجد خاصی بڑی تھی اور احاطہ میں رہائشی کمرے اور ہال وغیرہ بھی تھے۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ ''آپ جائیں اور دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔'' بعد میں دوستوں نے بتایا کہ پہلے تو وہ عقائد کی بات کرتے رہے اور ہم جواب دیتے رہے۔لیکن پھر وہ حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کے خلاف بولنے لگے تو ہم نے کہہ دیا کہ یہ پاکستان نہیں ہے۔ یہاں پر ہم غیر احمدی اور احمدی دوستوں کو آپس میں نہیں لڑا سکتے۔ بات کرنی ہے تو باہر نکل کر کریں۔ چنانچہ ہم نے کل وقت اور جگہ مقرر کر لی ہے۔

مباحثہ ہوا۔ابادان سے بھی دوست بلا لئے تھے۔ میں بھی سامعین میں شامل تھا۔ جب تک اختلافی مسائل پر بات ہوتی رہی۔ ہمارے دوست اچھی گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کی ذات کو نشانہ بنانا شروع کر دیا جس سے ماحول میں کشیدگی اور تلخی پیدا ہوگئی اور گفتگو ختم کر دی گئی۔

ایک اعتراض جوانہوں نے بار بار اچھالا وہ یہ تھا کہ حضرت مسیح موعودعلیہ السلام Tonic Wine پیتے تھے۔یہ میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر سید غلام مجتبیٰ صاحب سے جو ابادان میں احمدیہ ہسپتال میں کام کرتے تھے۔میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ Eplomer's Tonic Wine تو ایک دوا کا نام ہے اور یہ ادویات کی دوکان میں بکتی ہے۔ بعد میں میں نے خادم صاحب کی احمدیہ پاکٹ بک میں مفصل اس کی وضاحت پڑھ لی تھی کہ یہ خون کی کمی، کمزوری اور ملیریا کے اثرات کو دور کرتی ہے اور حضور نے یہ لاہور سے حضرت اماں جان کے لئے صاحبزادہ مبارک احمد کی پیدائش کے بعد کی کمزوری دور کرنے کے لئے منگوائی تھی۔خود حضور علیہ السلام نے استعمال نہ کی تھی۔

مولوی منظور چنیوٹی نے جو فوٹو اجی بواوڈے مسجد کی کھینچی تھیں وہ بعد میں دنیا میں مشہور کیں کہ یہاں کلمہ میں ''محمد رسول اللہ'' کی بجائے ''احمد رسول اللہ'' لکھا ہوا ہے۔حالانکہ لکھنے والے نے محمد کی میم کو اوپر کی طرف کھینچ کر پھر ''ح'' سے ملایا ہے۔اور ''میم'' اور ''ح'' کے ربط کو اگر ذرا چھپا دیا جائے تو احمد معلوم ہوتا ہے۔اس ربط کو چھپا کر مولوی منظور چنیوٹی نے عوام کو دھوکہ دیا

اور پھر یہ مسجد الحاجہ فاطمہ نے تعمیر کروائی تھی اور بعد میں اس نے جماعت احمدیہ کو دے دی تھی۔ شروع سے ہی یہ کلمہ پختہ سیمنٹ کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ ہم نے تو نہیں لکھا تھا۔ الحاجہ فاطمہ تعمیر کے وقت احمدی نہ تھی۔ پاکستان واپس جا کر چنیوٹی صاحب نے افریقہ میں اپنی ''فتوحات'' پر مشتمل ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں اجی بواوڈے کی فتح کا بھی ذکر تھا اور میرا نام بھی مذکور تھا کہ وہ بھی بول نہ سکا۔ گویا تسلیم کیا کہ ''پیتے تھے۔''

اہلیہ کا اپریشن اور ملازمہ کی تلاش

پاکستان سے میں جب آیا تھا تو میرے تین بچے تھے۔ دولڑکے اور ایک لڑکی۔ یہاں اجی بواوڈے میں خدا تعالیٰ نے مجھے 8 ؍ اکتوبر 1976ء کو تیسرا بیٹا عطا فرمایا۔

ڈاکٹروں نے پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ آپریشن ہوگا۔ مجھے ان حالات میں گھر کے کام کاج کے لئے ایک ملازمہ کی سخت ضرورت تھی۔ کئی دوستوں سے کہہ رکھا تھا لیکن کوئی ملازمہ مل نہ رہی تھی۔ ایک لڑکی ملی تو وہ چند دن بعد بیمار ہوگئی اور چلی گئی۔ پھر ایک ملی تو وہ کام چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب اپریشن کی تاریخ مقرر ہوگئی تو میں بہت گھبرا گیا۔ بہت دعا کی۔ اپریشن سے سات آٹھ دن پہلے ایک دوست ایک دبلی پتلی اور چھوٹی سی لڑکی لے کر آیا اور کہا کہ اس کو رکھ لیں۔ میں نے کہا کہ یہ بچی کہاں کام کر سکے گی۔ بہت چھوٹی ہے۔ اس نے کہا کہ فی الحال اس کو رکھ لیں۔ میں کسی اور کی تلاش بھی جاری رکھوں گا۔ چنانچہ میں اس کو لے کر گھر چلا گیا۔ اہلیہ نے دیکھا تو وہ بھی مایوس ہو کر کہنے لگی کہ یہ کہاں گھر سنبھال سکے گی۔ میں نے کہا کہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ وہ لڑکی بھی بار بار کہتی کہ ''میڈم آپ مجھے موقع تو دیں مجھے ''ٹرائی'' تو کریں۔'' چنانچہ ہم نے اس کو رکھ لیا۔

وہ لڑکی بلا کی ذہین اور ''کامی'' نکلی۔ چند ہی دنوں میں گھر کا سارا کام سیکھ گئی۔ پاکستانی کھانے پکانا بھی سیکھ گئی اور آخری دو دنوں میں تو وہ چپاتی بھی پکانے لگی تھی۔ اہلیہ دو ہفتہ ہسپتال میں داخل رہی تھی۔ میں اپنے ہسپتال میں ہوتا تھا اور بچے سکول میں، گھر مکمل طور پر اس لڑکی کے سپرد تھا۔ اور وہ بہت احسن طریق سے گھر سنبھال رہی تھی۔ پرہیزی کھانا بھی اہلیہ کے لئے بناتی رہی۔

اُن دنوں گھریلو ملازمہ کے ذریعہ گھروں میں چوری کی وارداتیں بہت ہوتی تھیں۔ کئی پاکستانی ٹیچر لٹ چکے تھے۔ چوروں کے منظّم گروہ ''ملازمہ'' کے ذریعہ دن دہاڑے گھر کی صفائی کر جاتے تھے۔ مجھے کبھی خوف بھی آتا کہ اس لڑکی کی یہ اچھائی کہیں گھر کی صفائی کا موجب نہ ہو جائے۔ لیکن میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ وہ تھی بھی اسی قبیلہ سے جو ایسی وارداتوں کے لئے مشہور تھا۔

ہسپتال سے فارغ ہو کر اہلیہ گھر آئیں تو مزید ڈیڑھ ماہ تک بیمار رہیں۔ ابادان سے ڈاکٹر سید غلام مجتبیٰ صاحب کو بلا کر دکھایا۔ انہوں نے حوصلہ دیا کہ وقت لگے گا لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب اس ملازمہ لڑکی پر گھر کے

علاوہ اہلیہ کی تیمارداری کا بوجھ بھی تھا۔ جو اس نے پوری طرح نبھایا۔ مہمان آتے رہے اور وہ سب کی مہمان نوازی بھی کرتی رہی۔ سب حیران تھے کہ یہ لڑکی آپ کو کہاں سے مل گئی۔ بہت تعریف کرتے تھے۔ وسط دسمبر تک اہلیہ صحت یاب ہوگئیں۔ اور چند دن بعد ہی لڑکی نے کہا کہ وہ کرسمس کے لئے گھر جانا چاہتی ہے۔ ہم ہر قیمت پر اس کو رکھنا چاہتے تھے۔ وہ بھی ہم سے بہت مانوس تھی۔ ہم نے تاکید کی ضرور واپس آنا اور اس نے پکا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ایسی گئی کہ پھر نہ آئی۔ ہمیں ذرا شک نہ تھا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا جو اس لڑکی کی شکل میں اُس پردیس میں ہم پر نازل ہوا اور مشکل وقت میں ہمارا سہارا بنا۔ اہلیہ ساری عمر اس لڑکی کی احسان مند رہی۔ دعا دیتی رہی۔ بچے کو گود میں لئے اس لڑکی کی تصویر اب بھی ہمارے Sitting Room میں رکھی ہے۔ اس کا نام کوئین Queen تھا۔ اللہ اُسے جزائے خیر دے۔

گاڈز کنگڈم سوسائٹی (.G.K.S) کے صدر سے ملاقات

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ warri میں مکرم شکیل احمد منیر پروفیسر تھے۔ ہم بعض اوقات اُن کے ہاں ایک دو روز کے لیے جاتے تو وہ تبلیغ کے لیے کوئی نہ کوئی موقع پیدا کر لیتے تھے۔ ''واری'' عیسائیت کا گڑھ تھا۔ وہاں ''گاڈز کنگڈم سوسائٹی'' نام سے ایک بڑی فعال عیسائی تنظیم قائم ہے۔ بڑا وسیع ہیڈکوارٹر ہے ان کا۔ ایک دفعہ ہم اُن کے ہاں مہمان ہوئے تو انہوں نے پہلے سے ہی اس G.K.S کے صدر سے وقت لے رکھا تھا۔ دوسرے روز جب ہم وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے تو شکیل صاحب کے پرنسپل نے ان کو کوئی ضروری کام دے دیا جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ جا نہ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے ان کے گیٹ کے سامنے اُتار دیں گے۔ اور میں اکیلا ہی اُن سے ملاقات کرلوں۔ پھر وہ بعد میں مجھے وہاں سے اُٹھالیں گے۔

چنانچہ مجھے گیٹ کے سامنے اُتار کر وہ چلے گئے۔ میں نے اندر Reception پر جا کر اطلاع دی تو مجھے ایک کمرے میں انتظار کرنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کہا گیا کہ میں اُوپر جا کر سیکرٹری سے مل لوں۔ میں سیکرٹری سے ملا تو اس نے مجھے بٹھایا۔ اور کہا کہ ''صدر بہت مصروف ہے۔ صدر نے مجھے کہا ہے کہ میں آپ سے مل لوں۔'' پھر اُس نے گھڑی دیکھ کر کہا ''گیارہ بجے ہماری میٹنگ ہے۔ ابھی دس بارہ منٹ ہمارے پاس گفتگو کے لیے ہیں۔''

میں نے سوچا کہ میں اتنی دُور سے آیا ہوں۔ پہلے سے وقت بھی لے رکھا تھا۔ اب یہ کہتا ہے کہ صدر مصروف ہیں اور سیکرٹری کے پاس بھی دس بارہ منٹ ہیں۔ مجھے کچھ غُصّہ آیا۔ پھر سوچا چلو ان دس منٹ میں ہی کچھ بات کر لیتے ہیں۔ میں نے سیکرٹری سے پوچھا آپ نے اپنی سوسائٹی کا نام ''گاڈز کنگڈم'' رکھا ہے۔ اس ''گاڈز کنگڈم'' سے کیا مراد ہے۔ سیکرٹری کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ بولا:

''اس سے مراد مسیح کا مشن ہے۔'' پھر بولا اس سے مراد ''چرچ'' ہے۔

میں نے قدرے سختی سے کہا:

’’آپ نے اپنی سوسائٹی کا نام’’ گاڈ زکنگڈم‘‘ رکھا ہے۔آپ کوتو اس بارے میں بہت clear ہونا چاہیے۔‘‘

پھر میں نے کہا کہ انجیل میں ہے کہ مسیح نے حواریوں سے کہا تھا کہ’’ جاؤ جا کر منادی کرو کہ خدا کی بادشاہت قریب ہے۔‘‘ یہ کس بات کی منادی تھی، کیا چیز قریب تھی؟‘‘

اب پھر وہ سوچ میں پڑ گیا۔پھر بولا کہ یہ’’خدا کی نجات‘‘ کی منادی تھی۔

میں نے کہا کہ جب مسیح نے کہا کہ’’خدا کی بادشاہت‘‘ قریب ہے تو وہ مستقبل کی بات کررہے تھے۔ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کررہے تھے۔لیکن ایک مقام پر مسیح نے یہود سے کہا کہ’’خدا کی بادشاہت‘‘ تم سے لے لی جائے گی اور کسی دوسری قوم کو دے دی جائے گی۔ یہاں مسیح ماضی کا حوالہ دے رہے ہیں کہ’’خدا کی بادشاہت‘‘ یہود کے پاس تھی۔اب آپ بتائیں کہ یہود کے پاس کیا ایسی خاص چیز تھی کہ وہ’’خدا کی بادشاہت‘‘ کے حامل قرار پائے؟

اب کے سیکرٹری نے فوراً جواب دیا کہ’’یہود خدا کے چنیدہ لوگ تھے۔اُن کے پاس Law تھا۔‘‘

میں نے اس کے جواب کو سراہتے ہوئے کہا’’ہاں ہاں۔بالکل ٹھیک ہے۔خدا نے یہود میں ایک عظیم نبی بھیجا پھر اس نبی موسیٰ کے ذریعہ یہود کو Law دیا۔اور اس طرح’’خدا کی بادشاہت‘‘ اُن میں قائم ہوگئی۔‘‘

اب سیکرٹری کو سکون محسوس ہوا اور خوشی سے میری وضاحت کی تائید کی۔

میں نے اب اس سے کہا کہ’’اب جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ’’ گاڈ زکنگڈم‘‘ کا مطلب کیا ہے تو ہمارے لیے آسان ہے یہ معلوم کرنا کہ حضرت مسیح کے اُن اقوال کا مطلب کیا تھا۔‘‘

جب حضرت مسیح نے یہود سے کہا کہ’’خدا کی بادشاہت‘‘ تم سے لے لی جائے گی اور کسی دوسری قوم کو دے دی جائے گی۔تو مذکورہ بالا پس منظر میں وہ یہود سے یہ کہہ رہے تھے کہ اب پھر موسیٰ جیسا ایک نبی کسی دوسری قوم میں خدا بھیجے گا اور اس کو پھر نیا Law دے گا اور اس طرح اب’’خدا کی بادشاہت‘‘ کسی دوسری قوم میں قائم ہو جائے گی۔

اور پھر جب حضرت مسیح نے یہ کہا کہ’’جاؤ منادی کرو کہ خدا کی بادشاہت قریب ہے‘‘ تو وہ یہ منادی کروا رہے تھے کہ اب اس’’دوسرے موسیٰ‘‘ کے ظہور کا وقت قریب ہے۔

اب سیکرٹری صاحب پھر خاموش ہو گئے۔میں نے گھڑی دیکھ کر کہا’’ آپ کی میٹنگ کا وقت ہو گیا ہے۔بہت شکریہ کہ آپ نے وقت دیا۔‘‘اور میں اُٹھ کر باہر آ گیا۔میں نیچے آ کر انتظار گاہ میں بیٹھا شکیل صاحب کا انتظار کررہا تھا کہ Reception پر فون کی گھنٹی بجی۔پھر وہ محترمہ میرے پاس آئیں اور کہا کہ آپ کو پھر اُوپر بلایا جارہا ہے۔

میں گیا تو سیکرٹری نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ لوگ آتے ہیں، ہمارا وقت ضائع کر کے چلے جاتے ہیں۔میں نے صدر سے آپ کی گفتگو کی بات کی ہے۔صدر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔میں صدر کے کمرے میں گیا۔تپاک سے ملا، اس کے پاس

دواور دوست بیٹھے تھے۔ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ جماعت کے بارے میں پوچھتا رہا۔ میرے قریب دوتین بائبل کے نسخے پڑے تھے۔ میں نے دیکھے تو اس نے کہا کہ یہ مختلف versions ہیں۔ پھر بولا ''قرآن کے بھی کئی versions ہیں۔ آپ کون سا version استعمال کرتے ہیں۔'' پھر قرآن کا ایک نسخہ مجھے دکھاتے ہوئے بولا ''میں تو یہ version استعمال کرتا ہوں۔''

میں نے تحدّی سے کہا کہ قرآن کا ایک اور صرف ایک ہی version ہے جو شروع سے چلا آرہا ہے اور وہ عربی میں ہے۔ سب مسلمان اسی ایک کو جو اصل ہے استعمال کرتے ہیں۔ باقی ترجمے مختلف ہیں یہ انسانی کوشش ہے لہٰذا ترجموں کے version کئی ہو سکتے ہیں۔لیکن بائبل کا معاملہ بالکل الٹ ہے۔آپ کے پاس اصل version موجود نہیں ہے۔ صرف ترجمے ہیں اور یہ بدلتے رہتے ہیں۔ اور کوئی ذریعہ نہیں پرکھنے کا کہ کون سا ترجمہ درست ہے اور کون سا غلط۔ کچھ لٹریچر جو میں ساتھ لے گیا تھا۔اس کو دے کر میں نے اس سے اجازت لی کیونکہ کسی سنجیدہ گفتگو کا ماحول بن نہیں رہا تھا۔

عیسائی اخبار کا اسلام کے خلاف مضمون اور اس کا جواب

''Spiritual News'' ایک عیسائی ہفتہ وار اخبار لیگوس سے نکلتا تھا۔اس کی ۲۹۔اگست ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر اسلام کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا۔عنوان تھا ''دنیا کا نجات دہندہ مسیح یا محمدؐ'' آخر میں ایڈیٹر نے نوٹ لکھا تھا کہ ''اس موضوع پر بحث کی دعوت دی جاتی ہے۔''

مضمون میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑے سخت حملے کئے گئے تھے۔لکھا تھا کہ چونکہ انہوں نے بہت سی شادیاں کیں اور جنگیں لڑیں لہٰذا وہ خدا کے نبی نہیں ہو سکتے بلکہ Devil کے نبی تھے۔(نعوذ باللہ) حضرت مسیحؑ کو دنیا کا نجات دہندہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اسلام کی مذمّت کی تھی۔

میں نے اسی روز اس کا مدلّل لیکن مختصر جواب تیار کیا جو پہلے صفحہ پر پورا چھپ سکے۔

پہلے تو میں نے اس کی زبان میں اس کو یاد کرایا کہ بائبل کے کئی نبیوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور جنگیں بھی لڑیں تو کیا وہ Devil کے نبی تھے۔(نعوذ باللہ) اور آپ کی بائبل کی کئی کتابیں اُن ہی نبیوں کی تحریر کردہ ہیں تو کیا اب یہ بائبل Devil کی کتاب ہے۔(نعوذ باللہ) پھر میں نے حضرت مسیح کا قول کہ ''صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔'' پیش کر کے پوچھا کہ مسیح کے متعلق کیا خیال ہے۔ وہ کس کا نبی ثابت ہوتا ہے بقول آپ کے۔

پھر میں نے شادیوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ بانی اسلام نے پہلی شادی ہی ۲۵ سال کی عمر میں ایک چالیس سال کی خاتون سے کی اور آئندہ پچیس سال کی ساری جوانی اسی ایک بیوی کے ساتھ گزاری۔ مغربی محققین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آخری دس سال میں پہلی بیوی کی وفات کے بعد جو شادیاں کیں اُن کی وجوہات سوشل، سیاسی اور عورتوں کی مدد اور بہبود تھا۔ اسی طرح جنگوں کے بارے میں بھی واضح کیا کہ وہ ساری دفاعی تھیں نہ کہ کوئی سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے۔

اس سوال پر کہ ''نجات دہندہ'' کون ہے۔ میں نے بائیبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ مسیح تو دعویٰ ہی نہیں کرتے کہ وہ ساری دنیا کے نجات دہندہ ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ پس وہ تو اس مقابلہ میں حصہ ہی نہیں لینا چاہتے۔ آپ لوگ خواہ مخواہ اُن کو کھینچ کر اس میدان میں لا رہے ہیں۔ دوسری طرف قرآنی حوالوں سے ثابت ہے کہ بانی اسلام ساری دنیا کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا اس میدان میں اُن کا مقابلہ نہ مسیح سے ہوسکتا ہے نہ کسی اور نبی سے۔

میرا مضمون اگلی اشاعت میں چھپا۔ اس کے بعد میں کسی جوابی مضمون کے انتظار میں رہا لیکن اخبار ہی نہ ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد اخبار کی اشاعت ہی معطل ہوگئی تھی۔ مسلم کالج کے طلباء نے میرا مضمون خوب پھیلایا اور نوٹس بورڈ پر چسپاں کیا۔ بعد میں ہمارے اخبار The Truth میں بھی چھپا۔ یہاں جرمنی میں بھی اس کی نقول میں نے طلباء کو مہیا کیں۔

''Seventh Day Adventist'' کے کالج کے پرنسپل سے ملاقات

''سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ'' عیسائیوں کا ایک اچھا فعال فرقہ ہے جس کی بنیاد امریکہ میں اُنیسویں صدی کے آغاز میں عیسائی عالم مسٹر مِلر (Miller) نے رکھی۔ افریقہ میں بھی یہ بہت Active ہیں اور ''ویسٹ افریقہ'' کے لیے مبلّغ تیار کرنے کے لیے اُن کی Seminary اجی بواوڈے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر قائم تھی۔ بہت بڑا ادارہ تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک دوکان تھی جس سے ہم ضرورت کی اشیاء خوردنی خریدنے جاتے تھے۔

ایک روز اُن کی دوکان سے شاپنگ کے بعد میں نے سوچا اُن کا یہ کالج دیکھا جائے۔ جب میں بلڈنگ کے قریب گیا تو پرنسپل کے سیکرٹری نے مجھے خوش آمدید کہا اور مجھے مختلف شعبے دکھائے۔ لائبریری اچھی بڑی تھی لیکن ''اسلام'' پر کوئی لٹریچر نہ تھا۔ آخر پر سیکرٹری نے پوچھا کہ ''ہمارے پرنسپل سے ملنا پسند کرو گے۔'' میں نے کہا ''کیوں نہیں، ضرور ملاؤ۔''

پرنسپل امریکن تھا۔ اچھی طرح پیش آیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ دوسرے عیسائیوں سے کیسے مختلف ہیں۔ اس نے اپنے عقائد بتائے۔ ایک بات جو خاص طور پر مجھے عجب لگی یہ تھی کہ وہ گوشت اور چینی کے خلاف تھے۔ ''یہ دونوں اشیاء جسم میں فساد پیدا کرتی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ تو صرف سؤر کے خلاف ہیں، ہم تو ہر قسم کے گوشت کے خلاف ہیں۔''

اپنے فرقہ کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بہت دلچسپ اور ایمان افروز حقائق بیان کیے۔ اس نے بتایا کہ اُنیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسٹر مِلر نے بائیبل کی پیشگوئیوں سے اَخذ کیا کہ مسیح کی آمدِ ثانی قریب ہے اور بعض پیشگوئیوں سے حساب کر کے اس نے ۱۸۴۴ء کا سال بھی مقرر کر دیا کہ وہ اس سال زمین پر ہوں گے۔

اس کے دفتر میں دیوار پر بڑا سا بلیک بورڈ لٹک رہا تھا۔ اس نے سکول ٹیچر کی طرح دانیال نبی کی پیشگوئیوں سے اعداد لے کر جمع تفریق شروع کر دی اور آخر میں ۱۸۴۴ کا سال نکال لیا۔ اُس نے کہا کہ مسٹر مِلر اور اس کے ساتھی اپنے حساب سے بہت

خوش اور مطمئن تھے۔ انہوں نے امریکہ اور امریکہ سے باہر لیکچر دے کر اور تبلیغ کر کے دنیا کو یقین دلایا کہ حساب کا ہر Step دانیال نبی سے لے کر آج تک ٹھیک بیٹھتا ہے۔ لہٰذا یہ آخری جواب غلط نہیں ہوسکتا۔ دنیا اُن کے پیچھے ہو گئی۔ بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخری دو تین سال میں تو ہزاروں نے اپنے طور طریقے بدل کر پاکیزہ زندگی اختیار کر کے مسیح کے استقبال کی تیاری کی۔ اسی تحریک سے بعد میں ہمارا یہ فرقہ وجود میں آیا ہے۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے لیکچر کے بعد وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا تو پھر! کیا مسیح آیا؟

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں۔ آیا نہیں۔ شاید کہیں کوئی غلطی ہو گئی حساب کرنے میں۔''

اب لیکچر دینے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا ''میں آپ کے حساب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے مسیح کو آتے نہ دیکھا لیکن میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ مسٹر مِلر کا حساب کتاب سو فیصد درست تھا۔ ۱۸۴۴ء میں مسیح واقعی زمین پر تھا۔''

اس نے تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟

میں نے کہا ''غلطی آپ نے ''حساب کتاب'' میں نہیں کی۔ غلطی آپ نے وہی کی ہے جو یہود نے مسیح کی پہلی آمد کے وقت کی تھی۔'' پھر میں نے وضاحت کی کہ اس زمانہ کے یہود آسمان سے ایلیا کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن مسیح نے وضاحت کی تھی کہ ''یوحنّا'' ہی ''ایلیا'' ہے جسے آسمان سے اُترنا تھا۔ حالانکہ یوحنّا زمین پر پیدا ہوا تھا۔ آپ لوگوں نے مسیح کی وضاحت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا کہ آسمان سے اترنے کا مطلب جسمانی نزول نہیں ہوتا۔ میں نے کہا۔ ''آپ یہود کی طرح آسمان سے اُترنے کا انتظار کرتے رہے اور مسیح ''ایلیا'' کی طرح زمین سے ظاہر ہو گیا۔''

آپ مغرب میں مسیح کا انتظار کرتے رہے اور وہ مشرق سے ظاہر ہو گیا جیسا کہ اس نے اشارہ کیا تھا کہ ''جس طرح بجلی مشرق سے کوند کر مغرب تک چمکتی ہے اس طرح ابنِ آدم کا آنا ہو گا۔''

میری باتیں سن کر وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے بات کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا: ''آپ کا خیال تھا کہ وہ کسی عظیم چرچ میں نازل ہو گا لیکن وہ ایک چھوٹی سی مسجد سے ظاہر ہو گیا۔ اور آپ کو امید تھی کہ وہ مختلف عیسائی فرقوں کے بائیبل کے مختلف version سے بھرے بیگ کے ساتھ نازل ہو گا لیکن وہ خدا کے کلام کی ایک اصل اور خالص کتاب ''قرآن'' کو ہاتھ میں لیے دنیا میں آ گیا۔''

اب کے وہ خاموش نہ رہا اور بولا ''یہ زمین و آسمان اور مشرق و مغرب کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ کہ یہ بائیبل کے حوالے سے تم نے کی ہے۔ لیکن یہ ''مسجد'' اور ''قرآن'' کا مسیح کی آمد سے کیا تعلق؟''

یہی سوال میں اس سے سننا چاہتا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''عیسائیوں کا سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ ''مسیح کی آمدِ ثانی'' تو اُن کو خوب یاد رہی لیکن ''موسیٰ کی آمدِ ثانی'' کو بھول گئے۔ کیا موسیٰ نے نہیں کہا تھا کہ ''خدا مجھ سا ایک نبی

بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بپا کرے گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مزید کہا'' یہ بائبل کی عظیم ترین پیشگوئی ہے جس کو آپ نے یکسر فراموش کر دیا ہے۔ بقول سینٹ پطرس سیموئیل سے لے کر مسیح تک سارے نبی اس پیشگوئی کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ اور بقول سینٹ پطرس اس ''موسیٰ جیسے نبی'' نے مسیح کی آمدِ ثانی سے پہلے آنا تھا۔'' (اعمال باب تین)

''اب اگر اس ''موسیٰ جیسے نبی'' نے مسیح کی آمدِ ثانی سے پہلے آجانا تھا تو ظاہر ہے مسیح نے آکر اُس ''دوسرے موسیٰ'' کی پیروی کرنی تھی نہ کہ پہلے موسیٰ کی۔ اور اُس ''دوسرے موسیٰ'' کی شریعت کو قائم کرنا تھا نہ کہ ''پہلے موسیٰ'' کی شریعت کو۔ اور پھر ''پہلے موسیٰ'' کی شریعت نہ تو ساری دنیا کو مخاطب کرتی ہے، نہ ہی محفوظ موجود ہے۔ ہر عیسائی فرقہ نے اپنے مطلب کے مطابق بائبل کے version بنا لیے ہیں۔ اس بائبل کو لے کر مسیح ساری دنیا پر حکومت کیسے کرے گا۔ ان حالات میں اگر خدا نے اُس ''موسیٰ جیسے نبی'' کے ذریعہ ایک ''نئی بائبل'' قرآن کی شکل میں دے دی ہے جس کے ذریعہ مسیح آمدِ ثانی میں ساری دنیا کی اصلاح کر سکے تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔''

میری بات سنتے ہی پرنسپل نے نفی میں سر ہلایا اور بولا: ''نہیں نہیں۔ آمدِ ثانی میں مسیح کی بادشاہت ساری دنیا پر حاوی ہو گی۔ ایک عالمگیر شان و شوکت کے ساتھ آئے گا۔ کسی خاص فرقہ یا مذہب سے تعلق نہ ہوگا۔''

میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: ''آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ''پہلی آمد'' کے وقت بھی یہود کا یہی اعتقاد تھا۔ اور اب تک ہے کہ مسیح داؤد کی طرح بادشاہ ہوگا۔ اور داؤد کے تخت پر بیٹھے گا لیکن مسیح نے یہ کہہ دیا کہ ''میری بادشاہت آسمانی'' ہے اور یہود کے سارے خواب وخیال خاک میں مل گئے۔''

''یقیناً آمدِ ثانی میں مسیح کی بادشاہت عالمگیر ہوگی اور بڑی عظیم شان وشوکت کیساتھ آئے گا۔ لیکن یہ عظمت اس کی ''آسمانی بادشاہت'' کو ''زمینی نہیں'' بنا دیتی۔ اس کی بادشاہت کی نوعیت سمجھنے میں ہمیں یہود کی طرح غلطی نہیں کرنی چاہیے۔''

پھر میں نے پوچھا ''کیا آپ کو علم ہے کہ مسیح کی ''آمدِ اوّل'' اور ''آمدِ ثانی'' میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں ''آمدِ اوّل'' میں مسیح کی بادشاہت کمزور اور محدود سی تھی اور کیوں ''آمدِ ثانی'' میں وہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ ایک عالمگیر بادشاہ کے طور پر آئے گا؟''

اس نے وضاحت کی کہ دنیا کے حالات کا تقاضا ہی کچھ ایسا تھا۔ میں نے کہا ''پہلی آمد میں مسیح موسیٰ کے پیروکار تھے۔ اور موسیٰ کی شریعت کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ موسیٰ صرف ایک قوم بنی اسرائیل کے نبی تھے اور ان کی شریعت اُسی قوم کے لیے تھی۔ اسی لیے مسیح نے بھی کہا کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ لیکن آمدِ ثانی میں مسیح ''موسیٰ ثانی'' محمد کے پیروکار کے طور پر آئے ہیں اور محمد کی شریعت کو قائم کرنے کے لیے بھیجے گئے اور اگر آپ قرآن پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محمد ساری دنیا کے لیے بھیجے گئے ہیں اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کا پیغام دائمی، ابدی اور

عالمگیر ہے۔لہٰذا آمدِ ثانی میں مسیح کی بادشاہت عالمگیر ہے اور کہیں زیادہ شان وشوکت کی حامل ہے۔ میں نے کچھ ٹھہر کر کہا:

''یہ جو دونوں مسیح ہیں یہ اپنی طاقت اور شان اُس شریعت سے حاصل کرتے ہیں جس پر یہ عمل کرتے ہیں اور جس کو یہ قائم کرنے آئے ہیں اور پھر اُس نبی سے حاصل کرتے ہیں جس کے یہ مطیع ہوتے ہیں۔ جو فرق ان دونوں کے شارع نبیوں اور شریعتوں میں ہے وہی فرق ان کی شان وشوکت اور بادشاہت میں ہے۔''

وقت بہت ہو چکا تھا میں نے جماعت کا تعارف کراتے ہوئے اس کو بتایا کہ مسیح ظاہر ہو چکا ہے اور وہ آپ کی calculations کے عین مطابق ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوکر ۱۸۴۴ء میں آٹھ نو سال کا تھا۔اور ہم ساری دنیا میں اُس کے مشن کو پھیلا رہے ہیں اور امریکہ میں بھی ہمارے مشن ہیں۔تعجب ہے کہ آپ کو علم نہیں۔

اُس نے مجھے اپنے فرقہ کے آغاز سے متعلق ایک کتاب دی جس کا نام ہے''The Great Controversy'' کتاب پر اس نے اپنا نام لکھا''Paster Stynman A.S.W.A [1]'' یہ کتاب بہت ایمان افروز ہے۔اس میں عیسائیت کے آغاز اور عروج اور پاپائیت کے ظلم وستم کی تاریخ درج ہے۔مسٹر مِلر کا دانیال نبی کی پیشگوئیوں سے مسیح کی آمدِ ثانی کا حساب کتاب اور آمد کا سال ۱۸۴۴ء نکالنا تفصیل سے درج ہے۔آمدِ ثانی سے متعلق نشانیوں کو بیان کرکے ان کا پورا ہونا بیان کیا گیا ہے۔اور یہ بھی کہ کس طرح اس زمانے میں دنیا کے دُور دراز ملکوں میں شدّت سے مسیح کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔

''وقت تھا وقت مسیحا نہ کسی اور کا وقت　　میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا''

رخصت لینے سے پہلے میں نے اس سے کہا:''میں نے آپ کی لائبریری دیکھی ہے۔اس میں اسلام پر کوئی کتاب نہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں انگلش ترجمہ کے ساتھ قرآن اور کچھ لٹریچر لائبریری کے لیے پیش کروں۔''اس نے خوشی کے ساتھ مجھے اجازت دے دی۔

1 - Advent Seminary of West Africa

دو تین ہفتہ کے بعد میں لٹریچر لے کر گیا۔ساتھ میں مربی سلسلہ مقیم اجی بواوڈے کو بھی لے کر گیا۔(غالباً مکرم عزیز شاہ صاحب تھے۔ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔) جب ہم وہاں پہنچے تو پرنسپل نے کہا کہ امریکہ سے ہمارا''بورڈ آف گورنرز'' آیا ہوا ہے بہتر ہوگا آپ یہ لٹریچر اُن کو پیش کریں۔چنانچہ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا۔جب ممبران بورڈ آئے اور دفتر میں بیٹھ گئے تو پرنسپل نے ہمارا تعارف کرایا۔ہم نے لٹریچر پیش کیا اور پھر ہر ممبر کو بھی جماعتی لٹریچر کا سیٹ پیش کیا۔اور جماعت کے بارے میں چھوٹی سی تعارفی تقریر بھی کی۔

پرائمری اور ہائی سکول-عیسائیت پھیلانے کا اہم ذریعہ

نائیجیریا میں جا کر میں نے دیکھا کہ تعلیمی نظام جو انگریز کے زمانے سے چلا آ رہا تھا، عیسائیت پھیلانے کا بڑا ذریعہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے پرائمری سکولوں میں بھی بڑے بڑے گرجے بنے تھے۔اُن سکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل اکثر پادری ہوتے

تھے۔طلباء کی اسمبلی،اعلانات اور اُن سے خطابات وغیرہ انہی گرجوں میں ہوتے تھے۔''بائیبل نالج''ایک لازمی مضمون تھا۔اس ماحول کے زیر اثر مسلمان لڑکے عیسائیت کی طرف مائل ہوتے اور پھر آہستہ آہستہ خود بخود''رضامندی'' سے اس کو قبول کر لیتے۔

کئی عیسائی دوستوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ اُن کے والدین اب بھی مسلمان ہیں۔وہ خود سکول گئے اور وہاں سے عیسائی بن کر نکلے۔بعض نے کہا کہ ان کا تاثر تو یہ تھا کہ اسلام جاہل اور پسماندہ لوگوں کا مذہب ہے۔اور تعلیم یافتہ انسان جس طرح اپنا رہن سہن بدلتا ہے، بہتر لباس، سوٹ بوٹ پہنتا ہے اسی طرح اس کو عیسائیت قبول کر لینی چاہیے کیونکہ یہ ماڈرن مذہب ہے۔جو والدین اسلام سے محبت رکھتے تھے اور اپنے بچوں کا ایمان بچانا چاہتے تھے وہ یا تو بچوں کو سکول میں داخل ہی نہ کراتے تھے یا پھر دو چار سال پڑھا کر اُٹھا لیتے۔نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے حالانکہ آبادی کے لحاظ سے یہ اکثریت میں تھے۔

جب میں''اکارے'' گیا تھا اور بچوں کو مختلف سکولوں میں داخل کرایا تو اس صورتحال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں ایک پادری سے میری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔وہ ایک حادثے میں معذور ہو گیا تھا اور زیادہ تر وہ گھر پر ہی ہوتا تھا۔میں وہاں گیا تو اس نے ایک احمدی دوست کے ذریعہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔چنانچہ میں گیا تو میں نے اسے اچھا سلجھا ہوا اور حقیقت پسند انسان پایا۔جب تک میں اکارے میں رہا ہماری ملاقاتیں جاری رہیں۔اسلام اور عیسائیت کے درمیان جتنے بھی اختلافی مسائل ہیں۔باری باری زیر بحث آتے رہے۔ہم ہفتہ میں دو تین بار ملتے۔دو گھنٹہ گفتگو کرتے اور ایک دوسرے کو Home Work دے کر اگلی ملاقات کا وقت مقرر کر لیتے۔

جن دنوں ہم''اسلامی جنگوں'' اور''اسلام کے تلوار'' کے زور پر پھیلنے کا موضوع زیر بحث لائے ہوئے تھے۔ایک روز جاتے ہی میں نے اس سے کہا:''ریورنڈ! اگر ایک عیسائی شخص اپنے انتہائی بیمار بچے کو ایک مسلمان ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے لے جائے اور ڈاکٹر یہ کہے کہ وہ بچے کا علاج تو کر دے گا لیکن اس کے لیے اس کو اسلام قبول کرنا ہوگا تو ایسے ڈاکٹر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا اور کہا''اوہ نہیں ڈاکٹر! ایسا کمینہ کوئی ڈاکٹر نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک باپ کو یہ''چوائس'' دے کہ وہ اپنے بچے کی زندگی اور اپنے ایمان کے درمیان ایک چیز کا انتخاب کرے۔''

میں نے کہا صحت کے بعد انسانی بنیادی ضرورتوں میں تعلیم آتی ہے۔تعلیم کے بغیر انسان حیوان ہی رہتا ہے۔اور عیسائیوں نے مسلمان والدین کو یہ''چوائس'' دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ایمان اور تعلیم میں سے ایک چیز کا انتخاب کریں۔پھر میں نے بتایا کہ کس طرح سکولوں میں گرجوں، پادریوں اور''بائیبل نالج'' کے ذریعہ آپ لوگ مسلمان بچوں کو عیسائی بناتے رہے ہیں۔اور جن والدین نے بچوں کا ایمان بچایا وہ تعلیم سے محروم رہ گئے۔

میری بات سن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا:''تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر! ایسا ہی ہوتا رہا ہے بلکہ انگریز کے زمانے میں تو

لیگوس کے بعض سکولوں میں داخلے سے پہلے ہی ''کرسچن نام'' رکھنا ضروری ہوتا تھا۔''

میں نے قدرے جذباتی انداز میں اُس سے کہا ''آپ کہتے ہیں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ یہ ہے وہ طاقت اور تلوار جس کے زور سے آپ لوگوں کے ایمان بدلتے رہے ہیں، عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ مجھے یہاں ایک بھی ایسا عیسائی نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد عیسائیت اور اسلام کا موازنہ کر کے عیسائیت کو قبول کیا ہے۔ جو بھی ملا اُس نے یہی کہا کہ اس نے سکول میں عیسائیت قبول کر لی تھی۔ یہ تبلیغ نہیں ''بلیک میلنگ'' ہے۔'' پھر میں نے کہا: ''انگریز نے ہم پر بھی حکومت کی ہے۔ انڈیا بھی برٹش کالونی رہا ہے۔ لیکن وہاں عام سرکاری سکولوں میں نہ چرچ ہوتے تھے نہ پادری۔ نہ ہی ''بائیبل نالج'' کا مضمون تھا۔ شاید اس لیے کہ وہاں اسلام اور ہندو مذاہب بہت مستحکم تھے اور عام سکولوں میں ایسا کرنے کی انگریز نے جرأت نہ کی۔ البتہ بعض ''مشن سکولز'' تھے جن میں یہ عیسائی ماحول تھا۔''

اس کے بعد اس موضوع پر اس نے پھر کوئی بات نہ کی۔ دیگر اختلافی موضوعات پر بھی اس کی مکمل تسلّی ہو گئی تھی۔ میں نے اجی بواوڈے آ کر بھی خط و کتابت اس سے جاری رکھی۔ اور میں نے دیکھا کہ خط میں کسی مسئلہ پر بحث کے دوران جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لکھتا تو ساتھ Peace be on him لکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق نہ صرف اس کے اعتراضات دُور ہو چکے تھے بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کا بھی قائل ہو چکا تھا۔

اس نے احمدی اور غیر احمدی مسلمان کے فرق کو بھی جاننے کی کوشش کی کیونکہ اس کے غیر احمدی دوست اس سے احمدیت کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ وفات مسیح اور ختم نبوت پر بھی اس نے اچھی مہارت حاصل کی اور جماعت کے قیام، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی، صداقت اور نظام خلافت پر بھی ہم نے گفتگو کی اور وہ بہت متاثر تھا۔

اکارے سے روانگی سے قبل جب میں اس سے ملنے گیا تو اس نے ایک کتاب مجھے دے کر کہا ''اگر تم پاکستان جاؤ تو خلیفہ صاحب سے درخواست کرنا کہ وہ اس کتاب پر دستخط کر دیں۔ میں تبرک کے طور پر رکھوں گا۔''

چنانچہ ۱۹۷۸ء میں جب میں گیا تو حضور رحمہ اللہ سے ملاقات کے دَوران میں نے وہ کتاب پیش کر کے پادری کی خواہش کا ذکر کیا۔ حضور نے اپنی الماری سے اپنے خطابات پر مشتمل ایک کتاب نکالی اور اس پر دستخط کے ساتھ اس کے لیے وہ کتاب عنایت فرمائی۔

نائیجیریا واپس آ کر کچھ عرصہ بعد مجھے اکارے کی طرف جانے کا اتفاق ہوا تو میں اس سے ملنے گیا اور کتاب پیش کی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ اُن دنوں بیمار تھا اور انگریز نرسیں اس کے علاج کے لیے آتی تھیں۔ میرے بیٹھے نرسیں آ گئیں۔ میں نے پادری سے اجازت لی اور اس کے تکیہ کے نیچے ایک لفافہ میں کچھ رقم رکھ دی۔ اس نے فوراً لفافہ اُٹھایا، رقم نکال کر نرسوں سے کہا ''دیکھو دیکھو میرے دوست نے مجھے کیا دیا ہے۔'' ایک نرس بولی ''ہم تو یہ سمجھی تھیں کہ تمہارا دوست مسلمان ہے۔'' اس نے کہا

''ہاں ہاں یہ مسلمان ہے۔But he is a muslim with a difference'' پھر اس نے نرسوں کو جماعت اور ہماری ملاقاتوں کا بتایا۔اس کا نام تھا Rev. Dayo Bawaje۔کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسی بیماری میں فوت ہو گیا تھا۔اللہ تعالیٰ اس سے رحمت کا سلوک فرمائے۔

اکارے کا کیتھولک مشن اور گرلز سکول

اِکارے میں کیتھولک مشن اچھا بڑا تھا۔ایک ''آئرش فادر'' انچارج تھا۔دو تین دفعہ یہ ''فادر'' میری کلینک آیا۔ایک دفعہ آیا تو ایک یہوواوٹنس بائیبل کے حوالے سے آدم اور حوا کے قصہ پر مجھ سے بحث کر رہا تھا۔فادر نے آتے ہی پوچھا:

''کیا بحث ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا ''یہ کہہ رہا ہے کہ یہ آدم اور حوا کا قصہ لفظاً لفظاً سچ ہے۔''

فادر نے بے ساختہ کہا ''Is it?''

اس یہوواوٹنس نے جواباً کہا ''Yes it is.''

پھر اُن دونوں کی آپس میں بحث شروع ہو گئی اور میں سنتا رہا۔جب یہوواوٹنس نہ مانا تو بالآخر فادر نے اس سے کہا ''اچھا یہ بتاؤ کہ بائیبل میں لکھا ہے کہ ''خدا باغ میں چلتا تھا'' اور اس کے قدموں کی آواز آدم نے سنی اور وہ چھپ گیا۔'' خدا کی کتنی ٹانگیں ہیں جن سے وہ چلتا ہے اور کتنی آنکھیں ہیں۔کیا ہماری طرح صرف دو ٹانگیں ہیں اور نظر اتنی کمزور ہے کہ آدم اس سے چھپ گیا؟''

یہوواوٹنس سے کوئی معقول جواب نہ ملا تو فادر نے کہا ''کیوں بائیبل کو مذاق بناتے ہو۔یہ سب تمثیلی زبان ہے۔''

پھر ایک دفعہ میں ''فادر'' سے ملنے مشن ہاؤس گیا۔کچھ دیر بائیبل پر بات ہوتی رہی۔میرے پاس پروٹسٹنٹ بائیبل تھی۔فادر نے مجھے کیتھولک بائیبل دی اور کہا:

''اس میں سات کتابیں زائد ہیں۔پڑھ لینا اچھی کہانیاں ہیں لیکن ساری سچی نہیں ہیں۔''

میں اِن ''فادرز'' کو بڑا کٹر سمجھتا تھا لیکن ان ایک دو ملاقاتوں سے مجھے احساس ہوا کہ ان کے ''اُوپر کے'' طبقہ کے لوگ سب سمجھتے ہیں کہ عیسائیت کی حقیقت کیا ہے۔اپنے عوام کے لیے اُن کا معیار الگ ہے۔

ماؤنٹ کارمل گرلز ہائی سکول

یہ اس کیتھولک مشن کا اکارے میں بڑا مشہور ادارہ تھا۔اس میں انگریز Nuns پڑھاتی تھیں۔ایک روز دو Nuns استانیاں علاج کے لیے میری کلینک آئیں۔علاج کے بعد میری اہلیہ نے ان کو اُوپر چائے پر بلا لیا۔تھوڑی دیر بعد میں بھی پہنچ گیا۔یہ عیدالضحیٰ سے دوسرا دن تھا اور ہم نے اُن کو قربانی کا گوشت پیش کیا۔گوشت کھاتے میں نے قربانی کا ذکر کیا اور یہ بھی کہ ہم یہ قربانی حضرت ابراہیم کی اپنے بیٹے اسماعیل کی قربانی کی یاد میں کرتے ہیں۔

اس پر اُن میں سے ایک نے جو سکول کی پرنسپل تھی، بڑی تحدّی کے ساتھ کہا:

''نہیں نہیں، وہ بیٹا تو اسحاق تھا۔ اسماعیل ابراہیم کا اصل بیٹا نہ تھا کیونکہ اس کی ماں ''لونڈی'' تھی۔''

میں نے کچھ دیر ٹھہر کر نرمی سے کہا: ''میڈم! آپ جو چاہیں کہہ سکتی ہیں لیکن بائیبل تو کہتی ہے کہ اسماعیل کی ماں، ابراہیم کی بیوی تھی۔'' اس پر وہ پرنسپل بڑے جوش اور وثوق سے بولی: ''نہیں، ہرگز نہیں، یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ بائیبل سے یہ دکھا دیں تو میں اپنی گردن کٹوا دوں گی۔'' میں پھر کچھ دیر ٹھہر کر آہستہ سے اُٹھا اور بائیبل لا کر پیدائش باب ۱۶ کی آیات تین و چار پڑھنے کو کہا اس نے آیات پڑھیں۔ پھر پڑھیں۔ پھر اس نے سیاق وسباق پڑھا۔ پھر اس نے کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا کہ واقعی یہ بائیبل ہے۔ بالآخر اس نے کتاب مجھے واپس دیتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر تم جیت گئے۔'' (Dr. You win)

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر کہا: ''اور وہ گردن کا کٹوانا؟'' اس پر سب کھُل کر ہنس پڑے۔

کیتھولک سکول میں بیٹی کا داخلہ

چند ماہ بعد ہی پرنسپل ایک روز کلینک آئی اور کہا کہ ان کی ایک ٹیچر بیمار ہے۔ میں چل کر دیکھوں۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ واپسی پر میں نے سکول کے کمپاؤنڈ، بلڈنگ وغیرہ کی تعریف کی تو پرنسپل نے پوچھا: ''تمہاری کوئی بیٹی ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں میری ایک بیٹی ہے۔ لیکن اُس نے تو ابھی پرائمری کی چوتھی کلاس پاس کی ہے۔ ایک دو سال کے بعد ہی ہائی سکول میں آئے گی۔''

اس پر پرنسپل نے وضاحت کی ''نہیں، یہ ضروری نہیں کہ وہ پرائمری کی ساری کلاسز پوری کرے۔ ہم داخلے کا امتحان لیتے ہیں۔ جو لڑکی اس امتحان میں پاس ہو جائے اس کو داخل کر لیتے ہیں۔''

پھر اس نے کہا ''داخلے تو ہمارے ہو چکے ہیں لیکن کچھ سیٹیں خالی ہیں۔ لہٰذا ہم داخلے کا سپلیمنٹری امتحان لے رہے ہیں اگلے ہفتہ۔ تم اپنی بیٹی سے کہو کہ وہ امتحان دے۔''

میں نے بیٹی سے کہا۔ اس نے امتحان دیا اور میں دو روز بعد نتیجہ پتہ کرنے گیا تو پرنسپل نے کہا ''تمہاری بیٹی تو بہت سی لڑکیوں سے بہتر ہے۔ اس کو داخل کر لیا ہے۔''

میں نے پرنسپل کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اپنی ایک ذہنی خلش کا بھی اظہار کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے سکول کی یونیفارم میں لڑکیاں صرف فراک پہنتی ہیں جبکہ میری بیٹی پرائمری سکول میں بھی شلوار قمیض پہنتی رہی ہے۔ اور اب امتحان دینے بھی اسی لباس میں آئی تھی۔ کیا آپ اجازت دیں گی کہ وہ یہی لباس پہنتی رہے۔

میری بات سن کر پرنسپل کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ بولی کہ سکول کی یونیفارم ہے۔ ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ تم اسلام کی وجہ سے کہہ رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ صرف اسلام ہی نہیں، کلچر کا بھی معاملہ ہے۔ ہمارے ملک میں عیسائی لڑکیاں بھی صرف فراک نہیں پہنتیں۔

پھر کچھ دیر سوچ کر پرنسپل نے کہا: ''ڈسپلن بھی سکول کا رکھنا ہے۔ ادھر ہم والدین کے جذبات بھی مجروح نہیں کرنا

چاہتے۔ یوں کرتے ہیں کہ وہ ہمارا فراک بھی پہن لے اور ساتھ پاجامہ پہن لے۔''

میں نے فوراً اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک بڑا اہم مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ دوسرا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے یوں حل کیا کہ پرنسپل نے خود ہی مجھ سے پوچھا: ''کیا تم پسند کرو گے کہ وہ بائبل کی کلاس اٹینڈ کرے۔''

میں نے فوری طور پر نفی میں جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا ''یوں تو میں بائبل کے پڑھنے کے خلاف نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں بائبل میرے پاس ہے اور میں اس کو پڑھتا ہوں۔ مجھے صرف وہ کتابیں دکھا دیں جو بائبل نالج کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔''

پرنسپل نے مجھے دو کتابیں الماری سے نکال کر دے دیں۔ ہفتہ دس دن کے بعد میں پرنسپل سے ملا اور کہا ''میں نے یہ کتابیں دیکھی ہیں۔ پڑھنے میں حرج تو نہیں لیکن ایک مسئلہ ہے۔ میری بیٹی نے گھر پر کچھ مذہبی تعلیم حاصل کی ہے۔ اب اگر اس سے مختلف مذہبی تعلیم اس کو ملی تو وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اس عمر میں مذاہب کے اختلافی پہلوؤں کو سمجھ نہ سکے گی۔'' ہوسکتا ہے وہ سکول میں ٹیچر سے کوئی ایسی بات پوچھ لے جس کا جواب دینا ٹیچر کے لیے مشکل ہو، یا پھر گھر آ کر مجھ سے کوئی ایسی بات کہہ دے جس کا جواب میرے لیے مشکل ہو جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں کسی طالب علم سے یہ کہوں کہ تمہارا استاد غلط کہتا ہے۔ استاد کی ہمارے معاشرہ میں بہت عزت اور بلند مقام ہوتا ہے۔''

میری باتیں سنتے ہی پرنسپل نے ہاتھ کھڑا کیا اور کہا ''بس۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ بائبل کلاس سے الگ رہے۔'' میں نے بیٹی سے کہہ دیا کہ تمہارے لیے بائبل کلاس ضروری نہیں۔ ویسے تم کلاس میں بیٹھی رہنا چاہو تو بیٹھ سکتی ہو، سن سکتی ہو کہ کیا کہتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ کیتھولک تو نرے بُت پرست ہوتے ہیں۔ کلاس روم میں مجسمے لٹکائے ہوئے ہیں۔ احتیاطاً میں نے بیٹی کو بتا دیا تھا کہ یہ مسیح کے ''Son of God'' ہونے پر بہت زور دیتے ہیں۔ مختلف حیلوں بہانوں سے اسی بات کو دہراتے رہتے ہیں حالانکہ مسیح اپنے آپ کو ہمیشہ Son of Man کہتا تھا۔ پھر میں نے بائبل سے چند حوالے اس کو دکھا دیئے جہاں مسیح نے اپنے آپ کو ابن آدم کہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد بیٹی کو ان حوالوں کو استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک روز وہ آئی تو بتایا کہ آج کلاس سے باہر ہم چند لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں کہ ایک نے کہا کہ مسیح ''خدا کا بیٹا'' تھا۔ میں نے کہا کہ نہیں وہ ''ابنِ آدم'' تھا۔ جب کلاس ہوئی تو اُس لڑکی نے اُٹھ کر استاد سے کہہ دیا کہ حبیبہ کہتی ہے کہ مسیح ''خدا کا بیٹا'' نہیں تھا۔ اُستاد نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے ایسا کہا ہے'' میں نے اُٹھ کر جواب دیا ''لیس سر۔ کیونکہ میں نے بائبل میں پڑھا ہے کہ مسیح اپنے آپ کو ہمیشہ ابنِ آدم کہتا تھا۔'' استاد میرا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔

سکول کا تعلیمی سال ختم ہونے کو تھا کہ ایک روز بیٹی آئی اور آتے ہی دھیمی اور افسردہ آواز میں مجھے بتایا ''آج میری کلاس کی پانچ چھ مسلمان لڑکیوں نے سکول کے چرچ میں بپتسمہ لے لیا ہے۔''

یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۸۰ء کے قریب صورتحال کچھ تبدیل ہونے لگی تھی۔ اسلامیات کے استاد بھی حکومت کی طرف سے بھرتی ہو کر آنے لگے تھے۔ اور اسلامیات کا مضمون بعض سکولوں میں شروع ہو گیا تھا۔ البتہ ''مسلم سکول'' تو پہلے ہی بعض شہروں میں موجود تھے۔ مگر خال خال تھے ایسے شہر اور اجی بواوڈے ان شہروں میں سے ایک تھا۔ یہاں لڑکوں کا مسلم سکول بھی تھا اور لڑکیوں کا بھی۔

مسلم گرلز ہائی سکول - اجی بواوڈے

اکارے میں رہتے ہوئے مجھے معلوم تھا کہ اجی بواوڈے میں ایک مسلم گرلز ہائی سکول ہے۔ اور اکارے سے اپنے تبادلہ کے لیے jos کی بجائے Ijebu-Ode کا جب میں نے انتخاب کیا تو اس کی ایک وجہ اس سکول کا وہاں ہونا بھی تھا۔ حضور رحمہ اللہ کی خدمت میں جو درخواست میں نے اپنے تبادلہ کے لیے ارسال کی تھی اس میں بھی میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ اجی بواوڈے میں مجھے اپنی بیٹی کے لیے مسلم گرلز سکول میسر آ جائے گا۔

یہ سکول ہمارے لیے رحمت ثابت ہوا۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ ایک مسلم سکول تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کی پرنسپل ایک نہایت مخلص اور فدائی احمدی خاتون تھیں۔ یہ شہر کے علمی حلقوں میں عموماً اور مسلم حلقوں میں خصوصاً بہت عزت واحترام سے دیکھی جاتی تھیں۔ شہر کی مسلم کونسل کی ممبر تھیں اور مسلمانوں کی بہبود اور اسلام کی سربلندی کا کوئی موقع یہ ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ جب میں اس شہر میں گیا تو اُن کا وجود میرے بیوی بچوں کے لیے بڑا سہارا تھا۔ اُن کے علم وفضل سے بھی ہم نے استفادہ کیا۔ نو وارد کی حیثیت سے میں ان سے مشورہ کرتا اور رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ آٹھ دس سال تک ہم وہاں اکٹھے اس شہر میں رہے اور بہت اچھا وقت گزارا۔

ان کا نام نامی ہے پروفیسر امۃ المجید چودھری۔ نائیجیریا ملازمت کے بعد یہ لندن آ گئی ہیں اور یہاں جماعت کی جو علمی اور ادبی خدمات انہوں نے برسوں سرانجام دیں ان سے احبابِ جماعت بخوبی واقف ہیں۔ آج کل یہ لندن میں اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ نومبر ۲۰۰۹ء میں خاکسار کی اہلیہ کی وفات پر انہوں نے فون پر مجھ سے اور میری بیٹی سے تعزیت کی اور دیر تک اس دَور کی باتیں کرتی رہیں جو ہم نے نائیجیریا میں اکٹھے گزارا تھا۔ اور پھر فرمایا اور بجا طور پر فرمایا کہ وہ دَور زندگی کا گولڈن دَور تھا۔ اللہ تعالیٰ پروفیسر چودھری صاحبہ کی صحت وزندگی میں بہت برکت بخشے۔

نو سال بعد بھائی سے ملاقات

۱۹۷۸ء میں جب میں سات سال بعد چھٹی پر پاکستان گیا تو میرا چھوٹا بھائی عبدالمنان بھٹہ نصرت جہاں سکیم کے تحت

وقف کر کے مع فیملی سیرالیون جا چکا تھا۔ وہاں وہ احمدیہ سکول کے پرنسپل کے طور پر کام کرتا رہا اور پھر وقف پورا کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں نائیجیریا آ گیا۔ اس طرح نو سال بعد بھائی سے ملاقات ہوئی۔ خدا کے فضل سے اس کو مسلم گرلز ہائی سکول میں اور اہلیہ کو ثانی لُو با ہائی سکول میں ملازمت مل گئی اور اس کی بچیوں کو اس کے ہی گرلز ہائی سکول میں داخلہ مل گیا۔ اس طرح خدا کے فضل سے ہماری سوشل لائف اور بارونق ہو گئی۔

مسلم گرلز ہائی سکول میں سیرت النبی کا جلسہ اور میری تقریر

ایک دفعہ پروفیسر چودھری صاحبہ نے اپنے سکول میں جلسہ سیرت النبی منعقد کروایا اور مجھے اس میں تقریر کی دعوت دی۔ محترمہ نے مجھے عنوان دیا ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی Distinctions'' دوسرے غیر احمدی سٹاف نے ایک انڈین مولوی صاحب کو بھی بلانے پر اصرار کیا شاید اس لیے کہ ''بیلنس'' رہے۔

واضح رہے یہ انڈین مولوی صاحبان سرکاری سکولوں میں اسلامیات وغیرہ پڑھانے کے لیے مقرر ہوتے تھے اور شنید تھا کہ یہ سعودی عرب کے Sponsord ہوتے تھے۔ پڑھانے کے علاوہ ان کا اہم کام احمدیت کی مخالفت ہوتا تھا۔

میری تقریر کے بعد مولوی صاحب کی تقریر تھی۔ انہوں نے موضوع چھوڑ کر احمدیت کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ بقول اُن کے ایسے جلسے میں مجھے بلانا ہی توہین رسالت تھی۔ صاحبِ صدر نے دو دفعہ مولوی کو ٹوکا۔ پھر تیسری دفعہ پانچ منٹ بعد تقریر ختم کرنے کا کہا۔ مولوی صاحب تقریر ختم کرتے ہی جلسہ چھوڑ کر چلے گئے۔

پاکستان میں کلمہ مٹاؤ مہم اور سعودی عرب

''ڈاکٹر ایم۔اے۔اوعبدل'' ابادان یونیورسٹی میں شعبہ ''اریبک اینڈ اسلامک سٹڈیز'' سے منسلک تھے۔ اسلامیات پر کئی کتابوں کے مصنف تھے اور عرب دنیا میں اپنے ملک کے نمائندہ کے طور پر جانے جاتے تھے۔ پاکستان میں ایک ''سیرت کانفرنس'' میں بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ شہر ''اجی بواوڈے'' کے رہنے والے تھے اور میں کبھی کبھی ''ویک اینڈ'' پر اُن سے ملنے ان کے ہاں جاتا تھا۔ احمدیت کے بارے میں اچھا تاثر رکھتے تھے۔

ایک دفعہ میں ان سے ملنے گیا تو میرے ہاتھ میں جماعتِ احمدیہ نائیجیریا کا ہفتہ وار اخبار The Truth تھا جس کے پہلے صفحہ پر پاکستان میں احمدیہ مسجد گرانے اور کلمہ مٹانے کی خبر مع تصویر چھپی تھی۔

''ڈاکٹر عبدل'' نے اخبار دیکھا تو بولے:

''ایسی خبریں میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ پتہ نہیں ان پاکستانیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ایسے گھناؤنے کام کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ کا کلمہ مٹانا سمجھ سے باہر ہے۔''

پھر وہ کچھ سوچ کر بولے:

''میرے خیال میں اس مہم کے پیچھے سعودی عرب کا ہاتھ ہے۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا:

''سعودی عرب ایسی بُری حرکات کیسے کرواسکتا ہے۔کلمہ اس کے جھنڈے پر لکھا ہوا ہے۔وہ تو کلمے کا محافظ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا:

''مصیبت یہ ہے کہ لوگ ان عربوں کو''مذہبی'' سمجھتے ہیں۔میں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے۔یہ جو Millions ڈالر ہمارے ملکوں میں خرچ کر رہے ہیں۔یہ سب سیاست ہے۔میں نے آج تک کسی عربی کو ایک ڈالر بھی خالص خدا کی خاطر خرچ کرتے نہیں دیکھا۔''

میں اُن کی بات سن کر خاموش رہا۔پھر وہ خود ہی بولے:

''آپ لوگوں نے پاکستان میں اپنے شہر ربوہ میں ایک بہت بڑی مسجد بنائی ہے۔''

میں نے کہا:''مسجدیں تو ہماری وہاں بہت سی ہیں اور''مسجد اقصیٰ''اچھی بڑی ہے لیکن میرے خیال میں وہ ایسی بڑی تو نہیں کہ اس پر تعجب کا اظہار کیا جائے۔''

اس پر ڈاکٹر عبدل نے کہا:

''نہیں،تمہیں علم نہیں۔وہ بہت بڑی مسجد ہے اور میں ایک دفعہ سعودی عرب گیا تو وہاں اس کی تعمیر پر تشویش کا اظہار ہوتے دیکھا تھا۔''

اپنے''بڑے بھائی کے نام خط''میں اکارے کے حالات لکھتے ہوئے میں نے ذکر کیا ہے کہ ابادان یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے جماعت کے خلاف ایک مضمون اخبار میں شائع کروایا تھا۔اور یہ بھی میں نے لکھا ہے کہ میں نے بھی ایک جوابی مضمون اسی اخبار میں لکھا تھا۔وہ پروفیسر احمدی تھا۔اور اس کے اِرتداد کے پس منظر میں بھی''سعودی عرب'' کارفرما سنا گیا تھا۔

یونیورسٹی کے دوسرے احمدی احباب سے جن میں سے ایک دو تو اُسی شعبہ میں کام کرتے تھے۔سنا تھا کہ سعودی عرب نے مسجد وغیرہ کے لیے کئی ملین ڈالر امداد کی پیشکش کی تھی لیکن ساتھ ہی یہ اعتراض بھی دبی زبان سے کیا تھا کہ شعبہ کا انچارج تو قادیانی ہے۔بس پھر کیا تھا، پروفیسر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔استخارہ کیا،تہجد پڑھی اور بقول اُن کے استخارہ کرتے ہی ان پر ''حق'' منکشف ہو گیا اور وہ سیدھے اپنی ٹیبل پر گئے اور جماعت کے خلاف مضمون لکھنے لگے۔ڈالروں کی چمک دمک سے تو چاروں طبق روشن ہو جاتے ہیں یہ''حق'' بے چارہ کہاں چھپا رہ سکتا ہے۔ڈالروں کا سنتے ہی''روشن'' ہو گیا ہوگا۔تہجد اور استخارے کا تکلّف تو اس کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے تھا۔آخر سرزمینِ عرب سے آ رہا تھا یہ''حق'' بذریعہ چیک۔

غیر احمدی سٹیج سے تقریر

چودھویں صدی ہجری ختم ہوئی تو پندرھویں کے استقبال کے لیے دنیا بھر میں مسلمانوں نے مختلف قسم کے پروگرام ترتیب دیئے۔اجی بواوڈے شہر کے مسلمانوں نے بھی اسی سلسلہ میں ایک ہفتہ منایا۔ایک روز میں اپنے دفتر میں تھا کہ ایک نائیجیرین غیر احمدی دوست ملنے آئے۔وہ ایک سکول کے پرنسپل تھے۔انہوں نے بتایا کہ شہر کی مسلم کونسل نے نئی صدی کے استقبال کے لیے جو پروگرام ترتیب دیا ہے،اس میں ایک روز تقریریں ہوں گی۔جو دوعناوین تجاویز ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ہجرت کی اہمیت

۲۔چودھویں صدی سے متعلق آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں

اس دوست نے کہا کہ ''یہ پیشگوئیوں والے دوسرے موضوع پر تقریر کے لیے آپ کا نام تجویز ہوا ہے۔میں شہر کی مسلم کونسل کی طرف سے آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔''

میں نے حیران ہو کر کہا ''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں احمدی ہوں اور سنٹرل مسجد کا احاطہ تو جہاں یہ پروگرام ہو رہے ہیں، احمدیت کی مخالفت کا سنٹر ہے۔وہاں مجھے کون تقریر کرنے دے گا۔''

اس پر وہ دوست بولے ''ہمیں سب معلوم ہے۔اس کے باوجود کونسل کا یہ خیال ہے کہ اس موضوع پر آپ تقریر کریں۔آپ سے بہتر اس شہر میں کوئی نہیں جو اس موضوع کو ''ڈیل'' کر سکے۔آپ فکر نہ کریں، ہم ہر طرح سے پورا بندوبست کریں گے۔''

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔میں نے اُس سے کہا مجھے دو ایک دن سوچنے کے لیے دیں۔کچھ مشورہ بھی کرنا ہے۔مجھے یہ موضوع خاصا مشکل محسوس ہوتا تھا اور پھر اس طرح پبلک جلسہ میں تقریر کا تجربہ بھی نہ تھا۔میں نے سوچا کہ پروفیسر امۃ المجید چودھری صاحبہ اس کونسل کی ممبر ہیں اور یہ میرا نام ہو نہ ہو انہوں نے ہی دیا ہوگا۔چنانچہ میں اُن سے ملا اور شکایت کی کہ یہ آپ نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔

انہوں نے وضاحت کی کہ یہ تو درست ہے کہ عنوان میں نے تجویز کیا تھا لیکن تقریر کے لیے آپ کا نام کونسل کے ممبران نے ہی تجویز کیا ہے۔انہوں نے مجھے حوصلہ دیا کہ ہمت کریں، گھبرائیں نہیں نقصِ امن کا کوئی خطرہ نہ ہوگا۔

میں نے مکرم امیر صاحب سے رابطہ کر کے ساری صورتحال ان کو بتائی۔انہوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا کہ اگر انہوں نے مجھے بلایا ہے تو مجھے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔البتہ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ مجھے اُن کے اعتماد پر پورا اُترنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور اس نازک موضوع کو اس انداز سے Deal کرنا چاہیے کہ کسی شرارت کا موقع نہ ملے۔میں نے فیصلہ کیا کہ اس موضوع کو خالص Academicaly ڈیل کروں تو ٹھیک رہے گا۔

شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگ گئے جن میں ہفتہ بھر کے پروگرام درج تھے۔ اُن میں بطور مقرر میرا نام بھی درج تھا۔ کئی احمدی دوست ملے اور انہوں نے اور خاص کر میرے بھائی عبدالمنان بھٹہ نے قدرے تشویش کا اظہار کیا کہ ایسی نازک موضوع والی تقریر آپ کہاں کرنے جارہے ہیں۔ بہرحال میں نے سب کو تسلّی دلائی کہ میں احتیاط سے کام لوں گا جو اعتماد انہوں نے مجھ پر کیا ہے اُس کو مجروح نہیں کروں گا۔

میں نے احادیث اور سلسلہ کی کتب جو میسر آئیں اکٹھی کیں اور تیاری شروع کردی۔ آٹھ دس دن میں تقریر تیار ہوگئی۔ سب سے مشکل مرحلہ اُن پیشگوئیوں کا بیان تھا جن میں مسیح کی آمد کا ذکر ہے۔ اور جن میں مسیح کی آمد سے متعلق علامات مذکور ہیں، اگر اُن کا ذکر ایک نازک مرحلہ تھا تو دوسری طرف اُن کو چھوڑنا تقریر کو بے جان بنانا تھا۔ صاف ظاہر ہوجاتا کہ میں نے دانستہ اُن کا ذکر چھوڑا ہے کیونکہ یہ میرا گویا کمزور پہلو تھا۔ یارلوگ سوالوں کی بوچھاڑ کر کے مجھے پریشان کرسکتے تھے۔ چنانچہ میں نے مسیح کی آمد سے متعلق پیشگوئیوں کو کھل کر بیان کیا اور قدرے تشریح بھی کی۔

پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے کوئی اُٹھ کر یہ طنز کردے کہ ''آپ نے اور تو سب کچھ بیان کردیا وہ ''جھوٹے نبیوں، اور تیس دجّال'' والی پیشگوئی کیوں چھوڑ دی۔'' چنانچہ میں نے خود ہی اس کو بیان کر کے اُس کے پورا ہونے کا ذکر بھی کردیا۔

میں وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا تو ہال بھرا ہوا تھا۔ احمدی دوست بھی موجود تھے۔ ایک کونے میں ایک گروہ چند لوگوں کا بیٹھا تھا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ یہ سخت مخالف ہیں۔ خدا کے فضل سے میں نے اچھے اعتماد کے ساتھ تقریر کی اور بڑی خاموشی اور توجّہ کے ساتھ سنی گئی۔ تقریر ختم کر کے میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو اُسی گروہ میں سے ایک نے اُٹھ کر سوال کیا ''ڈاکٹر نے پیشگوئیاں بہت سی بیان کیں اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح پوری ہوگئیں لیکن ''مسیح کی آمد'' کے بارے میں پیشگوئیاں تو بیان کردیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ پوری ہوئی کہ نہیں۔ اور اگر پوری نہیں ہوئیں تو مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔''

صاحبِ صدر نے مجھے سوال کا جواب دینے کے لیے بلایا۔ میں سمجھ گیا کہ تقریر میں نے اختلافی پہلو بچا کر کی ہے اور اب مجھے اختلافی مسائل میں اُلجھانے کی کوشش ہورہی ہے۔ میں نے جاکر کہا ''حضرت مسیح کی آمد'' اور اُن کے ظہور سے متعلق علامات میں نے بیان کردی ہیں۔ گزشتہ سو سال میں مسلمان علماء متفقہ طور پر یہ کہتے رہے ہیں کہ اکثر علامات پوری ہوچکی ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ یہی ہے کہ ابھی تک حضرت مسیح کا ظہور نہیں ہوا۔ لیکن ایک جماعت احمدیہ ہے جو یہ مانتے ہیں کہ حضرت مسیح ظاہر ہوچکے ہیں اور وہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو مسیح موعود مانتے ہیں۔ پیشگوئیاں اور علامات جو احادیث میں مذکور ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اب یہ ہم سب پر فرض ہے کہ آگے بڑھ کر تحقیق کریں کہ سچ کیا ہے۔''

میں جواب دے کر سٹیج سے اُتر آیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اجلاس ختم ہوگیا۔ اکثر غیر احمدی احباب نے تقریر کی تعریف

کی اوراس کی کاپیاں مانگیں۔میں نے وعدہ کیا کہ کاپیاں کروا کر پہنچادی جائیں گی۔

اصل بات

چند دن بعد وہی غیر احمدی پرنسپل پھر ہسپتال میں مجھے ملنے آیا اور تقریر کو سراہا اور شکریہ ادا کیا۔اور پھر بولا کہ اب آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔اس نے کہا:''جب آپ کا نام کونسل میں تجویز ہوا تھا تو کئی ممبران نے سخت مخالفت کی تھی اُن کا یہ کہنا تھا کہ وہ ڈاکٹر کٹڑ قادیانی ہے۔وہ تقریر کرے گا تو ہمارے سٹیج کو اپنے قادیانی عقیدہ کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے گا۔ہم نے کہا تھا کہ نہیں۔وہ ایسا نہیں کرے گا۔چنانچہ بہت بحث کے بعد اس شرط پر آپ کا نام منظور ہوا تھا کہ اگر ڈاکٹر بھٹہ نے قادیانی عقیدہ کی بات کی تو اُن کو بھی اجازت دی جائے گی کہ وہ قادیانیت کے ردّ میں جوابی حملہ کریں۔''اس نے مزید بتایا کہ''جب آپ''مسیح کی آمدِ ثانی'' سے متعلق پیشگوئیاں بیان کر رہے تھے تو وہ اس تاک میں تھے کہ کب آپ اپنے عقیدہ کو بیان کریں اور کب وہ جوابی حملہ کریں لیکن آپ پہلو بچا کر نکل جاتے رہے اور ان کو موقع نہ ملا۔پھر جب انہوں نے ڈائریکٹ سوال کر کے آپ کو اس مسئلہ میں اُلجھانا چاہا تو آپ نے ڈپلومیٹک جواب دے کر ان کی اس کوشش کو بھی ناکام بنادیا۔ہم بہت مشکور ہیں کہ آپ نے ہمارا بھرم رکھا۔ہمارے اعتماد پر پورا اُترے اور موضوع کو خوب نبھایا۔''

پھر پرنسپل صاحب نے مطالبہ کیا کہ اس تقریر کی نقول اُن کو جلد مہیا کی جائیں کیونکہ بہت سے لوگ مطالبہ کر رہے ہیں۔میں نے وعدہ کیا کہ تقریر کی کاپیاں ان کو جلد مہیا کر دی جائیں گی۔آخر میں مَیں نے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور مجھے اپنے جلسہ میں شرکت کی دعوت دی۔

تقریر پر نظرِ ثانی - کتابی شکل میں اشاعت - جرمن ترجمہ

میں نے تقریر پر نظرِ ثانی کی اور وہ سب کچھ اس میں شامل کیا جو ابتداء میں وقت کی قِلّت یا موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر شامل نہ کر سکا تھا۔اب میں نے کھل کر لکھا کہ مسیح کی آمدِ ثانی کی پیشگوئیاں کب اور کیسے پوری ہوئیں اور کس طرح مسلمانوں نے پیشگوئیوں کے مطابق یہود کا کردار ادا کیا۔بعض دیگر اعتراضات کا ردّ بھی شامل کیا اور اسی طرح''ختمِ نبوت'' پر بھی ایک باب کا اضافہ کیا۔

دسمبر ۱۹۸۰ء میں نائیجیریا کے جلسہ سالانہ پر بھی مکرم امیر صاحب نے مجھے یہی تقریر کرنے کو کہا اور پھر بعد میں نائیجیریا مشن نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔میں نے اس طبع شدہ تقریر کی کاپیاں اُن غیر احمدی دوستوں تک پہنچا دیں اور بعض غیر احمدی پاکستانی اور انڈین دوستوں کے گھر جا کر میں خود پہنچا کر آیا۔اب میری یہ تقریر اُن کو اچھی نہ لگی۔یار لوگ ملنے سے کترانے لگے۔سوشل بائیکاٹ کی باتیں ہونے لگیں۔بعض نے تو میرے قتل کو جنت کے حصول کا ذریعہ قرار دے دیا۔

فروری ۱۹۸۴ء میں میری بیٹی شادی کے بعد جب جرمنی گئی تو وہ اس تقریر کی چند کاپیاں ساتھ لے گئی اور وہاں

امیر صاحب جرمنی مکرم عبداللہ واگس ہاؤزر صاحب کو بھی دی۔ محترم عبداللہ صاحب کو میری یہ تقریر اتنی پسند آئی کہ انہوں نے مجھے نائیجیریا خط لکھ کر اجازت طلب کی کہ وہ اس تقریر کا جرمن ترجمہ شائع کر سکیں۔ میں نے اجازت دی اور پھر ترجمہ کے دوران مجھ سے مترجم کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ جرمن ترجمہ کی دو کاپیاں مجھے نائیجیریا میں ہی مل گئی تھیں جن میں سے ایک کاپی میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں ملاقات کے دوران پیش کر دی مع انگریزی کتاب کے۔ جرمنی آ کر میں نے سَو کے قریب یہ کاپیاں خرید کر تبلیغ میں استعمال کیں۔ تقریباً بیس سال تک یہ کتاب ''جماعتی بک شاپس'' پر موجود رہی۔ بعض ترکی دوستوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسی کتاب کو پڑھ کر جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔

فالحمد للّٰہ علی ذالك۔ ربّنا تقبّل منّا انّك انت السّمیع العلیم۔

لندن 17/9

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم (3)

وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

مکرم محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا خط مورخہ 13 ستمبر ملا۔ الحمدللہ ہمارا اجیبواڈے کا ہسپتال منظور ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مکرم ڈاکٹر سعید صاحب کو احسن جزا دے کہ انکی وجہ سے یہ ہسپتال باقی تمام ہسپتالوں سے بجٹ میں آگے نکل گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق دیتا چلا جائے اور نائیجیریا جماعت کا خود حافظ و ناصر ہو۔

والسلام

مرزا ناصر احمد

خلیفۃ المسیح الثالث

چند ماہ قبل امیر صاحب پھر ایک دفعہ آئے اور ایک خط کی فوٹوسٹیٹ مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ''لواس کو فریم کرا کر رکھ لو'' یہ تو محض حضور کی ذرہ نوازی تھی کہ لکھ دیا۔ ورنہ خدا اور اُس کا خلیفہ خوب جانتے ہیں کہ یہ محض حضور کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی بندہ نوازی تھی۔ ''بُھٹہ'' کی ڈاکٹری نہیں۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی ''کیمیا گری'' ہے۔

باب پنجم

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کا دَورۂ نائیجیریا

اگست ۱۹۸۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کا دَورۂ نائیجیریا متوقع تھا۔ دَورہ سے تقریباً دو تین ہفتہ قبل مکرم امیر جماعت مولانا محمد اجمل شاہد صاحب اجی بواوڈے آئے اور مجھے ہسپتال میں ملے۔ انہوں نے مجھے حضور کے دَورہ کا پروگرام دکھایا۔ اس میں لیگوس سے ابادان جاتے ہوئے اموسان (Imosan) ہسپتال کا معائنہ تو شامل تھا لیکن ''اجی بواوڈے ہسپتال'' کے معائنہ کا ذکر نہ تھا۔

امیر صاحب نے وضاحت کی کہ وقت کی قلّت ہے۔ ۲۰۔ اگست کو لیگوس سے چل کر دوپہر کو ابادان پہنچنا ہے۔ راستہ میں اموسان ہسپتال کا معائنہ کر کے اجی بواوڈے شہر میں داخل ہوئے بغیر باہر سے ہی ابادان نکل جائیں گے۔ اس طرح وقت پر ابادان ہوٹل پہنچ کر کھانے کے بعد حضور کچھ آرام بھی فرما لیں گے۔ اگر اجی بواوڈے ہسپتال کے معائنہ کے لیے شہر میں داخل ہوئے تو وقت زیادہ لگ جائے گا۔ لہٰذا تمہارا ہسپتال پروگرام میں شامل نہیں ہو سکا۔ تاہم انہوں نے کہا کہ میں ''احتیاطاً'' کچھ تیاری کر رکھوں۔

پھر امیر صاحب نے کہا کہ اس روز دوپہر کا کھانا حضور اور حضور کے قافلے کے لیے میں تیار کروں اور وقت پر ابادان کے پریمئیر ہوٹل لے کر پہنچوں۔ ''ہسپتال کے معائنہ'' سے محرومی کے بعد یہ کھانے کی سعادت میرے لیے بہت غنیمت تھی۔ میں نے امیر صاحب کو یقین دِلایا کہ انشاءاللہ تعالیٰ آپ کی ہدایات کے مطابق عمل ہوگا۔

اجی بواوڈے ہسپتال کی ''احتیاطاً'' تیاری

تیاری کے سلسلہ میں میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ حکومت نے ہسپتال کے سامنے سڑک کو اکھاڑ کر دوبارہ تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سڑک کو کافی چوڑا بھی کیا گیا اور اس طرح میرے ہسپتال کے سامنے والی دیوار اور گیٹ کو گرا دیا گیا تھا۔ اب سڑک ہسپتال کی بلڈنگ سے دو تین میٹر کے فاصلے پر تھی اور ان دو تین میٹر میں بھی پائپ بچھانے کے لیے تقریباً تین فٹ چوڑی کھائی کھود دی گئی تھی۔ دن بھر بُل ڈوزر اور رولر گھومتے رہتے اور گرد و غبار سے ہسپتال کے سامنے والا حصہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ بارش ہوتی تو کیچڑ کے چھینٹے دیواروں تک آتے تھے۔

ان حالات میں پریشان تو میں پہلے ہی تھا کہ ''اگر حضور دیکھیں گے تو کیا بنے گا۔'' اب جب امیر صاحب نے بتایا کہ میرے ہسپتال کا معائنہ شامل ہی نہیں پروگرام میں تو میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ اس میں بھی کوئی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوگی۔ تاہم تیاری تو مجھے کرنی تھی خواہ ''احتیاطاً'' ہی سہی۔

اموسان ہسپتال کا معائنہ تو جماعتی پروگرام کا حصہ تھا۔ لہٰذا اموسان میں جماعت کی ساری مشینری تیاری میں مصروف تھی۔ مولانا صفی الرحمٰن خورشید اور ڈاکٹر مبشر احمد کی نگرانی میں ساری جماعت کٹائی، دھلائی، صفائی میں دن رات ایک کر رہی تھی۔ شامیانوں اور سٹیج کے ساتھ جلسہ گاہ تیار ہو رہی تھی۔

اِدھر اجی بواوڈے ہسپتال میں مَیں اکیلا سٹاف اور اپنے بیوی بچوں کی مدد سے تیاری کر رہا تھا۔ سٹاف بھی ایک دو گھنٹہ لگا کر چھٹی کر جاتا تھا۔ اصل محنت تو میرے ساتھ میرے بیوی بچے کر رہے تھے۔ اس طرح اجی بواوڈے ہسپتال کی تیاری ہمارا ''فیملی افیئر'' ہی بن کر رہ گیا تھا۔ رات تک ہم اسی تیاری میں لگے رہتے۔ باہر کا حصہ البتہ میں نے دو مزدور لگا کر پینٹ کروالیا تھا۔ گھر میں ہم نے اچھے بڑے بڑے سرخ Banners تیار کئے جن پر ''Welcome'' خوش آمدید اور اھلاً و سھلاً و مرحباً سنہری الفاظ میں لکھا تھا۔ اسی طرح اور بھی بڑے Banners پر یہ آیات قرآنی لکھی تھیں:

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ۔ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ۔ اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا۔

سڑک اور ہسپتال کے درمیان جو کھائی کھودی گئی تھی۔ اس پر میں نے لکڑی کا پُل بنوالیا تھا۔ پُل کے اُوپر سبز رنگ کے پلاسٹک کی چھت بھی ڈلوائی تھی تا کہ بارش کی صورت میں پریشانی نہ ہو۔ ایک ''ریڈ کارپٹ'' (Red Carpet) بھی میں نے خرید کر رکھ لی تھی تا کہ بوقت ضرورت بچھا سکوں۔ پُل کے پھٹے کچھ اچھے نہ لگتے تھے، ہلتے بھی تھی اور آنے جانے سے خراب بھی ہو رہے تھے۔

ہفتہ دس دن کی محنت کے بعد ہسپتال کی شکل کچھ نکل آئی تھی۔ کچھ حوصلہ ہوا تھا کہ یہ ''احتیاطاً'' تیاری قدرے رنگ لا رہی ہے۔ میں نے سٹاف اور اپنے بیوی بچوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ سب تیاری صرف ''احتیاطاً'' ہے اور حقیقتاً حضور کی آمد پروگرام کا حصہ نہیں ہے۔ اگر اُن کو یہ بتا دیتا تو وہ تیاری میں وہ جوش وخروش نہ دکھا پاتے جو وہ دِکھا رہے تھے۔

رنگ برنگی جھنڈیاں

میں نے اہلیہ سے ذکر کیا کہ پاکستان میں جب انسپکٹر سکول کے معائنہ کے لیے آتے تھے تو ابا جی سکول کو جھنڈیوں سے سجایا کرتے تھے۔ (میرے والد صاحب ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے) یہاں نائیجیریا میں کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ اہلیہ نے فوراً کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے۔ چنانچہ بازار سے سرخ، سبز اور زرد رنگ کا کپڑا خریدا گیا اور ایک ہی دن میں سب نے مل کر ڈیڑھ دوسو جھنڈیاں تیار کرلیں۔

اِدھر جھنڈیاں تیار ہوئیں تو اُدھر میرے دل میں ایک وہم نے جنم لے لیا۔ میں نے سوچا کہ ''یہ جھنڈیاں کہیں یہ خیال نہ پیدا کردیں کہ میں نے خواہ مخواہ وقت اور پیسہ ضائع کیا ہے۔'' کہیں معاملہ اُلٹ ہی نہ ہو جائے۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے بچوں سے پوچھا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہر جھنڈی پر کچھ لکھ دیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ لکھ کر دیں ہم سٹینسل

(Stencil) کاٹ کر سلور پینٹ سے ہر جھنڈی پر لکھ دیں گے۔ چنانچہ چند گھنٹوں میں ہی یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

اب جب یہ جھنڈیاں ہسپتال کے اندر اور باہر لہرائیں تو ہر جھنڈی پر "اللہ اکبر" یا "ھو الناصر" یا "ھو الشافی" لہرا رہا تھا۔ میں نے دیکھا تو کہا کہ اب اگر ایسی جھنڈیاں مَیں سارے شہر بلکہ ساری دنیا میں بھی لہرا دوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں نے وقت یا پیسہ ضائع کیا ہے۔

''اللہ میاں! اپنے خلیفہ کا پروگرام تو تُو ہی بناتا ہے ناں''

ہم نے اپنی بساط کے مطابق اجی بواوڈے ہسپتال کی تیاری مکمل کر لی۔ آخری دن مغرب کے بعد میں اس تیاری پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے ہسپتال گیا۔ جھاڑن ہاتھ میں لیے میں ہر کمرے میں گھوما اور جھاڑ پھونک کرتے اور ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کرتے بالآخر میں اپنے دفتر میں آیا۔ اور پھر اچانک خیال آیا کہ پہلے تو میرے ہسپتال کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں کہتا تھا کہ اگر حضور آئے تو کیا بنے گا۔ اور اب ہم نے دن رات محنت کر کے حالت کو اتنا ٹھیک کر لیا ہے کہ اب یہ فکر ہے کہ اگر حضور نہ آئے تو کیا بنے گا۔ کل جب سٹاف اور بیوی بچوں کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ ساری محنت محض ''احتیاطاً'' تھی تو اُن کی کتنی دل شکنی ہوگی۔ یہ سوچتے ہی میں آبدیدہ ہو گیا اور سسکیوں میں میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے ''اللہ میاں کہتے ہیں کہ یہ ہسپتال پروگرام میں شامل نہیں لیکن اپنے خلیفہ کے پروگرام تو تُو ہی بناتا ہے ناں۔ تو اگر چاہے تو ہمیں اس دل شکنی سے بچا سکتا ہے۔''

اموسان ہسپتال میں حضور کی آمد

دوسرے دن صبح دس بجے میں بیوی بچوں کو لے کر اموسان ہسپتال حضور کے استقبال کے لیے پہنچ گیا کیونکہ اصل اور یقینی پروگرام تو وہیں تھا۔ میرا سب سے بڑا لڑکا عبدالشکور بھٹہ، تو تین روز پہلے ہی لیگوس پہنچ چکا تھا۔ اس کو حضور کے قافلے کے آگے پائلٹ کار کے ڈرائیور کے طور پر ڈیوٹی دی گئی تھی۔ اور حضور کے دَورہ کے دوران وہی پائلٹ کار کو ڈرائیو کرتا رہا تھا۔ سوائے ایک آدھ گھنٹہ کے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اُس کے ساتھ ڈاکٹر انوار'' کو پائلٹ'' کے طور پر ہوتے تھے۔

ہم اموسان پہنچے تو تھوڑی دیر بعد ہی ''پائلٹ کار'' پہنچ گئی اور اطلاع دی کہ حضور تشریف لا رہے ہیں۔ جلدی سے عبدالشکور نے اپنی ماں، بہن اور بھائیوں سے سلام دعا کی۔ اتنے میں حضور کی کار احاطہ میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر مبشر اور اُن کی اہلیہ نے حضور کا استقبال کیا اور پھر حضور، ہسپتال کے معائنہ کے لیے تشریف لے گئے۔ کثرت سے دوست بھی ساتھ ہو لیے۔ اسی ہجوم میں مَیں بھی تھا۔ پہلے ہی کمرہ کے معائنہ کے بعد جب حضور باہر آئے تو حضور کی نظر مجھ پر پڑی۔

حضور نے مجھ سے پوچھا ''تمہارا ہسپتال بھی یہاں قریب ہی ہے ناں؟''

میں نے عرض کی ''جی حضور، کوئی پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔''

حضور نے فرمایا: ''وہاں بھی چلنا ہے ناں؟''

میں نے عرض کی ''جی حضور'' (اور کیا کہہ سکتا تھا میں۔)

پھر حضور ہسپتال کے دوسرے کمروں کے معائنہ میں مصروف ہو گئے۔لیکن میں نے فوراً اپنے ہسپتال جانے کا سوچا اور اپنے بیوی بچوں کو تلاش کر کے اکٹھا کیا۔ ابھی روانہ نہ ہوا تھا کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ حضور مجھے بلا رہے ہیں۔(اس وقت سب حاضرین جلسہ گاہ میں بیٹھ چکے تھے۔)

میں گیا تو حضور معائنہ ختم کر چکے تھے اور امیر صاحب اور چند دیگر مربّیان کے ساتھ کھڑے جلسہ گاہ کی طرف جانے کو تیار تھے۔حضور نے مجھ سے پوچھا:

''تمہارا گھر ہسپتال کے کمپاؤنڈ کے اندر ہے یا باہر ہے؟''

میں نے عرض کی: ''حضور کمپاؤنڈ میں تو نہیں لیکن بالکل قریب ہے۔ڈیڑھ دوسو گز کا فاصلہ ہوگا۔''

پھر حضور نے فرمایا: ''اوئے! صاف ستھرا رکھا ہے یا ایسے ہی چھوڑ دیا ہے۔''

میں نے عرض کی: ''نہیں حضور! سب ٹھیک ٹھاک ہے اور صاف ستھرا ہے۔''

اور پھر حضور سٹیج کی طرف چل پڑے اور میں بیوی بچوں کو لے کر اپنے ہسپتال کی طرف بھاگا۔ راستہ میں مَیں نے اہلیہ کو بتایا کہ حضور نے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہے۔ پتہ نہیں اب اس کا مطلب کیا ہے۔ اہلیہ نے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آئیں میں گیسٹ روم اور باتھ روم پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لوں۔ میں نے کہا کہ میں چھوڑ تو دیتا ہوں لیکن انتظار نہیں کر سکتا۔تم جلد ہی ہسپتال آ جانا۔ میں جا کر ہسپتال میں سٹاف کو بتاتا ہوں کہ حضور آ رہے ہیں۔ وہیں ہم سب حضور کا اِستقبال کریں گے۔

اِدھر میں ہسپتال پہنچا تو ایک دو منٹ بعد ہی پائلٹ کار لے کر عبدالشکور پہنچ گیا اور بتایا کہ حضور آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تمہاری امّی تو گھر پر ہے، جاؤ، جا کر اس کو لے آؤ۔ چنانچہ وہ پائلٹ کار لے کر ماں کو لینے چلا گیا۔ اور دو منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ حضور کی کار آ کر اسی پُل کے سامنے رکی جس پر اب میں نے سرخ کارپٹ بچھا دی تھی۔حضور نے ہسپتال کا معائنہ کیا۔ چند منٹ میں معائنہ مکمل ہو گیا۔ پھر حضور نے مجھ سے پوچھا:

''تمہارے گھر سے آ گے ہم سیدھے ابادان جا سکتے ہیں یا جا کر واپس آنا ہوگا ابادان جانے کے لیے۔''

میں نے عرض کی: ''حضور واپس آنا ہوگا۔''

پھر حضور نے فرمایا: ''اچھا چلو چلیں۔''

میں فوراً اپنی کار میں بیٹھا اور میرے پیچھے حضور کی کار تھی۔ میں دانستہ آہستہ چلا رہا تھا کیونکہ مجھے اب یہ تشویش تھی کہ میں نے تو عبدالشکور کو گھر بھیج دیا ہے تا کہ وہ والدہ کو ہسپتال لے آئے اور اب میں خود حضور کو لے کر گھر جا رہا ہوں۔ کہیں گھر پر تالا نہ پڑا ہو۔ بہت ہی نازک لمحات تھے وہ۔ اتنے میں مجھے سامنے سے عبدالشکور کی ''پائلٹ کار'' آتی دکھائی دی۔ میں نے اس کو ''لائٹس''

ماریں اور ہاتھ سے بار بار واپس جانے کا اشارہ کیا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر فوری طور پر ''یُو'' ٹرن مار کر واپس گھر کی طرف بھاگا۔ ابھی گاڑی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ میری اہلیہ اور بیٹی نے تیزی سے اُتر کر گھر کا دروازہ کھولا۔

اتنے میں حضور کی کار گیٹ سے گزر کر ہمارے فلیٹ کے دروازے کے عین سامنے آ کر رکی۔

میری اہلیہ اور بیٹی نے حضور اور بیگم صاحبہ کا استقبال کیا۔ میں ذرا پیچھے تھا۔

حضور نے گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اہلیہ سے یہ الفاظ کہے آہستہ آہستہ:

''آخر آپ نے...... آج...... ہمیں...... اپنے گھر...... بلا ہی لیا۔''

حضور کے یہ الفاظ ہم سب کو اچھی طرح یاد ہو گئے تھے۔ یہ الفاظ ہمارے لیے بہت ایمان افروز بھی تھے اور معنی خیز بھی۔ میری اہلیہ اور بیٹی حضور اور بیگم صاحبہ کو گیسٹ روم میں لے گئیں اور وہیں خدمت میں مصروف رہیں۔ تھوڑی دیر بعد مولانا صفی الرحمٰن خورشید مبلغ مقیم اجی بواوڈے کی اہلیہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔

صاحبزادگان مرزا انس احمد اور مرزا فرید احمد نے ''چائے کافی'' کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ اُنہیں کچن دکھا دیں وہ خود ہی اپنی مرضی کے مطابق بنا لیں گے۔ ''کولڈ ڈرنکس'' کے کریٹ قافلے کے دوسرے احباب کے لیے باہر پہنچا دیئے گئے تھے۔ یہ سب انتظام کر رکھا تھا کیونکہ دوست لیگوس آتے جاتے اجی بواوڈے سے گزرتے تھے اور بعض ٹھہر بھی جاتے تھے۔

جیسے آدھی رات اچانک سورج نکل آیا ہو

تقریباً آدھا گھنٹہ قیام کے بعد حضور کا قافلہ ابادان روانہ ہو گیا۔ عبدالشکور نے جلدی سے دو تین فوٹو گھر سے روانگی کے وقت بنا لیے جو آج تک میرے گھر کی اہم ترین یادگار ہیں۔ حضور کے جانے کے بعد ہم سب اہل خانہ ایک دوسرے کو حیرت اور خوشی سے دیکھنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سہانے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ جیسے آدھی رات اچانک سورج نکل آیا ہو۔ ہماری باطنی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔ حالات کا یہ حسین رُخ ناقابلِ یقین تھا۔ مجھے مربی صاحب کا یہ فقرہ یاد ہے کہ

''آپ نے محنت بھی بہت کی تھی اور خدا نے اجر بھی نقد ہی دے دیا۔''

آدھ پون گھنٹہ بعد جب ہمارے ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو یاد آیا کہ ہمیں تو دوپہر کا کھانا لے کر ابادان پہنچنا ہے۔ چنانچہ کھانا گاڑی میں رکھ کر ہم ابادان روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر مبشر احمد سے کہہ رکھا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ اپنی گاڑی میں چلے احتیاطاً۔ چنانچہ وہ بھی ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ ابادان کے پریمیئر ہوٹل میں حضور اور حضور کے قافلہ کو کھانا پیش کیا اور پھر دو گھنٹہ بعد ہم برتن سمیٹ کر واپس اجی بواوڈے آ گئے۔ ابادان کے پروگرام میں ہم شامل نہ ہو سکے تھے کیونکہ بہت تھک چکے تھے۔ ''خوشی سے نڈھال'' اور اللہ تعالیٰ کے احسانوں تلے دبے جا رہے تھے۔

کیا میں نے حضور سے درخواست کی تھی؟

بعض دوستوں کا خیال تھا کہ حضور میری درخواست پر میرے غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ ''دورۂ مغرب ۱۴۰۰ھ'' کے عنوان سے جو کتاب نظارت اشاعت ربوہ نے شائع کی ہے۔ اس میں بھی یہی لکھا ہے کہ ''میری درخواست'' پر حضور میرے گھر تشریف لے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ میں نے ایسی کوئی درخواست کی، نہ میں ایسی جسارت کر سکتا تھا اور نہ ہی ہمیں ایسی کوئی اجازت تھی۔ امیر صاحب کی ہدایت تھی کہ ''حضور کسی کے گھر نہیں جائیں گے۔'' پس محض ''اندازے'' سے ہی ایسا سوچ لیا گیا تھا کہ میں نے درخواست کی ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ تیاری کے دَوران ایک روز میں نے مولوی صفی الرحمٰن صاحب خورشید سے، جو اجی بواوڈے کے انچارج تھے، پوچھا کہ حضور اموسان آرہے ہیں۔ ان کے کچھ دیر آرام کے لیے کوئی جگہ تیار کرنی چاہیے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ امیر صاحب نے اس بارے میں ابھی تک کوئی ہدایت دی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں مشن ہاؤس میں یا پھر میرے گھر میں ایسا انتظام ہو سکتا تھا۔ میرے فلیٹ میں ہر سہولت میسّر تھی۔ اچھا کشادہ بھی تھا اور ماڈرن بھی۔ چند دن بعد مولوی صاحب لیگوس سے ہو کر آئے تو بتایا کہ امیر صاحب نے فرمایا ہے کہ ''حضور کسی کے گھر نہیں جائیں گے'' اور ہدایت دی ہے کہ ڈاکٹر مبشر صاحب سے کہہ کر اموسان ہسپتال میں ہی حضور کے آرام کے لیے کمرہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی۔ میرا تو ہسپتال ہی دَورے سے باہر تھا۔ گھر کا تو کوئی اِمکان ہی نہ تھا۔ اموسان ہسپتال کے اندر ہی حضور کے آرام کے لیے کسی کمرے کی تیاری کا خیال اچھا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے لیے کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ پھر کمی نہ جانے کیسے رہ گئی اور کیوں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اموسان ہسپتال کے معائنہ کے دوران جب مجھے معلوم ہوا کہ حضور میرے ہسپتال بھی آئیں گے تو میں بیوی بچوں کو لے کر اپنے ہسپتال کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا تھا۔ راستہ میں میری اہلیہ نے قدرے درشتی سے کہا تھا: ''کہاں ہے وہ کمرہ جس کے بارے میں مہینہ بھر سے سن رہے تھے کہ تیار ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کو تو انہوں نے ہسپتال کے پچھواڑے برآمدہ میں ایک صوفہ پر بٹھا رکھا ہے۔ اردگرد عورتیں بیٹھی ہیں اور سامنے جنگل ہے۔ گرمی اور مچھروں نے برا حال کر رکھا ہے۔''

میں خاموش رہا، وہ پھر بولیں: ''جھنڈیاں تو انہوں نے ہماری نقل کر کے ایک دن میں لگا لیں لیکن کمرہ یہ ایک مہینہ میں تیار نہ کر سکے۔ میں حیران ہوں یہ کرتے کیا رہے ہیں اتنا عرصہ''

بعد میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بیگم صاحبہ کے لیے تو برآمدہ میں صوفہ رکھوا دیا گیا تھا اور حضور کے لیے ایک کمرہ تیار کیا تھا جس میں لکڑی کی سادہ ننگی میز تھی اور دو تین لکڑی کی آفس چیئرز تھیں۔ ٹائلٹ کی کھڑکی پر پردہ نہ تھا۔ لوگ اردگرد گھوم پھر رہے

تھے۔کوئی Privacy نہ تھی۔حضور نے اس کمرہ کو پسند نہ فرمایا تھا۔تب ہی مجھے سمجھ آئی تھی کہ کیوں مجھے بلا کر میرے گھر اور اس کی صفائی وغیرہ کے متعلق پوچھا گیا تھا۔تاہم میرے لیے معاملہ مشکوک ہی رہا کیونکہ امیر صاحب نے فوری بندوبست کی کچھ بات کی تھی اور حضور خاموش رہے تھے۔

ہرگز میرا مقصد عیب چینی کرنا نہیں اور اس تفصیل کو بیان کرنے کا میرا کوئی ارادہ بھی نہ تھا پر سوچا کہ ایسے حالات اور واقعات پر ''رپورٹنگ'' کرتے وقت، جو انتہائی اہمیت کے حامل ہوں، خصوصاً جن کا تعلق خلیفۂ وقت سے ہو، جہاں خوبیاں بیان کرنا اچھی بات ہے، وہاں خامیوں کی نشاندہی کرنا بھی غیر مناسب نہیں۔شاید خامیوں کی نشاندہی خوبیوں کی نسبت زیادہ ضروری ہوتی ہے۔

حادثہ اور حفاظتِ الٰہی

ابادان سے خالی برتن لے کر ہم واپس گھر پہنچے اور پھر سکون کے ساتھ اس دن کے واقعات کو یاد کر کے محظوظ ہونے لگے۔ جس بستر پر حضور تشریف فرما ہوئے تھے۔اس کی چادر کو بیٹی نے تہہ کر کے سنبھال لیا۔بعد میں احمدی خواتین کے اصرار پر اس چادر کے رومال بنا کر تبرک کے طور پر تقسیم کر دیئے تھے۔بعض ملنے والوں نے مبارکباد دی۔بعض نے کہا کہ اب تو آپ اس گھر کو خرید لیں۔صبح مجھے پھر لیگوس جانا تھا لہٰذا جلدی سو گئے۔

اگلی صبح ۲۱۔اگست ۱۹۸۰ء کو میں لیگوس حضور کے ہوٹل پہنچا تو بڑے ہال میں بہت سے دوست بیٹھے تھے۔فضا میں کچھ خاموشی اور اداسی سی چھائی تھی۔میں نے ایک شناسا دوست سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا:

''آپ کو نہیں پتہ؟ کل رات ابادان سے لیگوس واپس آتے ہوئے حضور کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے۔''

سنتے ہی مجھے سخت جھٹکا سا لگا۔پھر اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ قافلے کی رفتار تیز تھی۔لیگوس سے باہر فوجی چیک پوسٹ پر پائلٹ کار آہستہ ہوتی نہ دکھائی دی تو سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں۔پائلٹ کار کے ڈرائیور نے سخت زور سے بریک لگائی۔پیچھے حضور کی گاڑی کے ڈرائیور نے تو بریک لگا لی لیکن اس سے پیچھے خدّام کی سیکورٹی وین تھی وہ رُک نہ سکی اور حضور کی گاڑی سے ٹکرا گئی اور حضور کی گاڑی بھی کچھ اچھل کر آگے پائلٹ کار سے ہلکی سی ٹکرا گئی۔حضور کی کار کی ''ڈِگی'' تو بری طرح تباہ ہوئی۔آگے کم نقصان ہوا۔خدا کے فضل سے حضور اور دیگر دوست محفوظ رہے۔یہ سن کر صدمہ تو ہوا لیکن یہ معلوم کر کے تسلّی ہوئی کہ حضور اور دوسرے سب لوگ محفوظ رہے۔حضور کی کمر کو جھٹکا لگا تھا اور ٹانگ پر بھی کچھ چوٹ آئی تھی۔

اب میں اس صدمہ میں تھا کہ اس حادثہ کا ذمہ وار تو پائلٹ کار کا ڈرائیور ہوا اور وہ میرا بیٹا عبدالشکور تھا۔میں شکور کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔لیکن شرم کے مارے کسی سے پوچھتا نہ تھا۔اتنے میں مجھے شکور اور ڈاکٹر انوار کچھ فاصلے پر آتے دکھائی دیئے۔میں جلدی سے ان تک پہنچا اور جاتے ہی برس پڑا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ان دونوں نے دبی زبان میں فوراً وضاحت کی کہ نہیں نہیں، ہم

حادثہ کے وقت آگے نہ تھے۔ ہم تو شکر کرتے ہیں خدا نے ہمیں بچالیا۔

پھر انہوں نے تفصیل بتائی کہ ابادان سے روانگی کے وقت ہم ہی آگے ''پائلٹ'' کر رہے تھے اور نارمل رفتار سے ہی آ رہے تھے۔ بارش بھی ہو رہی تھی اور رات بھی تھی لیکن دَورانِ سفر مفتی احمد صادق صاحب نے ہمیں ''اوورٹیک'' کیا اور قافلے کے آگے لگ گئے اور ہمیں اشارہ کیا کہ پیچھے لگ جائیں۔ انہوں نے ''لیٹ نکالنے'' کے لیے رفتار تیز کر دی اور پھر ''چیک پوسٹ'' کا بھی لحاظ نہ رکھا اور پھر حادثہ ہو گیا۔ ہوٹل پہنچ کر حضور کا معائنہ کیا گیا۔

ڈاکٹر انوار نے بتایا کہ حضور کو کمر میں جھٹکا لگا ہے، درد ہے، ٹانگ پر بھی کچھ زخم ہے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ کوئی سخت چوٹ نہیں آئی۔ اس روز حضور نے ملاقاتوں اور دیگر مصروفیات کو معمول کے مطابق جاری رکھا تھا۔ میں نے حضور کو ملاقاتوں میں آتے جاتے دیکھا اور پھر موقع پا کر حضور سے خیریت بھی دریافت کر لی تھی۔ شام کو میں واپس اجی بواوڈے آ گیا تا کہ اگلے روز جمعہ کے لیے فیملی سمیت ''الارو'' جاسکوں جہاں حضور نے آ کر مسجد کا افتتاح کرنا تھا اور نماز جمعہ پڑھانی تھی۔

''الارو (Ilaro)'' میں نمازِ جمعہ

۲۲۔ اگست ۱۹۸۰ء کو حضور نے ''الارو'' میں احمدیہ مسجد کا افتتاح کیا اور نماز جمعہ پڑھائی۔ میں بچوں کو لے کر اجی بواوڈے سے اِلارو پہنچا۔ ڈاکٹر مبشر احمد بھی بچوں سمیت وہاں پہنچ گئے۔ نمازِ جمعہ کے بعد کھانا تھا، رش زیادہ تھا اور موسم گرم۔ میں نے کھانا کھائے بغیر ہی گھر جانے کا فیصلہ کیا جبکہ ڈاکٹر مبشر احمد کھانا کھا کر آئے۔ اگلے روز ہم نے پھر لیگوس جانا تھا۔

اگلی صبح میں نے لیگوس جانے سے پہلے ڈاکٹر مبشر احمد سے پوچھا کہ اگر جانا ہو تو اکٹھے نکل چلیں انہوں نے بتایا کہ وہ سب بیمار ہیں۔ سب کے پیٹ خراب ہو گئے تھے اور رات بھر سو نہ سکے، لہٰذا وہ سفر نہ کر سکے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر لیگوس روانہ ہو گیا۔ یہ حضور کا نائیجیریا کے دورے کا آخری دن تھا۔

لیگوس ہوٹل پہنچ کر ہال میں پھر کچھ خاموشی اور کھسر پھُسر دیکھی۔ معلوم ہوا کہ جن دوستوں نے ''الارو'' میں کھانا کھایا تھا۔ سب کے پیٹ خراب ہو گئے تھے۔ گرمی زیادہ تھی، سالن ٹھیک نہ رہا تھا۔ شکر ہے حضور اور قافلہ کے سب دوست محفوظ رہے کہ اُن کے لیے کھانا الگ تیار کیا گیا تھا۔

جمعہ کے روز ''الارو'' سے واپس آ کر حضور نے کچھ دیر آرام فرمایا۔ پہرہ داروں اور عملہ کے کمرے بھی قریب ہی تھے۔ انہی میں عبدالشکور، ڈاکٹر انوار اور مفتی احمد صادق بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام گئے عبدالشکور نے دیکھا کہ حضور بڑے کمرے میں تخت پوش پر بیٹھے ہیں۔ شلوار قدرے اونچی کی ہوئی ہے، شکور قریب چلا گیا اور عرض کی:

''حضور آج گرمی بہت تھی، سفر بھی صبح سے بہت کیا ہے، تھکاوٹ ہو گئی ہو گی، میں ذرا دبا دوں۔''

اور پھر فوری طور پر بیٹھ کر ٹانگیں دبانی شروع کر دیں۔ حضور نے اس کو تھپکی دی اور ڈرائیونگ کی تعریف کی اور فرمایا:

''آج قافلہ ٹھیک گیا اور آیا ہے، اسی طرح ڈرائیونگ کرنی چاہیے۔''

میرا منجھلا بیٹا عبدالسبوح پہرہ داروں کے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا۔ مکرم امیر جماعت محمد اجمل شاہد صاحب کا بیٹا امجد بھی ساتھ ہوتا۔ حضور ہال میں آتے جاتے تو یہ مصافحہ کر لیتے اور پیار بھی لے لیتے۔ وہیں کبھی فرش پر لیٹ بھی جاتے۔ میں نے کہا تم تو بالکل ''ابو ہریرۃ'' ہی بن گئے ہو۔

حضور لجنہ سے خطاب کرنے کے لیے ہال میں جانے لگے تو میں نے بڑھ کر سلام عرض کیا اور کہا کہ حضور اگر مترجم کی ضرورت پڑے تو میری بیٹی اندر موجود ہے۔ اس پر حضور مسکرائے اور فرمایا:

''تم بتانا یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی یوربا بول لیتی ہے۔ اچھا چلو دیکھتے ہیں وہ کیسا ترجمہ کرتی ہے۔''

حضور نے جا کر میری بیٹی کو بلوایا اور پھر حضور کے خطاب کا وہ یوربا ترجمہ کرتی رہی۔ حضور کے پیچھے دو معزز خواتین پہرہ دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے میری بیٹی سے آہستہ سے کہا ''ذرا اُونچا بولو۔''

اس پر حضور نے فرمایا: ''نہیں، وہ ٹھیک بول رہی ہے، اُونچا بولنا مردوں کا کام ہے۔''

باب ششم

پاکستان کا دوسرا چکر براستہ سپین

نومبر ۱۹۸۱ء میں مَیں نے چھٹی کے لیے پھر درخواست دی جو حضور رحمہ اللہ نے از راہِ شفقت منظور فرمائی اور میں تین ماہ تک پاکستان میں رہا۔ دس سال بعد جلسہ سالانہ ربوہ میں شرکت کی توفیق ملی تھی۔ بہت سے بزرگوں سے ملا۔ اِن میں صاحبزادہ ایم۔ایم۔احمد صاحب بھی شامل تھے۔ میں نے اپنا تعارف اپنے اُس استعفیٰ کے حوالہ سے کروایا جس کی منظوری کے لیے میں اسلام آباد میں اُن سے ملا تھا۔ اُن کو یاد تھا، نائیجیریا میں زندگی اور کلینک کے بارے میں پوچھتے رہے۔

نائیجیریا سے پاکستان جاتے ہوئے میں یورپ سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ لندن اور لسٹر میں تو رشتہ دار تھے۔ وہاں ہم ہفتہ دو ہفتے ٹھہرتے لیکن انگلینڈ کے علاوہ ایک دو اور یورپین کیپٹل بھی میں اپنے پروگرام میں شامل کر لیتا تھا۔ اس طرح ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۶ء تک ہم نے پیرس، (Nice) نیس، ایمسٹرڈم، زیورچ، روم، ایتھنز کی سیر بھی کر لی تھی۔ جرمنی کے سوا یورپ کے اکثر مشہور ملک دیکھ لیے تھے۔ لیکن جرمنی کا ویزہ بار بار کوشش کے باوجود نہ ملتا تھا حالانکہ یہاں تو میری بیٹی بھی رہتی تھی۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ کیا وجہ ہے۔ یہ تو اب سمجھ میں آیا کہ جرمنی میں صرف دو چار روز کی سیر مقدر نہ تھی بلکہ یہاں تو منشائے الٰہی میں ہمیں زندگی گزارنی تھی۔ اُس وقت تو اس کا وہم و گمان تک نہ تھا کہ خدا تعالیٰ ''ویزہ'' نہیں جرمنی کی نیشنلٹی دینا چاہتا ہے۔

اب نومبر ۱۹۸۱ء میں جب میں نے یورپ ہوتے ہوئے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا تو سپین کو شامل کر لیا۔ ''پیڈرو باد'' سپین میں مسجد بشارت تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ میں ''مسجد قرطبہ'' اور مسجد بشارت دیکھنا چاہتا تھا۔ ان میں سے پہلی اگر سپین میں اسلام کی نشأۃِ اُولیٰ کی انتہاء کی یادگار تھی تو دوسری نشأۃِ ثانیہ کی ابتداء کی آئینہ دار۔ مبلغ سپین مولانا کرم الٰہی صاحب ظفر سے رابطہ کر کے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم میڈرڈ پہنچ گئے۔

میڈرڈ ہوٹل میں ٹھہر کر ٹرین سے قرطبہ جانے کے لیے ٹکٹ وغیرہ کا پتہ کرنے کے لیے میں ریلوے سٹیشن پہنچا تو وہاں مجھے ٹیکسی ڈرائیوروں نے گھیر لیا۔ وہ پیشکش کر رہے تھے کہ ٹرین کی نسبت زیادہ آرام سے لے جائیں گے لیکن کرایہ زیادہ تھا۔ اُن کا ایک لیڈر کچھ انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ اُس نے کہا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور قرطبہ سے آیا ہے۔ اور وہ اب واپس خالی نہیں جانا چاہتا۔ وہ 50% کرایہ پر لے جائے گا۔ چنانچہ سودا ہو گیا۔ میں نے اُس لیڈر سے کہا کہ ڈرائیور کو سمجھا دے کہ راستہ میں ہمیں دوپہر کا کھانا بھی کھانا ہے۔ مناسب جگہ پر وقفہ بھی کرے۔

چھ سات گھنٹے کا یہ سفر خاصہ دلچسپ تھا۔ سپین کے دیہات، کھیت، باغات وغیرہ دیکھتے گئے۔ مغرب کے قریب ''پیڈرو باد'' کا بورڈ نظر آیا تو میں نے بچوں سے کہا کہ یہاں ہماری مسجد بنی ہے۔ ڈرائیور نے بھانپ کر پوچھا مسکیٹا؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اُس نے آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ''دیکھنا چاہتے ہو؟''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ مسجد قریب ہی تھی۔ ہم نے باہر سے دیکھی کیونکہ بیرونی گیٹ بند تھا۔ فوٹو بنائے۔ قریبی آبادی کے بچوں کا گروپ سڑک کے کنارے سیر کر رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر رُک گئے اور پھر آ کر مسجد کے گیٹ کے سامنے لائن بنائی۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہماری بھی فوٹو بناؤ۔ چنانچہ ہم نے اُن کی تصویر بنائی۔ وہ بہت خوش، ہنستے مسکراتے ہمارے گرد کھڑے رہے۔ اُن کی عمریں آٹھ سے گیارہ سال کی ہوں گی اور وہ سب لڑکیاں تھیں۔ اُن میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ میں نے سوچا کیا اسلامی طرزِ زندگی کی رمک اب بھی یہاں پائی جاتی ہے؟

مغرب کے بعد ہم قرطبہ کے احمدیہ مشن ہاؤس پہنچے۔ وہاں مولانا کرم الٰہی ظفر صاحب اور مولانا اقبال نجم صاحب ٹیکسی دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے کہ بہت مہنگا سفر کیا ہے ہم نے۔ جب میں نے بتایا کہ چودہ نہیں سات ہزار ''پسیٹا (Peseeta)'' میں آئے ہیں تو اُن کی پریشانی دُور ہوئی۔ بلکہ خوش تھے کہ اچھا چانس مل گیا ہمیں۔

اگلے روز صبح مولانا کرم الٰہی ظفر صاحب نے ہمیں مسجد دکھائی۔ وہاں صدقہ میں بھیڈ وذبح کئے۔ اور مجھے مسجد کی تصاویر دیں کہ میں ربوہ جا کر حضور کی خدمت میں پیش کروں۔ پھر اقبال نجم صاحب نے ہمیں مسجد قرطبہ، قلعہ اور شہر کی سیر کرائی۔ شام کی گاڑی سے ہم واپس میڈرڈ ہوٹل پہنچ گئے۔ دوسرے روز ''ٹولیڈو'' کی سیر کی۔ پاکستان پہنچ کر میں نے حضور سے ملاقات میں مولانا کرم الٰہی صاحب والی اور کچھ اپنی بنائی ہوئی مسجد بشارت کی تصاویر پیش کیں۔ یہ ملاقات حضور سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ نائیجیریا واپس آئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ حضور رحمہ اللہ کے وصال کی خبر مل گئی تھی۔

یورپ کے شہروں کی سیر

سپین کا ذکر ہو گیا ہے تو یورپ کے اُن شہروں کا ذکر بھی کر دوں جن کی ''سیر'' نائیجیریا کے قیام کے دوران نصیب ہوئی۔ یہ سیر آتے یا جاتے ''Stop Over'' کے طور پر ہی کی تھی۔ بکنگ ایسے طور پر کراتا تھا کہ وقت مل جاتا تھا۔ لندن، لیسٹر، مانچسٹر اور پیرس، ایمسٹرڈم اور نیس (Nice) کی سیر بھی کی۔

۱۹۷۸ء میں پہلی بار پاکستان چھٹی پر گیا تھا جس کا تفصیلی ذکر میں ''بڑے بھائی کے نام خط'' میں کر چکا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے ستمبر ۱۹۷۷ء میں بھی میں تین ہفتہ کی چھٹی لندن کاٹ آیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے نائیجیریا آتے ہوئے میں نے اہلیہ کو ''نائیجیریا جانے کے مثبت پہلو'' بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''وہاں سے ہم انگلینڈ بھی جا سکیں گے اور وہاں تم اپنی خالہ خالو اور ان کے بچوں سے مل سکو گی۔'' برسوں پہلے یہ لوگ لیسٹر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ پاکستان میں یہ ایک ہی گلی میں برسوں رہتے رہے تھے اور دونوں گھرانوں میں بہت پیار تھا۔

نائیجیریا میں جب حالات نے برسوں پاکستان جانے کی اجازت نہ دی تو ایک روز اہلیہ نے کہا کہ ''اگر پاکستان نہیں تو لندن کا چکر ہی لگوا دو۔ آپ نے کہا تھا کہ خالہ سے ملوا دوں گا۔'' اہلیہ کی بات میں وزن تھا اور میں نے حضور انور کی خدمت میں

چھٹی کی درخواست دے دی جو جلد ہی منظور ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہم لندن لیسٹر کی سیر کر آئے اور میل ملاقات بھی بہت اچھی رہی تھی۔ مبلغ سلسلہ مفتی احمد صادق صاحب کے عزیز ''سرّے'' لندن میں رہتے تھے۔ مفتی صاحب نے اُن سے پہلے کہہ دیا تھا۔ انہوں نے ہمیں لندن میں ''مادام تسّاد (Madam Tosad)'' ونڈسر پیلس (Windsor Palace)، سفاری پارک (Safari Park) کی سیر کرائی اور ڈولفن مچھلی کا شو بھی دیکھا۔ ان کا نام نصیر الدین تھا۔ اُن کا یہ احسان اور مہمان نوازی ہمیں خوب یاد ہے۔ ہم اُن کے مشکور ہیں اور دُعا گو بھی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد ہم کئی بار لندن آئے اور اہلیہ کی خالہ، خالو اور اُن کے بچوں کے ہمراہ لندن کے کئی اور مقامات دیکھے اور برمنگھم، لیسٹر اور مانچسٹر کی سیر بھی کی۔ انگلینڈ کے اسی پہلے چکر میں ہم نے پیرس کی سیر بھی کر لی تھی۔ ہوٹل کے قریب ہی وہ مشہور شاہراہ تھی جس کی شامیں ضرب المثل ہیں، پیدل گھومتے پھرتے ایفل ٹاور دیکھ آئے اور اُوپر چڑھ کر شہر کا نظارہ بھی کیا تھا۔ فوٹو بہت بنائے تھے۔ دوسرے روز بس کے ذریعہ تاریخی مقامات دیکھ لیے تھے۔ ماحول خاصہ خاموش اور لوگ خشک سے لگے تھے۔ بات کرنے سے کتراتے تھے۔ ہم سمجھے کہ شاید انہیں انگریزی نہیں آتی۔ لیکن بعد میں کسی نے بتایا کہ خوب جانتے ہیں لیکن انگلش بولنا پسند نہیں کرتے۔

۱۹۷۸ء میں پاکستان جاتے ہوئے پھر ہم Via لندن ہی گئے تھے اور بکنگھم پیلس کے گارڈز کی تبدیلی ٹاور برج وغیرہ دیکھ لیے تھے اور دریائے ٹیمز کی کشتی کے ذریعہ سیر بھی کی تھی۔ اس دفعہ ہم نے ایمسٹرڈم بھی دیکھ لیا اور وہاں شہر کی گلیوں کی سیر کی جو نہروں کی شکل میں تھیں اور جہاں کشتی کے ذریعہ آیا جایا جاتا ہے۔ لطف تو آیا تھا لیکن اس میں حیرت اور خوف کا عنصر غالب تھا۔ اور اُن گلیوں کے باسیوں کی حالت پر رحم بھی آیا تھا۔ اُن کی ہمت قابلِ داد تھی۔ فرانس کا شہر Nice بھی اسی چکر میں دیکھ لیا تھا وہاں آثار قدیمہ قابلِ دید ہیں۔

چھ ماہ بعد ہی دوبارہ چھٹی کیسے؟

یہاں یہ بات پوچھی جاسکتی ہے کہ جب میں ستمبر ۱۹۷۷ء میں تین ہفتہ کی چھٹی لے چکا تھا تو پھر چھ ماہ بعد ہی مارچ ۱۹۷۸ء میں چھٹی کی درخواست کیوں اور کیسے دے دی۔ اس سوال کا کوئی معقول جواب میرے پاس نہیں۔ بس دفتر میں بیٹھے ایک روز میرے دل میں پاکستان جانے کی خواہش شدّت سے پیدا ہوئی۔ خصوصی طور پر والدہ کا خیال آنے لگا تھا۔ دو چار روز سوچتا رہا۔ خواہش بڑھتی رہی۔ اتنے میں ایک روز امیر صاحب آئے تو میں نے اُن سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے کہا ''کچھ ہوش کرو، درخواست وہ کرنی چاہیے جس کی منظوری کا کوئی امکان ہو۔ ابھی چھ ماہ نہیں ہوئے کہ تم چھٹی لے چکے ہو۔''

پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا کوئی ایمرجنسی ہے یا والدہ کی بیماری کی اطلاع ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی اطلاع تو نہیں۔ بس پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ مجھے پاکستان چکر لگا آنا چاہیے۔ امیر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ جذباتی مت بنو اور

ایسی کوئی درخواست نہ دینا۔خواہ مخواہ جھڑک کھا بیٹھو گے۔

بایں ہمہ امیر صاحب کے جانے کے بعد میں نے حضور کی خدمت میں اپنی بے چینی اور قلبی کیفیت بیان کر کے چھٹی کی درخواست ارسال کر دی تھی اور اس بات کا اپنے گھر میں بھی کسی کو نہ بتایا تھا۔ دو تین ہفتہ بعد مکرم شکیل احمد منیر صاحب لیگوس سے ''واری'' جاتے ہوئے ہمارے ہاں اجی بواوڈے آئے اور ان کی اہلیہ نے میری اہلیہ کو چھٹی کی مبارکباد دی۔ میری اہلیہ حیران بلکہ پریشان ہو کر بولی کیسی چھٹی؟ کس کی چھٹی؟ میں سن رہا تھا۔ میرا راز فاش ہو گیا تھا۔ پھر میں نے ساری بات بتائی۔ چھٹی کی منظوری کی اطلاع براہِ راست امیر صاحب کو آئی تھی۔ ہمارے لیے یہ اطلاع بہت خوشکن ''سرپرائز'' تھی۔ پھر ہم نے تیاری شروع کر دی۔ اِدھر میں نے بکنگ وغیرہ کے لیے کاروائی شروع کر دی اور پھر......

ایک روز میں نے ڈاک دیکھی تو بڑے بھائی کا خط تھا جس میں یہ اطلاع دی کہ اہلیہ کا بڑا بھائی بعمر ۴۹ سال ہارٹ اٹیک سے فوت ہو گیا ہے۔ مجھے سخت صدمہ ہوا اور پریشانی بھی۔ میں سیدھا ڈاکخانہ سے مربی صاحب کے پاس گیا پھر ایک اور احمدی دوست کے ہاں گئے۔ طے یہ پایا کہ فوری طور پر اطلاع گھر نہیں دینی چاہیے۔ پہلے میں سکول سے بچوں کو لے آؤں اور پھر دوپہر کے کھانے کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ خبر سنائی جائے اور اُس وقت مربی صاحب اور وہ احمدی دوست اپنی بیویوں کو لے کر پہنچ جائیں گے تاکہ صورتحال سنبھال سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہفتہ دس دن تک گھر میں غم واندوہ کی فضا قائم رہی۔ تعزیت کے لیے لوگ آتے رہے۔ چونکہ چھٹی لے رکھی تھی۔ تیاری بھی ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس غم کے ساتھ غصہ اور شکوہ شکایت کی صورت نہ پیدا ہوئی۔ میں نے روانگی قدرے مؤخر کر دی اور پروگرام Via لندن ہی بنایا تاکہ پاکستان پہنچتے پہنچتے اِدھر بھی کچھ صبر وسکون آ جائے اور اُدھر پاکستان میں بھی حالات کچھ نارمل ہو جائیں۔ صدمہ تو مقدر تھا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ پہلے سے سفر کی تیاری کروا کر صدمہ کے Impact کو نرم کر دیا تھا۔ بھگدڑ اور افراتفری سے بچا لیا تھا۔

قدرت کے رنگ نرالے

۱۹۷۱ء میں جب وقف کر کے میں نائیجیریا آنے کی تیاری کر رہا تھا تو میری اہلیہ کے والد بہت بیمار تھے اور وہ ضعیف بھی تھے۔ عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے اور حالت خاصی خراب تھی۔ ان کا یہی بیٹا جس کی وفات ہوئی تھی، کہا کرتا تھا ''یار! روز صبح ڈرتے ڈرتے ابا کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں ہیں بھی کہ نہیں۔'' اہلیہ کی سہیلیاں اس سے کہتی تھیں کہ کس حالت میں باپ کو چھوڑ کر جا رہی ہو۔ باپ کو پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

ادھر میں پریشان تھا کہ میری بکنگ ہو چکی تھی اور ڈرتا تھا کہ اگر ان دنوں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو عجب گھمبیر صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ دوست کہتے کہ بس دعا کرو کہ تمہاری روانگی تک خیر رہے پھر وہاں جب خبر پہنچے گی تو دو چار دن رو دھو کر چپ ہو

جائے گی۔بس نکل جاؤ کسی طرح۔

پھر نائیجیریا آکر دھیان تو اُدھر ہی رہتا تھا۔خطوں میں اپنی پریشانی اور اضطراب کا اظہار کرتی، دعاؤں میں مصروف رہتی، کبھی کبھی اس کی یہ دعا میرے کان تک بھی پہنچ جاتی ''یااللہ! جس طرح چھوڑ کر آئی ہوں اسی طرح جا کر باپ کو دیکھوں۔''

میں سن کر دل میں کہتا ''یہ کیسی انہونی سی دعا کر رہی ہے۔اس کو خاتمہ بالخیر کی دعا کرنی چاہیے۔'' پھر ہفتے، مہینوں میں بدلتے گئے اور مہینے سالوں میں۔اور ۱۹۷۸ء میں سات سال بعد میں جب اس ''اچانک چھٹی'' پر گیا تو اہلیہ کے والد نہ صرف زندہ سلامت تھے، بلکہ پہلے سے بہتر حالت میں نظر آئے، بڑھاپا تھا لیکن بیمار نہ تھے، چلتے پھرتے تھے۔وہ بیمار اور بوڑھا انسان جس کی زندگی کے سات دن کی امید نہ تھی وہ سات برس تک زندہ وسلامت رہا۔اور وہ جوان بھائی جس کو کبھی ہم نے بیمار نہ دیکھا تھا۔وہ بقول شخصے ''باپ کا کفن چھین کر قبر میں جا لیٹا تھا۔'' اُس کی حکمت عمیق اور قدرت کے رنگ نرالے ہیں۔

تین ماہ تک باپ کے پاس رہ کر جب اہلیہ واپس نائیجیریا آئی تو کچھ عرصہ بعد ہی والد وفات پا گئے تھے۔بہت بروقت تھا میرا وہ اچانک چھٹی لینا ورنہ وہ باپ کے دیدار سے محروم رہ جاتی۔اب سوچتا ہوں کہ اگر وہ اپنی خصوصی دعاؤں میں باپ کے ساتھ بھائی کو بھی شامل رکھتی تو بعید نہ تھا بھائی سے بھی مل پاتی۔چند ماہ ہی کا تو فرق رہا۔سچ ہے کہ دعاؤں کا دامن تنگ اور محدود نہ رکھنا چاہیے۔نہ ہی کسی کو دعاؤں سے بالا اور بے نیاز سمجھنا چاہیے۔ہر ایک کو ہر آن اس کے فضل کا سایہ اور سہارا درکار رہے۔

زیورچ-ایتھنز اور روم کی سیر

زیورچ میں دو دن گزارنے کا موقع ملا۔وہاں مسجد احمدیہ گئے۔مبلّغ انچارج مولانا نسیم مہدی صاحب سے ملاقات ہوئی، شہر کی سیر کی۔''کیبل کار'' کے ذریعہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نظارہ کیا۔دوپہر کو باغ کی سیر کرتے ہوئے میں نے بچوں کو ایک بنچ پر بٹھایا اور خود سامنے ایک بڑے ہوٹل میں کچھ کھانے کو لینے چلا گیا۔ہوٹل کی چوتھی منزل پر ریسٹوران تھا۔میں نے وہاں جا کر بیرے سے پوچھا ''روسٹ چکن ہے؟'' اس نے جواب دیا ''ہاں مل جائے گا۔''

میں نے قیمت پوچھی تو اس نے بتایا: ''اٹھارہ مارکس''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے ایک دے دو۔''

اس نے میز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔''بیٹھو''

میں نے کہا کہ ''میں نے یہاں نہیں کھانا۔باغ میں بچے بیٹھے ہیں، وہاں ہم سب کھائیں گے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا ''تم یہاں اجنبی معلوم ہوتے ہو، ادھر آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے ایک کھڑکی کے پاس لے گیا اور کھڑکی سے سر نکال کر نیچے اشارہ کیا اور کہا ''وہ دیکھو سڑک کے کنارے دوکان جہاں لائن لگی ہے۔وہاں تمہیں چپس اور چکن مل جائے گا اور بہت سستے مل جائیں گے، یہاں بہت مہنگا پڑے گا۔'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے پانچ مارکس میں چپس اور چکن خرید کر لے گیا۔

ایتھنز کی ''وزٹ''

ایک دفعہ لندن سے پاکستان جاتے ہوئے ایتھنز کو دیکھتے گئے۔ رات ہوٹل میں ٹھہر کر اگلے روز بعد دوپہر کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ایمیگریشن پولیس نے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیے اور کہا کہ یہاں انتظار کریں۔ ہوٹل کا مالک تمہیں یہاں سے آ کر لے جائے گا۔ انہوں نے کسی کو فون کر دیا تھا۔ آج کل یونان مالی مشکلات میں گھِرا ہوا ہے۔ لیکن پچیس تیس سال پہلے جب ہم وہاں سے گزر رہے تھے تو صحت اُس ملک کی اُس وقت بھی کچھ اچھی نظر نہ آئی تھی۔ یورپ کا ''مردِ بیمار'' ہی دکھائی دیتا تھا یہ ملک۔ بہرحال ہم ایئر پورٹ پر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا اور ایک چھوٹی، پرانی سی گاڑی میں ہمیں اپنے ہوٹل لے گیا۔ لاؤنج تقریباً خالی تھا۔ معمولی سا فرنیچر تھا اور ٹی وی ''بلیک اینڈ وائٹ'' تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ ہمیں ملا جس کے ساتھ ایک سٹور قسم کی جگہ تھی۔ جس میں بستر ڈال کر بچوں کا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ بالکونی البتہ اچھی تھی جس سے ہم سمندر کا نظارہ خوب کر سکتے تھے۔ تاریخ کے ہزاروں اوراق جلد جلد پلٹتے ہوئے میں نے بچوں کو بتایا دیکھو یہ ہے وہ ساحل جہاں سے کبھی سکندرِ اعظم اور دیگر فاتح جرنیلوں کا بحری بیڑا روانہ ہوا ہو گا۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور شہر کے تاریخی مقامات خصوصاً ''اکروپولس (Acropolis)'' دیکھنے چلے گئے۔ وہاں گھومے، فوٹو بنائیں اور مغرب کے بعد واپس لوٹے۔

رات کے کھانے کا انتظار کرنے لگے، ہوٹل کا مالک گاڑی لے کر کہیں گیا اور بہت دیر کے بعد واپس آیا۔ آدھی رات کے قریب ہمیں ایک ایک مالٹا اور پلیٹ بھر کر بند گوبھی پیش کر دی گئی۔ ہم نے پروٹیسٹ کیا اور کہا کہ اس سے تو رات نہ گزرے گی۔ عذر پیش کیا گیا کہ کچن بند ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا ہمیں کچن دکھاؤ ہم خود کچھ کر لیں گے۔ ہمیں وہاں انڈے مل گئے اور کچھ باسی ڈبل روٹی بھی، چنانچہ گزر بسر کر لی۔

صبح بغیر ناشتہ دیئے ہمیں ائیر پورٹ چھوڑ آیا۔ بل پہلے ہی لے لیا تھا اس نے۔ کہتا تھا کہ ناشتہ ہوائی جہاز میں ملے گا۔ دوپہر ایک بجے کی فلائٹ لے کر ہمیں کراچی جانا تھا۔ ائیر پورٹ پر ہم نے پاسپورٹ مانگے تو وہ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ پھر ایک سپاہی گاڑی لے کر دوسری ائیر پورٹ بھاگا گیا۔ وہاں سے پاسپورٹ لے کر آیا تو ہماری گھبراہٹ دُور ہوئی اور فلائٹ کی روانگی سے آدھ گھنٹہ پہلے ہم چیک اِن کر سکے۔ ''دلفتھنزا'' کی فلائٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا تو جان میں جان آئی۔ کھانا کیا کھایا ''آٹھ پہرہ'' روزہ افطار کیا تھا۔

ایتھنز ایئر پورٹ سے نکلے تو کراچی جا پھنسے۔ کراچی سے لاہور میری بکنگ کنفرم تھی لیکن مسافروں کی لائن تھی کہ چل ہی نہ رہی تھی۔ میں نے آگے جا کر پوچھا تو بتایا کہ جہاز تو فل ہے۔ آپ لیٹ آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ''میں آدھ گھنٹہ سے لائن میں ہوں اور ابھی فلائیٹ میں گھنٹہ پڑا ہے، میری سیٹیں کنفرم ہیں۔'' جواب ملا کہ ''ہمارے پاس لسٹ میں آپ کا نام نہیں۔''

میں نے ایڑیاں اٹھا کر اور عینک کو ذرا سیٹ کر کے دیکھا تو اس کی لسٹ میں پانچواں یا چھٹا نام میرا لکھا تھا۔ میں نے کہا کہ "نام تو میرا ہے۔ میں افریقہ، یورپ سے ہوتا ہوا آیا ہوں اور برسوں بعد آیا ہوں، مجھے اس جہاز پر ضرور جانا ہے۔ لاہور ایئرپورٹ پر میرے عزیز رشتہ دار پریشان ہوں گے اگر میں نہ گیا تو۔" اس نے نرم لہجے میں کہا کہ "ایمرجنسی میں آپ کی سیٹیں دے دی گئی ہیں، اگلی فلائیٹ میں آپ کو چڑھا دیں گے۔" میں نے گھبرا کر کہا کہ "جس فلائیٹ میں میری سیٹیں کنفرم ہیں اس میں میں چڑھ نہیں سکتا۔ دوسری فلائیٹ کے لیے تو لائن ابھی سے بہت لمبی لگی ہے، اس میں کیسے چڑھ پاؤں گا۔"

اس نے تسلّی دلاتے ہوئے کہا "فکر نہ کریں میں چڑھا دوں گا۔" وہ کھڑکی بند کر کے چلا گیا اور ہم گھنٹہ بھر پریشان حال کھڑے رہے۔ دوسری فلائیٹ کی "چیک اِن" جلد ہی شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہی افسر نظر آیا تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے "چیک اِن" کرنے والے افسر سے بات کی اور پھر میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ میں نے ٹکٹ دیئے اور بورڈنگ کارڈ لیے۔ اُدھر لاہور ایئرپورٹ پر عزیز و اقارب نے سمجھ لیا تھا کہ فلائیٹ مِس ہوگئی ہوگی۔ لہٰذا وہ دوسری فلائیٹ کا انتظار کرتے رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا نہ آخری کہ وطن پہنچ کر ایسے جھٹکے لگے کہ یورپ کے پُرسکون سفر اور پُرلطف سیر کا سارا مزا کِرکرا ہو گیا۔ میں تو لینڈنگ کے اعلان کے ساتھ ہی ٹائی وغیرہ اتار، بٹن کھول کر ہر قسم کے سلوک کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے لگتا تھا کہ اب اپنوں سے واسطہ پڑے گا۔ تاہم ایک دو دفعہ تو "حسنِ سلوک" نے "خوشکن سرپرائز" بھی دی۔

روم کی سیر۔ ایک انوکھا تجربہ

نائیجیریا میں قیام کے دوران یوں تو کئی یورپی شہروں کی سیر کی لیکن روم جانا ایک عجب روحانی تجربہ تھا۔ قدیم رومن ایمپائر کے پایۂ تخت ہونے کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عیسائیت کے غریبانہ آغاز، شاہانہ عروج اور روحانی انحطاط کے حوالے سے بھی یہ شہر ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

ہمارے ہوٹل کے قریب ہی وہ "کلوزیم" تھا جہاں رومن بادشاہ ابتدائی عیسائیوں کو انتہائی ظلم وستم کا نشانہ بنایا کرتے تھے اور بھوکے شیروں کو اُن پر چھوڑ کر تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ کئی منزلوں پر مشتمل اور گول دائرہ کی شکل میں تعمیر کردہ اس وسیع و عریض تھیئٹر کی بوسیدہ عمارت اب بھی کافی حد تک موجود ہے اور اس کے صحن میں کھیلے جانے والے خونی ڈراموں کی وحشت و بربریت کی آئینہ دار ہے۔ عمارت کے تہہ خانوں میں شیروں کے پنجرے اور قیدیوں کے پنجرہ نما قید خانے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اگر ذرا نظریں جھکائیں تو نیم وا آنکھوں سے دھاڑتے شیروں کو اُن معصوم اور مجبور عیسائیوں پر جھپٹتے اور ہزاروں تماشائیوں کو ان کی ہلاکت پر خوشی سے شور مچاتے بھی دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ یہ نقوش وارتعاش تو اس ماحول اور در و دیوار سے مٹنے والے نہیں۔ کچھ فوٹو تو ہم نے کیمرہ سے بنائیں۔ لیکن زیادہ تر وقت تو ہم نے اُن تصویروں کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرنے میں گزارا۔ جو ہم نے چشمِ تصوّر سے اُن جانثار عیسائیوں کی بنائیں جنہوں نے خدائے واحد کے نام پر جان و جسم کے

نذرانے پیش کیے اور جو بے مثال صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ایمان پر اپنے خون سے مہریں ثبت کر گئے۔

خوف وغم سے بھرے دلوں اور بوجھل قدموں کے ساتھ ہم وہاں سے آہستہ آہستہ اُترنے لگے۔ اچانک اندر سے آواز آئی "جاتے کہاں ہو، تم بھی تو مسیحی ہو اور اُسی دَور میں ہو۔ وہی دعویٰ ایمان اور تصور سے ہی گھبرا رہے ہو۔" میرے قدموں میں اب تیزی آ گئی تھی اور خوف وغم کی جگہ اب خِفّت وندامت نے لے لی تھی۔

سیڑھیاں پیلاطوس کی عدالت کی

"کلوزیم" کی سیر روحانی کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اس سے کہا کہ دوتین تاریخی مقامات دکھا دے۔ وہ ہمیں ایک ایسے گرجا میں لے گیا جہاں وہ "سیڑھیاں" ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام چڑھ کر پیلاطوس کی عدالت میں پیش ہوئے تھے۔ وہ عدالت تو یروشلم میں تھی اور یہ روم تھا۔ لکھا تھا کہ اِن سیڑھیوں کا یروشلم سے پورا بلاک ہی اُٹھا کر یہاں لایا گیا ہے۔ کافی مضبوط پتھر کی سیڑھیاں ہیں جیسی پرانے محلّات وغیرہ کی ہوتی ہیں۔ لوگ تبرکاً اُن پر چڑھتے تھے، ہم بھی چڑھے، بعض عقیدت مند خصوصاً عورتیں تو گھٹنوں کے بل اُن پر ٹھہر ٹھہر کر دعائیں مانگتی چڑھ رہی تھیں۔ کافی چوڑی اور اُونچی تھیں پندرہ بیس تو ہوں گی۔

سینٹ پال چرچ - ایک بُت خانہ

پھر وہ ہمیں سینٹ پال چرچ لے گیا۔ بڑے بڑے ستونوں اور پتھروں سے تعمیر کردہ یہ عظیم چرچ بہت وسیع تھا۔ اس کے بڑے ہال میں دیکھا کہ چاروں طرف دیوقامت مجسّمے حواریوں کے نام پر بنا کر کھڑے کر رکھے تھے۔ چرچ کیا تھا آذر کا بُت خانہ تھا جو کسی ابراہیم کا منتظر تھا۔

"کلوزیم" کے فوراً بعد یہ چرچ دیکھ کر دماغ بھنّا سا گیا تھا۔ ایک وہ مسیحی تھے کہ توحید کی خاطر جانیں قربان کر دیں اور اب یہ مسیحی ہیں کہ بدترین قسم کی بت پرستی میں ملوث ہیں۔ کہاں وہ عظمت اور کہاں یہ گراوٹ۔ یہ حضرتِ انسان بھی عجب مخلوق ہے۔ "اُس ایک خدا" کے سوا اسے ہر دوسرا "خدا" قبول اور محبوب ہے۔ جس دلدل سے نکالنے کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار رسول آئے اس سے یہ نکل کر، نہا دھو کر، پھر آہستہ آہستہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسی کیچڑ میں جا دھنستا ہے۔ سینٹ پیٹرک کا چرچ بہت مشہور تھا لیکن راستہ بند ہونے کی وجہ سے وہاں نہ جا سکے۔ شام دیر سے واپس ہوٹل آئے۔ دوسرے دن شہر گھومنے کا پروگرام تھا۔

کیٹا کومبز (Cata Combs) کی زیارت

دوسرے روز صبح میں نے ہوٹل کے "انفارمیشن کاؤنٹر" پر جا کر کہا کہ میں روم کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے دو پروگرام دے کر کہا کہ اِن میں سے ایک چن لو اور وہ سامنے بس سٹاپ پر دس بجے پہنچ کر بس پکڑ لو۔ وہ دوتین گھنٹہ میں شہر کا چکر لگا کر واپس لے آئیں گے۔

میں نے وہ دونوں پروگرام دیکھے۔ان میں سے ایک کے آخر پر''Catacombs'' لکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ تفسیر کبیر میں سورۃ کہف کی تفسیر پڑھتے ہوئے میں نے ان''کیٹا کومبز'' کے بارے میں پڑھا تھا کہ یہ وہ غاریں ہیں جن میں ابتدائی عیسائیوں نے ظلم وستم سے بچنے کے لیے پناہ لی تھی اور برسوں وہاں چھپ کر زندگی گزارتے رہے تھے۔ میں نے وہ پروگرام چن لیا اور بچوں کو تیار کر کے مقررہ وقت پر متعلقہ بس پکڑ لی۔بس شہر کے مختلف مقامات دکھاتی رہی جن سے مجھے کچھ دلچسپی نہ تھی اور نہ اب کچھ یاد ہے کہ کیا دیکھا۔ مجھے تو آخری سٹاپ کا انتظار تھا،گھوم پھر کر بس شہر سے باہر ایک کھلے میدانی سے علاقے میں جا کر رُکی، یوں لگتا تھا جیسے اُجڑا ویران سا کوئی باغ ہو۔ایک چھوٹا سا کٹیا نما کمرہ تھا جس کا بڑا سا دروازہ تھا۔اس کے پاس ایک سانولے رنگ کا شخص ہمارا منتظر تھا۔ہم دس پندرہ ٹورسٹ اس کے گرد کھڑے ہو گئے۔اس نے چند منٹ میں ہمیں تعارف کرایا کہ ہم کیا دیکھنے جا رہے ہیں۔ مجھے تو پہلے سے کچھ معلوم تھا لیکن دوسرے مسافر سوال و جواب کر کے اپنی تسلی کرتے رہے۔ مجھے کچھ گھبراہٹ تو محسوس ہوئی لیکن فکر اپنے پانچ سالہ بچے کی تھی جو میری انگلی تھامے تھا۔''گھبرانا نہیں،شاباش،میری انگلی چھوڑ دو اور اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔''میں نے اس کو حوصلہ دِلایا۔بٹی ماں کے ساتھ ہو گئی۔ہمیں ہدایت دی گئی کہ سب آگے پیچھے ایک لائن میں چلیں گے۔اور گائیڈ کے پیچھے چلتے جائیں گے۔غاروں کی شاخیں ہیں۔ان میں جو گیا وہ واپس نہ آسکے گا۔فوٹو گرافی منع تھی کہ دیواریں کچی اور بھر بھری ہیں جن پر''فلیش لائٹ'' برا اثر ڈالتی ہے۔

ہم دروازے میں داخل ہو کر دو تین قدم نیچے اُترے اور پھر غار میں چلنے لگے۔شاخوں کو ڈنڈا لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ غار کی دیوار میں ایک دو جگہ انسانی ڈھانچے بھی نظر آرہے تھے۔اُن کے باسی تدفین بھی اندر ہی کرتے تھے۔ایک جگہ کچھ کھلی تھی۔ دیوار پر کچھ نقش نگار تھا۔گائیڈ نے بتایا، یہ مسجد ہے، یہاں عبادت ہوتی تھی۔ پھر آگے چلے اور ایک اور کھلی جگہ پر رکے۔گائیڈ نے پوچھا کچھ اندازہ ہے کہ ہم سطح زمین سے کتنا نیچے آگئے ہیں۔لوگوں نے دس، پندرہ بیس فٹ کا اندازہ لگایا۔ پھر گائیڈ نے اُوپر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔وہ دیکھو اُوپر۔اُوپر دیکھا تو ایک سوراخ سے روشنی کی کرنیں آرہی تھیں۔دیکھتے ہی گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم چالیس پچاس فٹ نیچے آچکے تھے۔اس نے کہا''ابھی ایسی چار منزلیں اور نیچے ہیں، یہ چھوٹا سا چکر محض نمونۃً ہے۔'' آگے چلے اور گھوم کر پھر دروازے کے پاس آنکلے اور پھر باہر آگئے۔ غاروں کے اندر ہلکی سی روشنی تھی لیکن جو شاخیں غاروں کی تھیں اُن میں مکمل گھپ اندھیرا تھا۔ایک آدمی کے لیے اچھی کھلی اور اُونچی تھیں۔تنگی اور گھٹن محسوس نہ ہوتی تھی۔

واپس ہوٹل پہنچ کر میں نے سوچا کہ زیرزمین اس بیس پچیس منٹ کی سیر پر بیس پچیس سال کی وہ سب سیریں قربان ہیں جو زمین کے اُوپر اب تک کرتا رہا ہوں۔وہ چند سانسیں جوان غاروں میں لیں زندگی کی اہم ترین سانسیں تھیں کہ یہ اس فضا میں لیں جہاں کبھی وہ آفاقی وجود بستے تھے جن کا ذکر خدا نے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا۔جنہوں نے خدا کے فرستادہ مسیح پر ایمان میں ایسی استقامت دکھائی کہ دنیا مافیہا کو ٹھکرا کر غاروں کو اپنی آماجگاہ بنا لیا اور اس طرح دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کی لافانی اور لاثانی

مثالیں قائم کر گئے۔

سفر میں انسان Suffer بھی کرتا ہے

یوں تو سفر ذریعۂ ظفر ہوتا ہے لیکن اس میں پریشانیاں بھی پیش آ جاتی ہیں۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ لمبے سفر کی بکنگ وغیرہ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ہی کروالوں۔ سیٹیں ہر طرح سے کنفرم کرواتا اور Connecting فلائیٹس بھی جہاں تک ممکن ہوتا آرام دہ لیتا۔ تاکہ دورانِ سفر کوئی پریشانی نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ پریشانیاں پیدا ہو جاتی رہیں۔

نائیجیریا میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۰ء تک قیام کیا اور ان اُنیس سالوں میں ایک بار انگلینڈ تین ہفتہ کے لیے گیا اور تین بار تین تین ماہ کی چھٹی پر پاکستان گیا۔ اس طرح تقریباً ایک سال ٹوٹل چھٹی لی۔

ماسکو کی سیر جو نہ ہوسکی

پہلی بار ۱۹۷۸ء میں پاکستان گئے۔ اُن دنوں بہت سے پاکستانی ٹیچر اجی بواوڈے اور ارد گرد کے دیہات میں کام کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک دو نے بتایا کہ وہ کراچی سے کابل، ماسکو ہوتے ہوئے آئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ پاکستان جاتے ہوئے ماسکو کی جھلک بھی دیکھ لی جائے۔ چنانچہ میں نے لیگوس سے لندن، ماسکو، کابل کراچی کی بکنگ کرالی۔ روانگی سے ڈیڑھ ماہ پہلے بکنگ کرا کر میں نے ماسکو کا ویزہ حاصل کر لیا۔ پاسپورٹ پر ویزہ نہ دیا تھا، الگ ایک ورقہ سا بنا دیا تھا۔

تیاری تو مکمل کر لی لیکن لندن سے ماسکو سیٹیں کنفرم نہ ہوتی تھیں۔ اگر یہ کنفرم ہو بھی جاتیں تو آگے ماسکو سے کابل کی سیٹیں نہ ملتی تھیں۔ ایک ماہ لیگوس میں کوشش کی اور پھر لندن جا کر دس دن تک کوشش کرتا رہا لیکن کنفرم سیٹیں نہ ملیں۔ بالآخر میں نے اس کو الٰہی اشارہ سمجھا اور ارادہ ترک کر دیا۔ میں K.L.M کے دفتر گیا اور اُن سے کہا کہ میں لندن براستہ ماسکو نہیں بلکہ اب سیدھا کراچی جانا چاہتا ہوں۔

K.L.M کے افسر نے دیر تک حساب کتاب کر کے کہا کہ سیدھا کراچی جانے کے لیے آپ کو کچھ مزید رقم ادا کرنی ہوگی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سیدھا جانا مہنگا کیسے ہو گیا۔ جبکہ یہ نزدیک ترین راستہ ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ہمارے حساب اور طرح سے ہوتے ہیں۔ کچھ سیکٹرز کا حساب ہوتا ہے۔ میں بضد رہا کہ میں مزید پاؤنڈز ادا نہیں کر سکتا۔ میرے چھ ٹکٹ تھے۔ کچھ سوچ کر اُس نے کہا ''اچھا'' میں ''دانستہ'' اپنے حساب کتاب وغیرہ میں چھوٹی سی غلطی کر کے ٹکٹ تو تمہیں نئے جاری کر دیتا ہوں لیکن اب تم ان کو استعمال کر لینا۔ اگر ان کو تبدیل دوبارہ کروایا تو غلطی پکڑی جائے گی اور تمہیں مزید رقم دینی پڑے گی۔ چنانچہ ایمسٹرڈم کی سیر کرتے ہوئے پاکستان پہنچ گئے۔

تین ماہ بعد میری واپسی کراچی سے سیدھا نیروبی ہوتے ہوئے لیگوس تک بُک تھی۔ لیکن کراچی میں ہی پھنس کر رہ گئے۔

تھکے ہارے تو ہم لاہور سے ہی روانہ ہوئے تھے۔ کراچی سے رات تین بجے کینیا ائیرویز کی فلائیٹ تھی۔ ہوٹل میں بچے تو سو گئے لیکن میں جاگتا رہا۔ میں فون پر ہوٹل کی انتظامیہ سے پوچھتا رہا کہ ''وین'' ہمیں لینے کب آئے گی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ آپ سو جائیں۔ آپ کو اطلاع دے دیں گے جب فلائیٹ تیار ہوگی۔ دوسری رات بھی اسی طرح تین بجے کا ہی کہہ رہے تھے۔ لیکن ساری رات خراب کیا۔ پھر تیسری رات کہیں جا کر فلائیٹ آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسافر کم تھے لہٰذا ایک فلائیٹ کے مسافروں کو دوسری فلائیٹ سے تین دن بعد اکٹھا ہی لے جانا تھا۔ اگر یہ بات پہلے بتا دیتے تو آرام سے سو بھی لیتے اور کراچی کی سیر بھی کر لیتے۔ نیروبی میں شکر ہے ایتھوپین ائیر لائن کی فلائیٹ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اُترتے ہی اس میں سوار کرا دیا اور لیگوس پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر میں دو ہفتہ بیمار رہا تھا۔ تھکاوٹ، بے خوابی اور پریشانی سے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا تھا اور بخار ہو گیا تھا۔

دوسرا چکر پاکستان کا ۱۹۸۱ء میں لگایا تھا۔ یورپ سے ہوتے ہوئے پاکستان خدا کے فضل سے ٹھیک پہنچ گئے تھے۔ واپسی پر کراچی سے چند گھنٹے تاخیر سے اُڑے تو آگے نیروبی سے فلائیٹ مِس ہو گئی اور اب کے دو روز نیروبی میں رُکنا پڑا۔ تاہم یہ نیروبی میں رُکنا کچھ زیادہ مہنگا نہ پڑا تھا۔ پریشانی تو ہوئی تھی، لیکن نیروبی کی سیر کر لی تھی اور سفاری پارک کا چکر لگا لیا تھا۔ اس سفاری پارک میں کوئی خاص جانور تو دیکھنے کو نہ ملے تھے، گرمی تھی اور دھوپ سے بچنے کے لیے جانور بھی چھپ رہے ہوں گے، دور ہی سے کبھی کبھی وین روک کر دکھا دیا تھا کہ وہ چیتا درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ اور وہ شیر سائے میں سو رہا ہے۔ البتہ بھینسوں کا ریوڑ خاصہ بڑا تھا اور قریب لے جا کر دکھا دیا تھا۔ انگریز سیاح تو بڑے فوٹو شوٹو بنانے لگے تھے اُن بھینسوں کی جبکہ ہم اُن کے اس شوق پر ہنس رہے تھے کہ یہ بھینس تو ہمارے پاکستان میں گلی محلوں میں عام ہیں۔ یہاں آبادی سے دور کیچڑ سے لت پت اگر یہ جنگل میں جنگلی نظر آتی ہیں تو اس میں اُن غریب بھینسوں کا کیا قصور۔ یہاں یہ ''بن سنور'' کر گھریلو نظر آنے سے تو رہیں۔

مجھے یاد آیا کہ نائیجیریا میں ایک روز مقامی دوستوں سے بات کرتے ہوئے میں نے اُن کو بتایا کہ ہمارے گھر میں بھینس ہوتی تھی جس کا دودھ ہم پیتے تھے اور دہی مکھن وغیرہ بھی کھاتے تھے۔ اس پر انہوں نے سخت حیران ہو کر پوچھا کہ یہ بھینس تو خطرناک جنگلی جانور ہوتا ہے۔ گھروں میں آپ کیسے رکھ لیتے ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ پاکستان میں تو یہ ایک گھریلو پالتو جانور ہے اور لوگ ان کو گھروں میں پالتے ہیں۔ انڈیا میں تو لوگ ہاتھی بھی گھروں میں پال لیتے ہیں اور ان سے باربرداری کا بھاری کام لیتے ہیں۔ میں نے کہا یہ حیوانوں کے بچے ہیں۔ پیار سے سیکھ بھی جاتے ہیں اور سُدھر بھی جاتے ہیں۔ انسانوں کے بچے نہیں جو پیار سے بگڑ جاتے ہیں۔

چانس پیسنجر۔عجب تجربہ

۱۹۸۶ء میں تیسری مرتبہ اور آخری مرتبہ نائیجیریا سے پاکستان گیا۔ جاتے ہوئے تو سیدھا ہی گیا لیکن واپسی کراچی سے پیرس، لندن ہوتے ہوئے رکھی تھی۔ لیگوس سے روانہ ہونے سے ڈیڑھ ماہ پہلے بکنگ آنے جانے کی ہر طرح سے کنفرم کروا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن واپسی پر عجب پریشان کُن صورتحال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

لاہور سے واپسی پرواز سے تقریباً دو ہفتہ پہلے ایک دوست کو واپڈا ہاؤس میں کچھ کام تھا۔ میں بھی ساتھ چلا گیا۔ وہاں ''ایئر فرانس'' کے دفتر کے سامنے سے گزرے تو میں نے ایسے ہی اس میں گھس کر بات کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو ''ایئر فرانس'' سے کراچی سے پیرس جا رہا ہوں اور ساتھ ہی میں نے بکنگ کا ''پرنٹ آؤٹ'' اس کو دکھا دیا۔ اس شریف آدمی نے کمپیوٹر میں دیکھ کر بتایا کہ کراچی سے پیرس آپ کی سیٹیں کنفرم نہیں ہیں۔ آپ ''ویٹنگ لسٹ'' پر ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو آنے جانے کا سارا پروگرام کنفرم کروا کر چلا تھا۔''

اس نے ''پرنٹ آؤٹ'' پر چھوٹا سا نشان دکھا کر کہا کہ اس کا مطلب ''ویٹنگ'' ہی ہوتا ہے۔ چونکہ واپسی میں ابھی تین چار ماہ کا وقفہ تھا لہٰذا لیگوس والے دفتر نے تمہیں اس امید پر کنفرم کہہ دیا ہوگا کہ تین چار ماہ میں تو سیٹیں مل ہی جائیں گی۔ لیکن ابھی تک کنفرم نہیں ہو سکیں۔ ''ایئر فرانس'' کا جہاز مشرق بعید سے آتا ہے اور اکثر فل ہی آتا ہے۔

یہ صورت حال میرے لیے بہت پریشان کن تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے تو آگے افریقہ جانا ہے اور ضرور جانا ہے۔ لہٰذا کچھ کرے کہ میں جا سکوں۔ اُس نے کہا کہ وہ کراچی دفتر میں فیکس کرے گا۔ اور مجھے اگلے روز آنے کو کہا۔ میں دوسرے روز گیا تو کراچی سے جواب تھا کہ ''سیٹیں کنفرم نہیں ہو سکتیں'' وہ فیکس کرتا رہا اور میں چار پانچ دن وزیر آباد سے لاہور جا کر پتہ کرتا رہا۔ لیکن جواب وہی ہوتا تھا کہ ''نہیں، کنفرم نہیں ہو سکتیں۔'' پھر ایک دن گیا تو فیکس یہ آئی تھی کہ ''ڈاکٹر سے کہو کہ کنفرم تو سیٹیں نہ ہو سکیں گی، تاہم ہر جہاز پر دو چار سیٹیں خالی جاتی ہیں۔ وہ یہاں کراچی آ کر چانس لے تو کسی نہ کسی جہاز میں اس کی فیملی سما سکتی ہے۔''

فیکس میں دو دن بعد جانے والی ایک فلائیٹ کا ذکر بھی تھا کہ وہ کراچی سے رات ایک بجے گزرتی ہے اس میں اچھا چانس ہے۔ میں نے اس ایئر فرانس کے منیجر سے کہا کہ مجھے کل ہی کراچی نکال دو۔ میں کراچی جا کر انتظار کر لوں گا۔ لیکن اب پرابلم یہ آن پڑی کہ لاہور سے کراچی کی سب پروازیں فل تھیں۔ اگلے روز ہی نہیں، اگلے کئی روز تک کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ اور مجھے تو پانچ درکار تھیں۔ وہ چونکہ میری پریشانی سمجھ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے کچھ سوچ کر کہا ''میں تمہارے ٹکٹوں پر کل صبح کی فلائیٹ کے ''Ok'' سٹیکر لگا دیتا ہوں، تم ذرا جلدی ایئر پورٹ پہنچ کر ''چیک اِن'' کر لینا۔ ایئر پورٹ پر ابھی کمپیوٹر نہیں ہیں اور کوئی صورت نہیں تمہیں یہاں سے نکالنے کی۔''

میں لاہور سے بھاگا بھاگا شام کو وزیرآباد پہنچا اور بچوں کو فوری طور پر تیار ہونے کو کہا۔ بھگدڑ سی مچ گئی۔ سب پوچھ رہے تھے کہ ایسی اچانک کیا ایمرجنسی آن پڑی کہ ہفتہ بھر پہلے ہی واپسی کروالی ہے۔ اصل بات میں پوری بتا نہیں سکتا تھا۔ بس کہہ دیا کہ بکنگ کا مسئلہ ہے۔ کپڑے دھلے تھے، گیلے ہی پیک کر لیے اور بچوں کو لے کر بس پکڑی اور لاہور آکر ہوٹل میں رات گزاری تا کہ صبح کی فلائیٹ پکڑ سکوں۔ ذرا جلدی ''چیک اِن'' کرنی تھی ناں۔

مکرم برادرم شکیل احمد منیر صاحب نائیجیریا میں پروفیسر تھے۔ بڑے فدائی احمدی اور داعی الی اللہ تھے۔ اُن کے بہنوئی کرنل سعید صاحب کراچی میں رہتے تھے۔ اُن کے ہاں ہم کراچی میں ٹھہر چکے تھے۔ لاہور سے ہی میں نے اُن کے ہاں فون کر دیا تھا کہ میں صبح کراچی پہنچ رہا ہوں۔ اُن کے بیٹے خالد سعید نے ہمیں کراچی میں ''وصول'' کیا۔ یہ خالد سعید بہت ہونہار اور سعادت مند لڑکا تھا اور یہ بھی نائیجیریا میں اپنے ماموں شکیل احمد منیر کے پاس رہ چکا تھا اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اب کراچی میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔

کراچی اترتے ہی میں نے ایک ''ایئر فرانس'' کے باوردی افسر کو دیکھا۔ میں نے اس کو فیکس دکھا کر کہا کہ کل رات کی فلائیٹ سے مجھے پیرس جانے کے لیے چانس لینا ہے۔ اس نے فوراً کہا۔ آج رات بھی ہماری فلائیٹ پیرس جارہی ہے۔ اس میں بھی کوشش کرو۔ اس میں چانس زیادہ ہے۔ رات نو بجے ائیر پورٹ پہنچ جانا۔ رات بارہ، ایک بجے فلائیٹ گزرے گی۔ میرا پروگرام تو رات کرنل صاحب کے ہاں ٹھہرنا تھا اور دوسرے روز خالد نے ہمیں کراچی کی سیر کرانی تھی، لیکن یہاں تو کراچی لینڈ کرتے ہی پروگرام بدل گیا۔ میں نے خالد کو بتایا کہ آج رات نو بجے ہی ہمیں واپس ائیر پورٹ لانا ہوگا۔ چنانچہ ہم گئے۔ کچھ دیر آرام کیا۔ رات کا کھانا کھایا اور پھر خالد ہمیں ائیر پورٹ لے آیا۔ ہم نے خالد سے کہا۔ بھائی! انتظار کرنا، اگر تو ہمیں جہاز میں جگہ مل گئی تو بہتر، ورنہ پھر گھر لے جانا۔ وہ غریب باہر ہی کئی گھنٹہ انتظار کرتا رہا تھا کیونکہ سکیورٹی والوں نے اس کو ہال میں داخلے کی اجازت نہ دی تھی۔

ہم نے اندر جا کر بتایا کہ ہم ''چانس پسنجر'' ہیں۔ ہمیں ہال میں ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ مسافر آتے اور چیک اِن کرتے رہے۔ آخر بارہ بجے کے قریب مسافروں کی آمد کچھ تھم سی گئی تھی۔ ایک افسر ہاتھ میں ''واکی ٹاکی'' لئے صورتحال کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر جا کر کچھ مشورہ کیا اور جہاز میں سیٹوں کی پوزیشن دیکھی اور پھر ہمیں کہا کہ ہم اپنے ٹکٹ، پاسپورٹ وغیرہ تیار رکھیں۔ اتنے میں دو مسافر اور آگئے۔ ہماری گھبراہٹ بڑھ گئی کہ سیٹیں دو اور کم ہوگئیں۔ بالآخر چیک اِن بند کر دی گئی۔ پھر اس افسر نے مشورہ کیا۔ نقشہ دیکھا اور پھر ''واکی ٹاکی'' پر جہاز کے عملہ سے بات کی۔ اور پھر ہمیں اشارہ کیا اور کہا ''آؤ جلدی کرو'' ہمارا سامان جلدی جلدی چیک اِن ہوا۔ ہمیں بورڈنگ کارڈز دیئے گئے۔ ہم نے شیشے کی دیوار میں سے ہی خالد سعید کا شکریہ ادا کیا۔

اشاروں سے ہی اُس سے سلام دعا لی اور الوداع کہا۔ اور پھر اندر چلے گئے۔ ایمیگریشن وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم ایک ہال میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہمیں جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔

جہاز کے اندر بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ایک دنیا اندر سو رہی تھی۔ ہم چوروں کی طرح دبے پاؤں اندر داخل ہوئے۔ مدھم سی ٹارچ کی روشنی میں ہمیں مختلف سیٹوں میں فِٹ کر دیا گیا۔ ہم سب اس طرح دبک کر بیٹھ گئے جیسے بغیر ٹکٹ سفر کر رہے ہوں۔ جب جہاز اُڑ گیا اور عملہ بھی اِدھر اُدھر ہو گیا تو ہم نے پر پُرزے نکالے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں، باتھ روم جانے کے بہانے میں اُٹھا اور ڈھونڈنے لگا کہ کون کہاں ہے۔ شکر ہے سب سے چھوٹے بیٹے کو ماں کے قریب ہی جگہ مل گئی تھی۔ باقی ہم تین اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

بڑے بیٹے نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا ''ہمیں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا؟''

میں نے آہستہ سے کہا ''چپ کر کے بیٹھے رہو، تم چانس پیسنجر ہو۔ اگر زیادہ چوں چراں کی تو وہ یہیں اتار دیں گے۔''

اسی طرح ''چانس پیسنجر'' ہونے کے حوالے سے ہلکے پھلکے چٹکلے چھوڑتے اور دبی زبان میں ہنسی مذاق کرتے ہمارا یہ سفر کٹا۔ صبح ناشتہ ملا تو ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''یہ شاید بھول گئے ہیں کہ ہم چانس پیسنجر ہیں۔'' یہ سفر بھی ایک انوکھا تجربہ تھا۔ واپسی کا سارا طے شدہ پروگرام اَپ سیٹ ہو گیا تھا۔ ایشیا سے یورپ اور پھر وہاں سے افریقہ تک کا سارا سفر بیوی بچوں کے ساتھ بغیر قبل از وقت ''کنفرمڈ'' بکنگ کے کرنا پڑا تھا۔ گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ بہت ہوئی تھی لیکن ہر قدم پر اللہ تعالیٰ نے مشکل آسان فرمائی تھی۔ واقعات پر پلٹ کر نظر ڈالوں تو اللہ تعالیٰ کا تائیدی ہاتھ صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ میرا لاہور میں واپڈا ہاؤس میں اچانک جانا اور ''ایئر فرانس'' کے دفتر میں دو ہفتہ روانگی سے پہلے گھس کر اپنی بکنگ کا ذکر کرنا محض اتفاق نہ تھا۔ اگر عین وقت پر پتہ چلتا کہ میں ''ویٹنگ لسٹ'' پر ہوں تو کیسی پریشانی ہوتی اور کراچی میں پھنس کر رہ جاتا۔ اسی طرح کراچی اُترتے ہی ایئر فرانس کے افسر کا اتفاقاً ملنا اور پھر اس کے مشورہ پر اُسی رات ''چانس'' لینا بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہی تھا۔ ورنہ دوسرے روز شاید جگہ نہ ملتی اور پھر نہ جانے کراچی میں کتنے روز رُکنا پڑتا۔ یہ ''چانس پیسنجر'' کا تو کبھی سنا نہ تھا۔ بس ایک تلخ تجربہ تھا جس سے ہمیں گزرنا پڑا تھا۔

زمینی سفر اور پریشانیاں

(تین واقعات)

پریشانیاں ہوائی سفر میں ہی نہیں، زمینی سفر میں بھی پیدا ہوتی رہیں اور بارہا پیدا ہوتی رہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پریشان کن حالات میں جس انداز سے مدد فرمائی اس سے وہ حادثات زندگی کے ایمان افروز تجربات میں بدل گئے تھے۔ تین واقعات لکھتا ہوں۔

1۔ ایک اتوار کو میں بچوں سمیت ایک شادی کی تقریب میں شمولیت کے لیے اجی بواوڈے سے لیگوس روانہ ہوا۔ صبح دس بجے کا وقت ہوگا۔ ایکسپریس وے پر ہم تیزی سے جارہے تھے۔ اتوار کی وجہ سے ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ڈیش بورڈ پر سرخ بتی روشن ہوگئی ہے۔ میں نے سڑک کی ایک طرف گاڑی روک لی اور انجن کو دیکھا تو ''فین بیلٹ'' ٹوٹی ہوئی تھی۔ میرے پاس ایک فالتو بیلٹ تھی اور میں نے بدلنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میرے پاس اوزار نہ تھے جس سے بدل سکتا۔ اِردگرد دیکھا۔ سب جنگل تھا۔ کوئی آبادی قریب نہ تھی۔ چھوٹے موٹے اوزاروں سے جو میرے پاس تھے میں نے پھر کوشش کی۔ لیکن بات بن نہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اس ورکشاپ کا خیال آیا جس کا منیجر میرا دوست تھا لیکن اس سے رابطہ ہوتو کیسے اور پھر وہ دن تو اتوار کا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔

میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ سخت گھبراہٹ میں دعا کررہا تھا۔ بچے گاڑی میں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ میں نے پھر ایک دفعہ کوشش شروع کردی۔ انجن پر جھکا میں زور لگا رہا تھا کہ میں نے اپنے کندھے پر بھاری ہاتھ محسوس کیا۔ خوفزدہ ہوکر میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ورکشاپ کا منیجر میرے سامنے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر'' اس نے پوچھا

میں نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے بتایا کہ لیگوس جارہا تھا اور یہ ''فین بیلٹ'' ٹوٹ گئی ہے اور مجھ سے یہ بدلی نہیں جا رہی۔ لیکن تم یہاں کہاں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے بتایا کہ وہ لیگوس سے آرہا تھا۔ ''ایکسپریس وے'' کی دوسری طرف سے اس نے مجھے اور میری گاڑی کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ گاڑی روک کر سڑک کی درمیانی دیوار پھلانگ کر وہ میرے پاس آگیا تھا۔ ''ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ پھر درمیانی دیوار پھلانگ کر گیا اور اپنی گاڑی سے ''ٹول بکس'' لے کر آیا اور چند منٹ میں اس نے فین بیلٹ بدل دی اور پھر ہم دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ بھر ہم اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر اور شکر کرتے رہے۔

2۔ دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ لیگوس ایئرپورٹ پر ایک دوست کو الوداع کہنے کے بعد ہم ''اجوکورو (Ojokoro)''

میں ڈاکٹر منور احمد صاحب کے ہاں چلے گئے۔ رات کھانے کے بعد ہم وہاں سے چلے تو دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔ اجوکورو سے ہم نے ایبے کوٹا (Abeokuta) روڈ لے کر اجی بواوڈے جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ نسبتاً قریب پڑتا تھا۔ یہ سڑک گو چھوٹی تھی لیکن اچھی نئی بنی تھی۔ رفتار ہماری خاصی تیزی تھی۔ ابھی بیس تیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ انجن میں کھڑ کھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور پھر انجن بند ہوگا۔ ہم نے چلانے کی کوشش کی لیکن آواز بتا رہی تھی کہ اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ دونوں طرف گھنا جنگل تھا۔ رات اندھیری تھی اور کوئی ٹریفک نہ تھی۔ ہمیں فوراً یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم ایک بہت خطرناک صورتحال سے دوچار ہو گئے ہیں۔ لُوٹ مار، قتل ڈکیتی اِن دِنوں عام تھی۔ گاڑی کو تو ہم بھول گئے۔ فکر ہمیں اپنی جانوں کی پڑ گئی۔ صدمہ سے نڈھال ہم گاڑی میں بیٹھے دعاؤں میں مصروف ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد میں نے بچوں سے کہا کہ اس طرح گاڑی میں ہمارا بیٹھ رہنا تو بہت خطرناک ہوگا ہمیں جلدی یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ اور گاڑی کو چھوڑ کر جنگل میں کہیں چھپ کر رات گزارنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے بڑے بیٹے کو ساتھ لیا اور سڑک پر آگے پیچھے چل کر ایسی ڈھلوان تلاش کرنے لگا جہاں سے جنگل کی طرف اُترنا آسان ہو۔

جائزہ لے کر ہم واپس اپنی کار کی طرف آ رہے تھے کہ ہم نے پیچھے سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا ہم خوف زدہ ہو گئے۔ میں نے بیٹے کو کہا کہ وہ کار میں بیٹھ جائے اور خود میں کھڑا گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ گاڑی آئی اور ہماری کار کے پیچھے کچھ فاصلہ پر آ کر رُک گئی۔ گاڑی کی بتیاں فُل روشن ہوئیں جس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

دو آدمی نکلے اور میرے پاس آ کر ایک نے پوچھا "کیا پرابلم ہے"۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ لیگوس سے واپس گھر جا رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اس نے کہا "اوہ! ڈاکٹر یہاں تو تم بڑے خطرے میں ہو"

پھر اس نے چابی لی اور گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر انجن کو دیکھا اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں یہ گاڑی سٹارٹ نہ ہو سکے گی"۔ میں نے کہا "مجھے معلوم ہے یہ سٹارٹ نہ ہوگی۔ گاڑی کو تو چھوڑو، تم کسی طرح ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

اس نے گاڑی کی چابی مجھے دیتے ہوئے کہا "تم گاڑی میں بیٹھو، ہم تمہارا پرابلم حل کرتے ہیں۔"

میں اپنی کار میں بیٹھ گیا اور وہ اپنی گاڑی کو میری کار کے سامنے لے کر آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ کسی ورکشاپ کی خراب گاڑیوں کو "ٹو (Tow)" کرنے والی وین تھی۔ انہوں نے میری کار کے آگے ہُک لگا کر اگلے پہیوں کو اُٹھایا اور کھینچنے لگے۔ ہم کار میں خاموش بیٹھے اسی سوچ میں ڈوبے رہے کہ کس طرح اچانک کالی گھٹا کی طرح ایک مصیبت ہم پر نازل ہوئی اور پھر کس طرح اللہ تعالیٰ نے چند منٹ کے اندر ہی اس سے نجات کی ایسی صورت پیدا فرما دی کہ اس سے بہتر متصور نہ ہو سکتی تھی۔ راستہ بھر ہم پُرنم آنکھوں سے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے تھے۔

رات دو بجے ہم گھر پہنچے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور معاوضہ پیش کیا لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کر دیا ''نہیں ڈاکٹر! یہ کوئی بزنس نہ تھا یہ تو ہمارا فرض تھا۔ ہم تمہیں اس جنگل میں رات کے وقت چھوڑ تو نہیں سکتے تھے۔''

3۔ سفر میں مصیبت اور پھر اُس سے نجات کا یہ تیسرا واقعہ دراصل مندرجہ بالا دو واقعات سے پہلے کا ہے۔ ''بھائی کے نام خط'' میں ذکر کر چکا ہوں کہ ہم اکارے میں تھے تو اہلیہ کو اعصابی تکلیف ہو گئی تھی اور ہمیں ان کو بینن (Benin) ٹیچنگ ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ یہ واقعہ اس سفر کے دَوران پیش آیا تھا۔ Benin ہسپتال روانہ ہونے سے ایک روز پہلے میں نے اپنی کار کی سروس کروائی تھی۔ صبح دس گیارہ بجے ہم روانہ ہوئے۔ دس پندرہ میل ہی گئے ہوں گے کہ میں نے محسوس کیا کہ کلچ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ گیئر بدلنے میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔ آگے پندرہ میل بعد ایک بڑا شہر تھا۔ میں نے سوچا کہ وہاں کسی ورکشاپ میں دکھا لیں گے۔ وہاں پہنچ کر سڑک کے کنارے ایک اچھی ورکشاپ نظر پڑی اور وہاں رُک کر میں نے گاڑی دکھائی۔ انہوں نے Kit بدلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہاں ہم کوئی دو اڑھائی گھنٹے ٹھہرے۔ Kit بدل کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ اس شہر سے ایک بڑی سڑک پر مُڑ کر ہمیں Benin کی طرف جانا تھا۔ تقریباً سو میل کا فاصلہ باقی تھا۔ پہلے سَتّر میل گھنے جنگل میں سے گزرنا تھا۔ یہ جنگل خاصا خطرناک تھا۔ کئی جگہ بورڈ لگے تھے ''خبردار! یہاں ہاتھیوں کا خطرہ ہے۔'' مجھے اِن خطرات کا علم تھا کیونکہ میں ایک دفعہ صدر جماعت کے بیٹے کے ساتھ بینن جا چکا تھا۔

اس بڑی سڑک پر جاتے ابھی پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میں نے پھر محسوس کیا کہ وہ مسئلہ تو اب بھی موجود ہے۔ میرے پاس اس وقت فُل ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا اور میں نے ایک ڈرائیور بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی چلائے اور دیکھے کہ واقعی مسئلہ ہے یا میرا ہی وہم ہے۔ اس نے چلائی اور کہا کہ مسئلہ تو ہے۔ اب ہم فکرمند ہو گئے، آگے جنگل تھا۔ کسی جگہ سے مدد کی بھی اُمید نہ تھی۔ جنگل شروع ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں آیا۔ اس میں سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے چھوٹی سی ورکشاپ پر نظر پڑی۔ میں نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دبلا پتلا بوڑھا مکینک تھا۔ اس سے بات کی تو اس نے یقین دِلایا کہ وہ ٹھیک کر دے گا۔ میرا خیال تھا کہ Kit تو نئی ڈالی ہے۔ کہیں کوئی نٹ بولٹ ڈھیلے ہوں گے۔ اُن کو ٹائٹ کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔

بڑے میاں نے گاڑی کے نیچے گھُس کر جو کھولنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ سارا بریک سسٹم ہی اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ میں دیکھ رہا تھا اور گھبرا رہا تھا کہ اب یہ سب کچھ دوبارہ جوڑ بھی پائے گا کہ نہیں۔ اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر کسی پرزے کی ضرورت پیش آئی تو وہ تو یہاں سے مل نہ سکے گا۔ پھر بڑے میاں نے سارے پرزوں کو صاف کیا۔ پٹرول سے دھویا، سکھایا اور پھر جوڑنا شروع کیا۔ جوڑنے میں مشکل پیش آنے لگی۔ کہیں کہیں میں بھی مشورہ دیتا اور مدد بھی کراتا رہا۔ بہت وقت لگ گیا۔ بالآخر اس نے دوبارہ سب کچھ فِٹ کر کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اندر گاڑی میں بیٹھ کر بریک کو پمپ کرے جبکہ وہ خود باہر بریک کو

''بلیڈ (Bleed)'' کرتا رہا اور بریک آئل کو ایک پیالے میں جمع کرتا رہا۔لیکن بریک کا پریشر تھا کہ بن نہ رہا تھا۔ پیالے میں جمع شدہ بریک آئل دوبارہ ڈال کر بار بار کوشش کی لیکن پریشر نہ بنا۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ میں دعاؤں میں مصروف اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

اُدھر اہلیہ گاڑی میں بیٹھی درد اور تھکاوٹ سے بے حال تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ گردن اور کندھوں کو بار بار دبا رہی ہے۔ ہاتھ جوڑ کر دعائیں مانگ رہی ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے میں جب اس کی پہنچ میں آجاتا تو وہ بڑی بے قراری سے پوچھتی'' چلتے کیوں نہیں؟ اب کیا ہوا گاڑی کو؟ کتنی دیر اور لگے گی؟'' میں حوصلہ دِلاتا کہ بس تھوڑا کام باقی ہے۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔

اب مکینک نے گاڑی کے نیچے گھس کر پھر کچھ کھول کر فٹ کیا اور پھر پمپ کرواتا لیکن بات بن نہ رہی تھی۔ وہ بار بار گاڑی کے نیچے گھستا اور یہ دیکھ کر میری تشویش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب میں نے گاڑی کے سامنے کی بجائے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا تھا تاکہ اہلیہ میری پریشانی دیکھ نہ سکے۔ سخت اضطراب کی حالت میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ ساتھ ہی میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اگر گاڑی ٹھیک نہیں ہوتی تو پھر کیا ہوگا۔

شام ڈھل چکی تھی، جنگل میں ویسے بھی سائے جلد لمبے ہو جاتے ہیں۔ اب نظر آ رہا تھا کہ رات یہاں ہی گزارنی پڑے گی، مگر کہاں؟ کیسے؟ کیا ہوگا؟ ایسے بہت سے سوالات ذہن میں اُبھرنے لگے تھے۔ گھبرا کر میں نے سوچا کہ مجھے یہاں گاؤں کے کسی چودھری سے مدد مانگنی چاہیے۔ ورنہ رات کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ خوف بھی تھا کہ نہ جانے وہ چودھری خود کیسا ہو۔ کہیں وہ چور اُچکوں کا چودھری نہ ہو۔

بالآخر میں نے کسی سے مدد لینے کی غرض سے سڑک پر جا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ سڑک کی دونوں طرف زنگ آلود ٹین کی چھتوں والے کچے پست سے گھر تھے۔ کوئی معقول گھرانا نظر نہیں پڑا تھا۔ کوئی آدمی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اتنے میں مجھے بینن (Benin) کی طرف سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ جیپ آئی اور سڑک سے اُتر کر مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ مجھے اس کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ اس پر لکھا تھا ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ ۔ بینن۔ میں انتظار کرنے لگا کہ ڈرائیور اُترے گا تو بات کروں گا۔ لیکن وہ جیپ ذرا رُک کر پھر آگے روانہ ہونے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کو روک لیا۔

'' کیا بات ہے؟'' ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔ وہ وضع قطع میں افسر دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ'' اہلیہ بیمار ہے، بینن ہسپتال جا رہا تھا، گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اگر مدد کر سکیں بینن تک تو مہربانی ہوگی۔'' اس نے جواب دیا کہ'' وہ بینن سے تو آ رہا ہے اور آگے جانا ہے، واپس نہیں جانا آج۔'' یہ سن کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ اور میں چپ کھڑا رہ گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ فوراً بولا'' لیکن پرابلم کیا ہے تمہاری گاڑی کو۔''

یہ کہتے ہی اس نے اپنی گاڑی کو بند کیا، تیزی سے اُترا اور لپک کر میری گاڑی تک جا پہنچا۔ گاڑی دیکھنے کے لیے نہ میں

نے اس کو کہا اور نہ ہی مجھے کوئی اُمید تھی کہ وہ گاڑی ٹھیک کرنے میں کوئی مدد کر سکے گا۔

اس نے جلدی سے انجن پر نظر دوڑائی۔ اِدھر اُدھر ایک دو جگہ ہاتھ لگایا اور پھر اس نے ''بریک آئل'' کی ڈبیہ کا ڈھکن اُتارا۔ تیل کو بھرا دیکھ کر اس نے جلدی سے ڈھکن دوبارہ فٹ کیا۔ اس کی انگلیوں کو تیل لگ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے جھاڑن اس کی طرف بڑھایا۔ ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا: ''خرابی تو کہیں نظر نہیں آتی، سب کچھ ٹھیک ہے۔ پھر یہ گاڑی............'' ابھی وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ کار کے اندر سے ڈرائیور نے آواز دی۔ ''پریشر بن گیا ہے۔'' مجھے یقین نہ آیا تو میں نے خود گاڑی میں بیٹھ کر چیک کیا۔ بریک، کلچ سب ٹھیک کام کر رہا تھا۔ پھر میں نے گاڑی کو آگے پیچھے چلا کر دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس انجینئر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھ سے کہا ''اچھا اب تم جاؤ جینٹن'' اور خود وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ پھر ہم نے بابا مکینک کو فارغ کیا۔ اس میں اور وقت ضائع ہوا۔ بابا نے نرخ بڑھا دیا تھا اور جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔

جب ہم وہاں سے آگے روانہ ہوئے تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور جنگل کا سارا سفر ابھی باقی تھا۔ تھکے ہارے اور ڈرے سہمے خاموشی سے ہم جا رہے تھے۔ جس اعجازی رنگ میں خدا نے ہمیں مشکل سے نجات دی تھی اس سے دل شکر سے لبریز تھا۔ تاہم دعاؤں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کیونکہ رات کا وقت تھا۔ جنگل کا سفر تھا، بیمار بیوی اور تین بچوں کا ساتھ تھا۔ اور گاڑی کا اعتبار نہ تھا۔

ہاتھیوں کے متعلق تو میں نے سوچا کہ شریف بھلے مانس ہوتے ہیں۔ رات کو گھر پر ہی رہتے ہوں گے۔ البتہ درندوں کا خوف تھا کہ یہ رات کو آوارہ گردی کرتے ہیں۔ پھر سوچا یہ بھی اپنا دھندہ چور، ڈاکوؤں کی طرح لیٹ نائٹ ہی شروع کرتے ہوں گے۔ اتنے میں مَیں اُن کے خطرے سے باہر ہو جاؤں گا۔

اہلیہ کچھ دیر خاموش رہی، قدرے سکون ہوا تو وہ بولی: ''جب وہ شخص جیپ سے اُتر کر آیا تھا تو میں نے دعا مانگی تھی۔ اے اللہ! اس کو فرشتہ بنا کر بھیج اور ہماری مشکل آسان کر۔'' میں خاموش رہا تو اس نے پوچھا'' آخر اس نے کیا کیا تھا کہ اُس کے ہاتھ لگاتے ہی گاڑی ٹھیک ہو گئی۔'' میں نے کہا'' تمہاری دعا قبول ہو گئی تھی۔ وہ شخص واقعی فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اور جو اس نے کیا اس کا علم خود اس کو بھی نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ بریک آئل کی ڈبیہ کا ڈھکن اتار کر جب وہ ڈھکن کو دوبارہ جلدی سے فِکس کرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ ذرا سا ہل گیا تھا اور اس کی درمیانی لمبی اُنگلی غیر ارادی طور پر لمحہ بھر کے لیے تیل میں ڈوبی تھی۔ اور ساتھ ہی میں نے ہلکی سی کلک کی آواز بھی سنی تھی۔ ڈبیہ کے اندر ایک سپرنگ تھا جو ٹھیک سے سیٹ نہیں ہوا تھا۔ اُنگلی لگتے ہی وہ اپنی جگہ پر فِٹ ہو گیا اور پریشر بن گیا۔ اس سپرنگ کو فِکس کرنے میں مکینک کو بڑی مشکل پیش آئی تھی اور میں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ ہم کامیاب تو ہو گئے فِکس (Fix) کرنے میں لیکن ظاہر ہے کچھ کمی رہ گئی تھی۔ اور اُس کمی کو دُور کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اُس کے لیے فرشتہ ہی درکار تھا۔''

میرا مایوسی کے عالم میں مدد کی تلاش میں سڑک پر جانا اُس انجینئر کا بغیر کسی وجہ کے میرے قریب آ کر رکنا اور پھر چل پڑنا،

میرا اُس کو روک کر اُس سے بات کرنا، اُس کا از خود میری گاڑی کو جا کر دیکھنا اور پھر اُنگلی کا تیل میں ایک جھٹکے کے ساتھ ڈوبنا، یہ سب عجیب تصرّفِ الٰہی تھا۔ جس سے ہماری وہ مشکل آسان ہوئی تھی۔ فالحمد لله علی ذالك۔

باقی سفر خدا کے فضل سے خیر سے گزرا تھا۔ ہم بیغن میں لئیق احمد صاحب چودھری کے ہاں ٹھہرے تھے۔ دوسرے دن ٹیچنگ ہسپتال میں انگریز پروفیسر سے مشورہ اور علاج کے بعد اہلیہ شفایاب ہوگئی تھی۔ یہ لئیق احمد صاحب چودھری وہاں انجینئر تھے۔ بڑے مخلص احمدی تھے، پہلے یہ اکارے کے قریب ہی رہتے تھے۔ میں جب وہاں گیا تو انہوں نے ہماری بہت مدد اور رہنمائی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جزائے خیر دے۔ بعد میں وہ انگلینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔ مانچسٹر میں ہم نے اُن سے ایک دفعہ اُن کے گھر میں ملاقات کی تھی اور پرانی یادیں تازہ کی تھیں۔

بیٹی کی شادی اور جرمنی کا ویزہ

اِجی بواوڈے میں قیام کے دوران میں نے بیٹی کی شادی بھی کی۔ اس کی تقریب اچانک کچھ اس طرح پیدا ہوئی۔ محترم قاضی عبدالرشید صاحب آف ساہیوال کی بیٹی کی شادی میرے بڑے بھائی مکرم عبدالرحیم صاحب کے بڑے بیٹے عبداللطیف سے طے ہوئی تھی۔ قاضی صاحب کا بیٹا قاضی ظفر محمود جرمنی میں تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے میری بیٹی کے رشتہ کی بات بھائی عبدالرحیم صاحب سے کی۔ اس بارہ میں بھائی صاحب نے مجھے خط لکھا اور ہم اُس رشتہ پر غور کرنے لگے۔

اُدھر جرمنی میں ظفر محمود اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان جانے کی تیاری میں تھا کہ اُس کو قاضی صاحب نے کہا کہ وہ پاکستان آنے سے پہلے نائیجیریا کا چکر لگا آئے۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس نائیجیریا آیا۔ ابھی ظفر کو نائیجیریا آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ پاکستان سے بھائی صاحب کا خط ملا کہ ظفر محمود تمہارے پاس آیا ہوا ہے۔ بہتر ہے، نکاح کر دیں۔ اُصولی طور پر تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اس طرح اچانک ہم اس تقریب کے لیے تیار نہ تھے۔ ظفر دو ہفتے کے لیے آیا تھا۔ ایک ہفتہ تو تقریباً گزر ہی چکا تھا۔ آئندہ چند دن میں ہم کیا تیاری کرتے اور پھر پردیس میں...... کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی عبدالمنان بھٹہ اُن دِنوں اِجی بواوڈے میں ہی رہتا تھا۔ سیرالیون میں مدت وقف پوری کرنے کے بعد اس نے نائیجیریا میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ میں اہلیہ اور بھائی سے مشورہ کے بعد مربی سلسلہ مقیم اِجی بواوڈے مولانا صفی الرحمٰن صاحب خورشید سے اِجی بواوڈے مشن ہاؤس میں جا کر ملا اور ساری صورتحال بیان کر کے میں نے مولوی صاحب سے کہا ''ان دو چار دنوں میں مَیں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ یوں کریں کہ چند دوست بلا کر مسجد میں نکاح کا اعلان کر دیں۔''

مولوی صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں، ہم مل جل کر چھوٹی موٹی تقریب کر لیں گے۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے، کریں پھر جو کچھ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے مقامی دوستوں، خصوصاً پاکستانی احمدی فیملیز کو اطلاع دی اور پھر لیگوس، اباداَن اور دیگر مقامات پر پاکستانی احمدی ڈاکٹرز اور اساتذہ کو اطلاع دے دی۔ اتوار کا دن ہم نے مقرر کر لیا تھا کہ گیارہ بجے مسجد میں نکاح ہوگا۔ اور دوپہر کا کھانا ہوگا۔ ہسپتال کا ویٹنگ ہال مردوں کے کھانے کے لیے اور دوسری طرف بڑا کمرہ عورتوں کے لیے تجویز ہو گیا تھا۔ ادھر گھر میں ہم نے تیاری شروع کر دی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اِن دِنوں بہت سے پاکستانی، انڈین اور فلپینو وغیرہ استاد ہمارے اردگرد آباد ہو گئے تھے۔ اُن میں سے بعض احمدی اور غیر احمدی پاکستانی خاندانوں کے ساتھ ہمارے گہرے مراسم تھے۔ اُن کو علم ہوا تو وہ ہر طرح سے اس تیاری میں شریک ہو گئے۔ مٹھائی ہم نے گھر پر بنائی تھی۔ اس طرح گوشت ہم نے بکرا ذبح کر کے گھر پر ہی تیار کر لیا تھا۔ باقی سوڈیڑھ سو مہمانوں کا کھانا، تین غیر احمدی خاندانوں نے آپس میں بانٹ لیا تھا، دیگر تیاری میں بھائی کے ساتھ نوجوان احمدی اساتذہ نے مل کر کام کیا۔ شامیانے، کرسیاں لگائیں۔ وہ جھنڈیاں اور بینرز جو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کی آمد پر بنائے تھے وہ موجود

تھے چنانچہ گھر کے باہر جھنڈیاں اور بینرز لہرانے لگے۔ گھر کے اندر بھی کچھ صفائی، سجاوٹ کر لی تھی۔ شام کو پاکستانی مستورات اور بچے جمع ہو جاتے۔ سلائی کی مشین کے Cover کی ڈھولک بنائی جاتی اور گھر میں دو چار دن شادی کا سماں پیدا کیا جاتا رہا۔

اتوار کی صبح نو دس بجے ابادان (Ibadan)، ایبے کوٹا (Abeokuta)، اُویری (Owerri) سے احمدی ڈاکٹرز اور اساتذہ پہنچ گئے تھے۔ برادرم شکیل منیر نے اپنی گاڑی دولہا کے لیے سجالی تھی۔ دس بارہ گاڑیوں پر مشتمل یہ بارات مسجد کے لیے روانہ ہوئی۔ احمدیہ سنٹرل مسجد میں مکرم مولانا منیر احمد بسمل صاحب نے نکاح پڑھایا۔ لیگوس جماعت کے عہدہ داران بھی آئے تھے۔ مقامی احمدی و غیر احمدی معززین شامل تھے۔ خطبہ نکاح کا انگریزی کے ساتھ یوربا ترجمہ ہوتا رہا۔ بعد میں حاضرین کو ریفرشمنٹ پیش کی گئی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر میں نے سب دوست واحباب کو بلایا تھا۔ اچھا انٹرنیشنل قسم کا اجتماع ہو گیا تھا۔ اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی تھے۔ وہ مخالفین بھی آئے تھے جو دُور دُور رہنے لگے تھے۔ مولوی صفی الرحمٰن خورشید صاحب کی اس ''چھوٹی موٹی'' تقریب کو خدا نے بہت برکت بخشی تھی۔ پردیسی ہونے کے حوالے سے میرے لیے تقریب کی یہ رونق اور کامیابی حوصلہ افزا ہی نہیں ایمان افروز بھی تھی۔ یہ سب کچھ میری امیدوں سے بڑھ کر ہو گیا تھا۔ اگر دیس میں ہوتا تو اس سے بہتر کیا ہوتا۔ نہیں! کم تر ہی ہوتا۔ مہمانوں کی یہ ورائٹی کہاں سے لاتا۔ اور پھر وہاں تو فنکشن کاروباری بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہاں کا یہ ''مِل جُل'' کر فنکشن کا انداز تو نہ ہوتا جہاں اکثر مہمان میزبان بھی تھے۔

شادی کی ویڈیو-ایک تاریخی ''ڈاکومنٹری''

یہاں جرمنی آئے تو پاکستان سے بہن بھائیوں کے بچوں کی شادیوں کی تصاویر اور ''ویڈیوز'' آنے لگیں۔ اہلیہ تو پہلے ہی اُن کو تاکید کر دیتی کہ شادی کے بعد جلد مجھے پوسٹ کر دینا۔ یہاں ہم دیکھ دیکھ کر تھک جاتے۔ سوچتا ہوں کہ اگر بیٹی کی شادی کی ویڈیو نہ ہوتی تو وہ یہ شکوہ کرتی رہتیں کہ اگر دیس میں شادی کرتے تو ہم بھی ویڈیو بنوا کر یادگار رکھ لیتے۔ شاید اسی لیے خدا تعالیٰ نے اس پہلو سے بھی اس تقریب کو کسی شکوہ شکایت سے بچالیا اور ویڈیو کا انتظام کروادیا تھا۔

اس وقت مجھے تو ویڈیو کا کچھ خاص علم نہ تھا، سن رکھا تھا۔ لیکن کبھی کوئی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی نہ تھی۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسی کوئی ریکارڈنگ یہاں ممکن ہے۔ بس عام کیمرہ ہی تیار کر رکھا تھا بچوں نے۔ ''الحاجہ آبیروآبا'' اجی بواوڈے میں ایک امیر خاتون تھیں۔ کئی کارخانوں کی مالک تھیں، احمدی تو نہ تھیں لیکن جماعت سے اچھے تعلقات تھے۔ اپنی تقریبات میں وہ ہمیں بلاتی تھیں اور میں اس کا فیملی ڈاکٹر بھی تھا۔

بیٹی کی شادی پر ہم اس کو دعوت دینے گئے تو وہ بہت خوش ہوئی اور پیش کش کی کہ وہ شادی پر کھانا تیار کرے گی۔ میں نے اُس سے کہا کہ کھانے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ تکلیف نہ کرے۔ بس وہ شادی میں شامل ہو جائے۔ اس پر اس نے کہا کہ اچھا! تو

پھر وہ شادی کی ویڈیو بنوادے گی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ہم واپس آ گئے۔ مجھے نہیں علم تھا کہ وہ یہ ویڈیو کیسے بنوائے گی۔ اور نہ ہی میں نے اس بات کو خاص اہمیت دی۔

شادی کے روز صبح ہی ابادان سے الیکٹرانک کمپنی کی وین میرے گھر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو آدمی نکلے ایک نے ایک بھاری بھرکم کیمرہ کندھے پر اُٹھایا اور وہ میرے گھر کی اور جھنڈیوں اور شامیانے، کرسیوں وغیرہ کی ویڈیو بنانے لگا۔ پھر جوں جوں مہمان آتے رہے، بناتا رہا، بارات کی روانگی، اور پھر مسجد میں آمد کی بھی بنائی، مسجد کے درودیوار، اندر باہر، محراب و مینار اور کلمہ بھی ریکارڈ کیا، نکاح کا خطبہ اور بعد میں ریفرشمنٹ وغیرہ ریکارڈ کر کے وہ پھر ہسپتال اور گھر پر مہمانوں کو ریکارڈ کرنے پہنچ گیا۔ کھانے کے دوران مووی بنتی رہی۔ پھر شام کو الحاجہ گھر پر اپنے روایتی انداز سے بیٹی کو تحائف دینے آئی تو یہ تقریب بھی ریکارڈ ہوئی۔ چند دن بعد الحاجہ نے دو کیسیٹس ویڈیو کی تحفۃً عنایت فرمائیں۔ میرے پاس player نہ تھا کسی سے مانگ کر دیکھی اور ایک دو سال بعد یہ سرد خانے میں چلی گئی۔

نومبر ۲۰۰۹ میں اہلیہ کی وفات کے بعد میں نے الماریوں کی چھان پھٹک کی اور پرانی ویڈیو کیسیٹس کو دیکھا تو بعض گزشتہ بیس بائیس سال میں خراب ہو چکی تھیں۔ اس شادی کی ویڈیو کی فکر ہوئی، شکر ہے وہ ٹھیک تھی۔ لیکن اب ستائیس سال بعد جو دیکھی تو اس میں کچھ اور ہی سماں تھا۔

گزرا زمانہ جیسے لَوٹ آیا تھا۔ پرانی یادیں تازہ ہوئیں، یوں محسوس ہوا جیسے پھر وہی زندگی ایک دفعہ پھر جی رہے ہیں۔ جس نے بھی دیکھی بہت دلچسپ اور معلومات افزا پایا۔ وہاں کے درودیوار، کوچہ و بازار، گھر بار، رہن سہن، میل ملاپ ہر چیز میں ان کے لیے کشش تھی۔ ہم ساتھ ساتھ کومنٹری کرتے رہتے۔ یہ ہے وہ ہمارا گھر جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تشریف لائے تھے۔ یہ جھنڈیاں ہم نے حضور کی آمد پر بنائی تھیں۔ یہ ہے وہ ہسپتال جس کا میں نے آغاز کیا اور پھر بارہ سال وہاں کام کیا۔ یہ ہے وہ مسجد اور اس پر لکھا وہ کلمہ جس کے بارہ میں دنیا میں مشہور کیا گیا تھا کہ اس میں ''احمد رسول اللہ'' لکھا ہے۔ یہ ہیں ہمارے مربّیان، یہ ڈاکٹر، یہ اساتذہ، یہ دوست احباب............

ہر چہرے کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی کوئی قصّہ جُڑا ہوا تھا اور ہر جگہ، عمارت اور سڑک کے ساتھ کوئی داستان منسلک تھی۔ جوں جوں دیکھتے یادوں کے باب کھلتے چلے جاتے رہے۔ بعض کے احسانات اور حسن سلوک یاد آتے۔ بعض کے دوستی یاری، ہنسی مذاق اور حوصلہ مشورہ یاد آیا۔ بعض کے ساتھ کچھ تلخ یادیں بھی وابستہ تھیں لیکن اب دیکھا تو تلخی پھیکی پڑ چکی تھی۔ انہوں نے بھی زندگی میں رنگ بھرا تھا۔ ''بادِ مُخالف'' ہی ثابت ہوئے تھے۔

یہ روایتی شادی کی ویڈیو نہ تھی۔ شادی تو کہیں پس منظر میں جا چکی تھی۔ یہ تو نائیجیریا میں ہماری سوشل لائف کی ایک ''ڈاکو منٹری'' سی بن گئی تھی۔ ڈاکومنٹری بھی جوڑ جاڑ کے بنائی جاتی ہے یہ تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے خفیہ کیمرے سے ہماری اصل زندگی

کا ایک باب ریکارڈ کرلیا ہو۔ سب کردار اصل تھے، اُن کی بات چیت، حرکات وسکنات، ہنسی مذاق سب اصل تھا۔ لیگوس، کانو جیسے بڑے شہروں کے بڑے فنکشن کو چھوڑ کر، کسی چھوٹے شہر کی سادہ سی تقریب پر ایسا اجتماع شاید ہی دیکھنے میں آیا ہوگا۔ جس میں افریقہ اور ایشیا کے ہندو مسلم، سکھ، عیسائی دوست اس طرح گھُل مِل کر شریک ہوئے ہوں اور جس میں جماعت کے عہدہ داران، مربّیان، ڈاکٹرز، اساتذہ اتنی تعداد میں شامل ہوئے ہوں۔ اس ویڈیو کی قدر و قیمت میں یہ بات مزید اضافہ کرتی ہے کہ اس اجتماع کے بعد یہ سب ایشیائی دوست واحباب واپس جانا شروع ہوگئے تھے۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اجی بواوڈے اور اس کا گردونواح ان سے خالی ہوگیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں جب میں اجی بواوڈے چھوڑ کر کانو منتقل ہوا تو صرف مولانا صفی الرحمٰن خورشید صاحب موجود تھے۔

جب بیٹی کی شادی کی تھی تو بیٹے چھوٹے تھے اور اب وہ خود بال بچے دار ہیں۔ میں نے اس ویڈیو کی ''سی ڈی'' پر کاپیاں بنوا کر ان کو بھیج دی ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی اپنے بھائیوں کو بھیج دی ہیں۔ اُن کے لیے یہ بہت دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوئی ہیں لیکن میرا مقصد یہ ہے کہ اگلی نسل کو یہ علم رہے کہ اُنکے باپ دادا کبھی افریقہ گئے تھے اور خدا کی خاطر وقف کر کے گئے تھے اور اُن اُنیس سالوں میں جہاں تنگی وترشی کے ایّام آئے تھے، وہاں اچھے دن بھی آئے تھے۔ خوشیاں بھی دیکھی تھیں، خدا نے اپنے فضل سے نوازا بھی تھا۔ اور آج یورپ کی جس آرام وآسائش کی فضا میں وہ جی رہے ہیں یہ اسی نوازش کا حصہ ہے۔

شادی کے بعد جرمنی کا ویزہ

نکاح کے بعد عزیزم ظفر محمود نائیجیریا سے واپس جرمنی گیا اور پھر وہاں سے پاکستان، بہن کی شادی پر چلا گیا۔ چند ماہ بعد وہ پھر نائیجیریا آیا۔ اب کے وہ دو ماہ کے لیے آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ نائیجیریا میں ملازمت حاصل کر سکے گا۔ میرے چھوٹے بھائی عبدالمنان کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ چھٹی پر پاکستان گئے ہوئے تھے۔ گھر خالی تھا، ہم نے وہاں بیٹی کا رخصتانہ کر دیا تھا۔

نائیجیریا میں ملازمت کی کوئی صورت نہ بن سکی تو وہ واپس جرمنی چلا گیا تھا۔ ان دو ماہ میں اس نے بتایا کہ جرمنی میں اس کی قانونی حیثیت ابھی ایسی نہیں کہ وہ بیوی کو بلا سکے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اُس کی بیوی کو یہاں سے جہاز پر چڑھا دوں۔ وہ وہاں اُس کو اتار لے گا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ بیوی کو جرمنی کا ویزہ نہ مل سکے گا۔ لہٰذا بغیر ویزہ کے ہی چڑھانا ہوگا۔ یہ بات میرے لیے بہت مشکل تھی۔ میں انکار کرتا رہا کہ اس طرح بغیر ویزہ کے میں روانہ کرنے کے لیے تیار نہیں جبکہ وہ یہ کہتا رہا کہ ویزہ کے ساتھ اس کا آنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس نے بتایا کہ پاکستان سے لوگ بغیر ویزہ کے آتے ہیں اور ہم ایئر پورٹ پر اُن کو ملتے ہیں اور اسائلم کرا لیتے ہیں۔ بس یہی ایک طریقہ ہے اُس کی بیوی کا جرمنی آنے کا۔

میرے لیے یہ طریقہ ناقابلِ فہم تھا مجھے اسائلم وغیرہ کا کچھ علم نہ تھا۔ میں حیران تھا کہ یورپ میں ایسی دھاندلی کیسے ہو

سکتی ہے کہ یہ ایئر پورٹ سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ جرمنی سے فون پر ظفر محمود مجھے بغیر ویزہ چڑھانے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جبکہ میں انکار کرتا رہا۔ اسی اثناء میں جرمنی سے ایک مربی سلسلہ نے بھی مجھے خط لکھ کر اطلاع دی تھی کہ شادی تو بیٹی کی آپ نے کر دی ہے لیکن اس کے جرمنی آنے میں مشکل پیش آئے گی۔ قانونی طور پر ظفر محمود ابھی بیوی کو بلا نہیں سکتا۔

اب میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ گھر میں اہلیہ اور بیٹی کو میں نے ان حالات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مربی صاحب کو میں نے دعا کے لیے کہا۔ ان کی فکرمندی پر شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ خلافت کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ''الٰہ دین کا چراغ'' دیا ہے۔ ہر مشکل میں مَیں اُدھر ہی رجوع کرتا ہوں۔ اس مشکل میں مجھے تو کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔

میں نے ساری پریشانی اور مجبوری لکھ کر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں دعا کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ خود بھی میں دعا کرتا رہا۔ کسی کو اپنی پریشانی بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ بس سوچتا رہتا اور دعا کرتا رہتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد ظفر محمود پھر نائیجیریا آیا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ بغیر ویزہ کے ہی چڑھا دیں جہاز پر۔ وہ وہاں سے اُتار کر اندر لے جائے گا۔ ائیر پورٹ پر وہ وکیل کو ساتھ لے کر آئے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔ لیکن میں مسئلہ کے اس حل پر راضی نہ تھا۔ اگر راضی ہوتا بھی تو شاید جہاز پر سوار بھی نہ ہونے دیا جاتا۔ لیکن یہ بات مجھے معلوم نہ تھی۔ میں ویزہ پر ہی مصر تھا۔ بغیر ویزہ کے جہاز پر سوار کرانا میرے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ ایک روز ٹہلتے ہوئے ہم اسی مسئلہ پر بات کر رہے تھے کہ ظفر محمود نے کہا:

''یہاں لیگوس میں جرمن ایمبسی کہاں ہے؟ مجھے وہاں لے چلیں۔''

میں دوسرے روز ہی اس کو جرمن ایمبسی لے گیا۔ وہاں جا کر اُس نے جرمن زبان میں دو چار فقرے بولے۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ میرا تعارف کراتے ہوئے اُس نے کہا یہ میرے انکل یہاں ڈاکٹر ہیں۔ میں اُن سے ملنے تین دفعہ یہاں نائیجیریا آ چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی جرمنی میں میرے پاس آئیں۔ میں ان کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اِن کو ویزہ دیں۔

انہوں نے انکل کی نائیجیریا میں ملازمت اور رہائشی ویزہ کی تصدیق کی۔ اور پھر ظفر کے پاسپورٹ پر نائیجیریا تین دفعہ آنے کو دیکھا اور پھر وہ ویزہ دینے پر راضی ہو گئے۔ ہم اپنے پاسپورٹ اُن کو دے کر واپس آ گئے۔

دوسرے روز گئے تو ویزہ کے ساتھ پاسپورٹ ہمیں مل گئے۔ ہم سیدھے وہاں سے Iberia ائیر لائن کے دفتر گئے۔ ان میاں بیوی کی بکنگ کرائی اور تین دن بعد بیٹی ویزہ اور اپنے میاں کے ساتھ جرمنی روانہ ہو گئی۔ ''الٰہ دین کے چراغ'' سے ناممکن ممکن ہو گیا تھا۔ ظفر نے بیوی کے پاسپورٹ پر ویزہ کی فوٹو کاپی مجھے دیتے ہوئے کہا: ''اس کو رکھ لیں ثبوت کے طور پر، کوئی یقین نہ کرے گا کہ آپ کی بیٹی ویزہ لے کر جرمنی گئی ہے۔ ایسا ہوتا ہم نے دیکھا نہیں۔''

تقریریں۔تحریریں

تقریر وتحریر کا جو سلسلہ اکارے میں شروع کیا تھا۔ وہ اجی بواوڈے آ کر بھی خدا کے فضل سے جاری رہا تھا۔ کچھ تقریروں اور تبلیغی گفتگو کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ ہر جلسہ سالانہ پر عیسائیت سے متعلق کسی موضوع پر تقریر کے لیے حکم ہوجاتا تھا۔ اور میں کچھ معذرت کر کے تعمیل پر مجبور ہوجاتا۔ اس طرح تقریباً ہر اس موضوع پر جو اسلام اور عیسائیت میں متنازعہ ہے، مجھے تقریر کرنے کا موقع مل گیا۔ اُن میں سے تقریباً سب ہی اخبار The Truth میں شائع ہوئیں اور اکثر بعد میں کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئیں۔

ایک موضوع ایسا تھا جس پر تقریر تو نہ ہوئی لیکن مضمون لکھا جو اخبار میں پانچ اقساط میں چھپا۔ اس موضوع کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی حیثیت سے ہے۔ یہ مضمون بعد میں کتابی شکل میں چھپا۔ جس کا عنوان تھا Abraham's Son of Promise۔

میں اپنے یہ کتابچے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں ارسال کرتا رہتا تھا۔ اور بعد میں جب بھی حضور سے ملا، حضور نے اُن کی تعریف فرمائی۔ انگریزی بولنے والے دوستوں سے ایک ملاقات میں حضور سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے متعلق سوال ہوا تو حضور نے قریب کھڑے محترم ساقی صاحب مرحوم سے فرمایا تھا ''اس کو عبدالرحمٰن بھٹہ کی Son of Promise دے دیں۔'' اس ملاقات کی ویڈیو کیسٹ جب ہم نے لیگوس میں دیکھی تو حاضر مربّیان نے مجھے مبارکباد دی تھی۔ مربّیان حضرات نے بھی ان کتابچوں کو مفید پایا تھا۔ لندن کے ایک مربی، جرمنی کے جلسہ پر ایک دفعہ آئے۔ میں نے اُن سے مل کر اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے فرمایا ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ کے پمفلٹ تو ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں۔''

مکرم عطاء المجیب راشد صاحب نے بھی کئی سال پہلے یہاں جرمنی میں مجھے فون کیا اور ان کتابچوں کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ میں نے یہ کتابچے اُن کی خدمت میں ارسال کر دیئے تھے۔

زہے قسمت! یہ میرے لیے خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان تحریروں کو مفید پایا گیا، یہاں جرمنی آ کر بھی تقریر وتحریر کی توفیق ملتی رہی ہے۔ اس میری سرگزشت کے آخر میں Appendix کے طور پر تمام اپنی تقریروں، تحریروں کی ایک لسٹ انگریزی میں ٹائپ کر کے لگا دی گئی ہے۔

اکارے میں کلینک کا آغاز۔ سال 1972ء کے آغاز کے ساتھ
ع۔ آغاز تو میں کردوں، انجام خدا جانے''

''صدر جماعت الحاجی اجی جولا'' صاحب کے ساتھ

اکارے میں کلینک کا آغاز

''آپ کو پانچ سو پاؤنڈز ملیں گے۔ اسی میں آپ نے رہائش اور کلینک کا آغاز کرنا ہے۔
وہاں Revolution کے طریق پر نہیں بلکہ Evolution کے طور پر کام کرنا ہے۔''
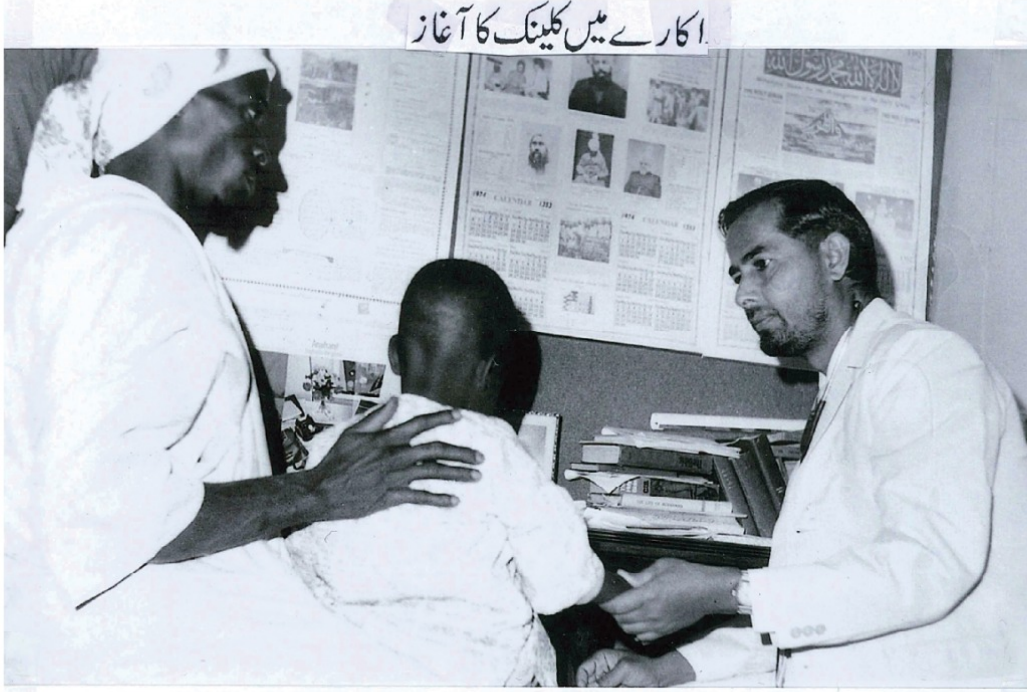
اکارے ۔ دوست آتے جاتے رہتے۔ وہیں اجلاس ہوتے۔

اکارے۔ وقارِ عمل میں حصہ

ہفتہ دس دن کی محنت کے بعد ہسپتال کی شکل کچھ نکل آئی تھی۔ کچھ حوصلہ ہوا تھا کہ یہ ''احتیاطاً'' تیاری قدرے رنگ لا رہی ہے۔

جنوری 1975ء میں یہاں کلینک کا آغاز کیا۔
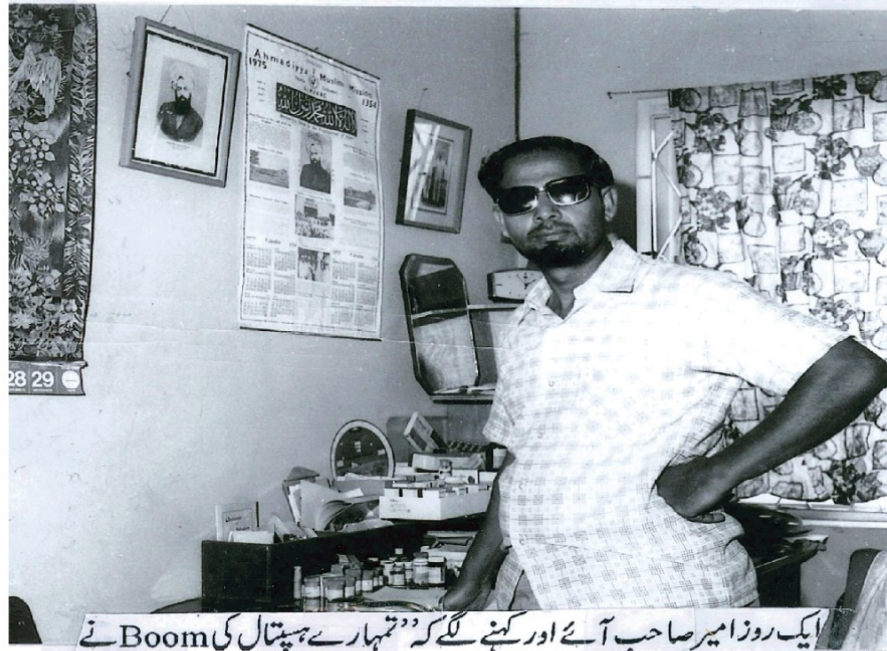
ایک روز امیر صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ”تمہارے ہسپتال کی Boom نے تو ”نصرت جہاں فنڈ“ کی کایا پلٹ دی ہے۔“

یہاں ''اِجی بواُوڈے'' آکر ڈاکٹروں اور افسروں سے میل ملاقات میں پتہ چلا کہ یہاں ایک کلب ہے جہاں یہ لوگ ٹینس کھیلتے ہیں۔ چندروز جا کر دیکھتا رہا اور پھر میں نے کلب جائن کر لی۔
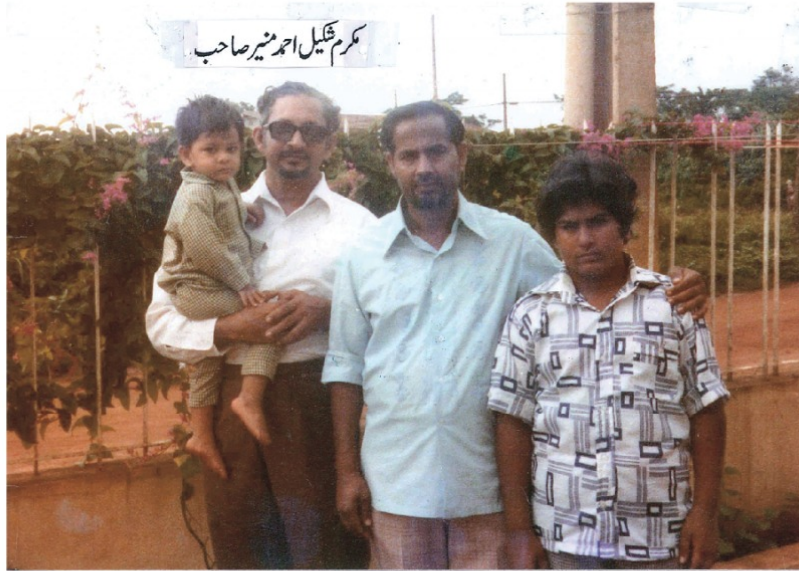
"Warri" عیسائیت کا گڑھ ہے۔ وہاں شہر کے ''کنگ جارج میموریل ہال'' میں ایک بین المذاہب سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کے انعقاد میں مکرم برادرم شکیل احمد صاحب منیر نے، جو واری میں پروفیسر تھے، بنیادی کردار ادا کیا تھا اور بعد میں جب وہ Warri سے Owerri چلے گئے تھے تو وہاں بھی انہوں نے ایسا ہی سیمینار منعقد کروایا تھا اور اُس میں بھی مجھے اسلام کی نمائندگی کی سعادت ملی تھی۔

مولوی منظور احمد چنیوٹی اور علامہ خالد محمود کی ''اجی بواوڈے'' آمد

مولوی صفی الرحمٰن خورشید صاحب
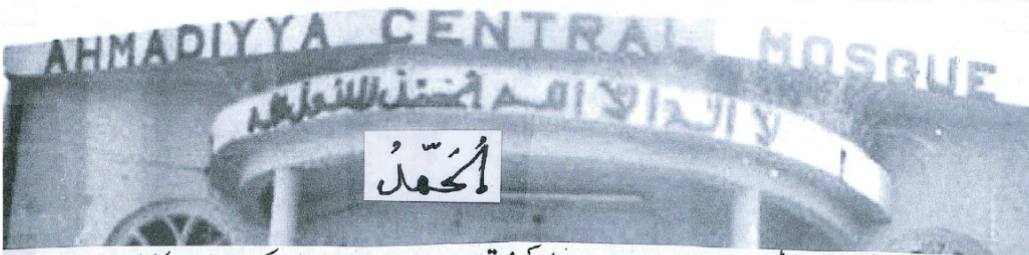
مولوی منظور چنیوٹی نے جو فوٹو اجی بواوڈے مسجد کی کھینچی تھیں وہ بعد میں دنیا میں مشہور کیں کہ یہاں کلمہ میں ''محمد رسول اللہ'' کی بجائے ''احمد رسول اللہ'' لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ لکھنے والے نے محمد کی میم کو اوپر کی طرف کھینچ کر پھر ''ح'' سے ملایا ہے۔ اور ''میم'' اور ''ح'' کے ربط کو اگر ذرا چھپا دیا جائے تو احمد معلوم ہوتا ہے۔ اس ربط کو چھپا کر مولوی منظور چنیوٹی نے عوام کو دھوکہ دیا اور پھر یہ مسجد الحاجہ فاطمہ نے تعمیر کروائی تھی اور بعد میں اس نے جماعت احمدیہ کو دے دی تھی۔ شروع سے ہی یہ کلمہ پختہ سیمنٹ کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ ہم نے تو نہیں لکھا تھا۔ الحاجہ فاطمہ تعمیر کے وقت احمدی نہ تھی۔

پاکستان کے سفیر محترم اکرم زکی صاحب کی اجی بواوڈے آمد۔ (مظفر احمد منصور صاحب کی کمپنی کے افتتاح پر)

مظفرؒ احمد منصور صاحب میرے دیرینہ دوست تھے۔ انہوں نے ''اگریمان'' نام سے ایک کمپنی قائم کر رکھی تھی۔

عبدالمنان بُھٹہ
ڈاکٹر ایم۔اے۔او عبدل

اگست ۱۹۸۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کا دورۂ نائیجیریا
اموسان ہسپتال میں

حضور نے مجھ سے پوچھا ''تمہارا ہسپتال بھی یہاں قریب ہی ہے ناں؟''
میں نے عرض کی ''جی حضور، کوئی پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔''
حضور نے فرمایا: ''وہاں بھی چلنا ہے ناں؟''
میں نے عرض کی ''جی حضور'' (اور کیا کہہ سکتا تھا میں۔)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی غریب خانہ پر تشریف آوری

دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں

سات سال بعد 1978ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ سے ملاقات

حضور نے اس کو تھپکی دی اور ڈرائیونگ کی تعریف کی اور فرمایا: ''آج قافلہ ٹھیک گیا اور آیا ہے، اسی طرح ڈرائیونگ کرنی چاہیے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ سے ملاقات کا شرف

منجھلا بیٹا عبدالسبوح پہرہ داروں کے پاس ہی بیٹھا رہتا
حضور ہال میں آتے جاتے تو یہ مصافحہ کر لیتا

الحاجہ آبیرو آبا'' اجی بواوڈے میں ایک امیر خاتون تھیں۔ کئی کارخانوں کی مالک تھیں، تقریبات میں وہ ہمیں بلاتی تھیں

''ڈاکٹر ایم۔اے۔اوعبدل'' اباداں یونیورسٹی میں شعبہ ''اریبک اینڈ اسلامک سٹڈیز'' سے منسلک تھے۔

''مصیبت یہ ہے کہ لوگ ان عربوں کو ''مذہبی'' سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے۔ یہ جو Millions ڈالر ہمارے ملکوں میں خرچ کررہے ہیں۔ یہ سب سیاست ہے۔ میں نے آج تک کسی عربی کو ایک ڈالر بھی خالص خدا کی خاطر خرچ کرتے نہیں دیکھا۔'' ڈاکٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

بیٹی کی شادی

مولانا صفی الرحمٰن صاحب خورشید

احمدیہ سنٹرل مسجد میں مکرم مولانا منیر احمد بسمل صاحب نے نکاح پڑھایا۔ لیگوس جماعت کے عہدہ داران بھی آئے
ابادان (Ibadan)، ایبے کوٹا (Abeokuta)، اُویری (Owerri) سے احمدی ڈاکٹرز اور اساتذہ پہنچ گئے تھے

چھوٹے موٹے مضامین لکھنے لگا۔ مقامی جماعت شہر اور دیہات میں تبلیغی جلسے کرتی تو مجھے بھی ساتھ لے جاتی۔ وہاں مجھے تقریر بھی کرنی پڑتی۔ امیر صاحب کو میری ان ''حرکات'' کا علم ہو گیا اور انہوں نے جلسہ سالانہ پر میری تقریر رکھنی شروع کر دی۔

جسٹس عبدالرحیم بکرے   امیر جماعت محمد اجمل شاہد

آبادی کے بچوں کا گروپ سڑک کے کنارے سیر کر رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر رُک گئے اور پھر آ کر مسجد کے گیٹ کے سامنے لائن بنائی۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہماری بھی فوٹو بناؤ۔ چنانچہ ہم نے اُن کی تصویر بنائی۔

مولانا کرم الٰہی ظفر صاحب نے ہمیں مسجد دکھائی۔ وہاں صدقہ میں بھیڑ ذبح کیے۔

اقبال نجم صاحب نے ہمیں مسجد قرطبہ، قلعہ اور شہر کی سیر کرائی۔

ایتھنز کی "وزٹ" "اکروپولس (Acropolis)"

وہ ساحل جہاں سے کبھی سکندرِ اعظم اور دیگر فاتح جرنیلوں کا بحری بیڑا روانہ ہوا ہو گا۔

لندن میں سفاری پارک کی سیر ۔ بھوکے شیر نے گاڑی کو روک لیا

روم کی سیر۔ وہ ''کلوزیم''، جہاں رومن بادشاہ ابتدائی عیسائیوں کو انتہائی ظلم وستم کا نشانہ بنایا کرتے تھے

باب ہفتم

اجی بواوڈے میں آخری ایام

اجی بواوڈے میں آخری دوتین سال کچھ خوش کُن نہ تھے۔ یوں تو ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آغاز کے ساتھ ہی نائیجیریا کے اقتصادی حالات میں کمزوری آنی شروع ہوگئی تھی اور ملکی کرنسی کی قوت خرید آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی لیکن ۱۹۸۵ء تک تو سب کاروبار مندے پڑ گئے تھے اور مہنگائی میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ اس مالی بحران کا اثر میرے ہسپتال پر بھی پڑا۔ مزید برآں اس عرصہ میں کئی پرائیویٹ ہسپتال بھی اردگرد کُھل گئے تھے جن کی وجہ سے میرے ہسپتال کی رونق ماند پڑ گئی اور میں ایک دفعہ پھر مالی مشکلات کا شکار ہوگیا۔

صوبائی حکومتوں نے بھی اخراجات کم کرنے کے لیے کفایت شعاری کی پالیسی اپنائی اور غیر ملکی اساتذہ، ڈاکٹرز اور انجینئرز کی نہ صرف نئی بھرتی روک دی بلکہ پہلے سے بھرتی شدہ ملازمین کے کنٹریکٹ کی تجدید سے بھی انکار کر دیا۔ اس طرح وہ سب انڈین، پاکستانی اور سری لنکن اساتذہ جو ستر کی دہائی میں ہمارے اردگرد ہمارے دیکھتے دیکھتے آباد ہوئے تھے۔ اب آہستہ آہستہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس جانے لگے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی عبدالمنان بھی پاکستان واپس جا چکا تھا۔ سوائے مولوی صفی الرحمٰن صاحب خورشید کے سارے شہر اور گردونواح میں ۱۹۸۶ء تک کوئی ہم وطن، ہم زبان یا کوئی ایشیائی دوست موجود نہ تھا۔ اُن بیسیوں گھرانوں میں سے جو تین سال قبل بیٹی کی شادی میں باعث رونق بنے تھے، ایک بھی باقی نہ رہا تھا۔ بیٹی جرمنی جا چکی تھی اور دونوں بڑے لڑکے کالجوں میں تھے۔ گھر میں اب ہم میاں بیوی تھے اور ہماری تنہائی اور اداسی۔ اکارے کی طرح مالی پریشانی الگ تھی۔ اب کے تو اپنے مستقبل کے ساتھ لڑکوں کا مستقبل بھی فکر مند کر رہا تھا۔ ان کا یہاں رہنا ممکن نہ تھا۔ پاکستان جا نہیں سکتے تھے۔ اب کہاں جائیں گے، کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اک دعاؤں کا سہارا تھا اور کسی غیبی ہاتھ کا انتظار۔

پاکستان کا اچانک سفر

بعض خاندانی مسائل کے سلسلے میں فروری ۱۹۸۶ء میں مجھے پاکستان جانا پڑا۔ واپسی پر ہمارا خیال تھا کہ جرمنی میں بیٹی سے ملتے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ میں نے واپسی کی بکنگ کراچی سے فرینکفرٹ، لندن، لیگوس کے لیے کرائی تھی۔ لیکن جب لیگوس میں جرمن ایمبسی میں ویزا لینے گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ''چودھویں صدی سے متعلق پیشگوئیاں'' کے موضوع پر میری ایک تقریر غیر احمدیوں کی سنٹرل مسجد میں ہوئی تھی جو بعد میں اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں چھپی اور اس کا جرمن ترجمہ بھی بعد میں چھپا۔ جس جرمن دوست نے ترجمہ کیا تھا اس نے کہا کہ وہ اپنی کمپنی کی طرف سے سپانسر کرنے کی فیکس کر رہا ہے۔ میں پاکستان جا کر ویزا لے لوں لیکن بایں ہمہ اسلام آباد سے ویزا ملا نہ کراچی سے۔ مجبوراً ہمیں فرینکفرٹ کو چھوڑ کر پیرس ہوتے ہوئے لندن آنا پڑا۔ یہ وہی فلائیٹ ہے جس پر ہمیں ''چانس پیسنجر'' کے طور پر سفر کرنا پڑا تھا۔ لندن پہنچ کر میں نے جرمنی میں اپنے اس جرمن دوست سے بات کی تو اس نے لندن جرمن ایمبسی سے فون پر بات کی لیکن لندن ایمبسی نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر لیگوس، اسلام آباد سے ویزا نہیں ملا تو ہم یہاں نہیں دے سکتے۔

زندگی میں پہلی بار مجھے کسی ملک نے ویزہ دینے سے انکار کیا تھا۔ حالانکہ اس ملک میں میری بیٹی رہتی تھی اور پھر ایک طرف سے نہیں چاروں اطراف سے ہمارا داخلہ جرمنی میں بند ہوا تھا۔ بیوی بچے حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ تو اب جرمنی میں آ کر کھلا کہ منشائے الٰہی میں جرمنی کا ویزہ نہیں نیشنلٹی مقدّر تھی، اور پھر ڈبل نیشنلٹی۔ اگر اس وقت چند روز کے لئے ہم چکر لگا لیتے تو بعید نہ تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جاتی جس کے نتیجہ میں ہم بعد میں وہ فیصلے نہ کر سکتے جو ہم نے کئے۔ اُس وقت ہمارا جرمنی میں نہ آنا ہی بہتر تھا گو یہ بات ہمارے لیے بہت مایوسی اور تکلیف کا باعث بنی تھی۔

میں لندن میں چند روز ٹھہرا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے نائیجیریا کے حالات سے متعلق پوچھا اور پھر فرمایا کہ ہم نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں، تم وہاں پہنچو۔ چند روز بعد تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ واپسی سفر کے دوران میں یہ سوچتا رہا کہ کچھ ہلچل تو ہوئی ہے۔ اب دیکھیں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ شاید ان تبدیلیوں میں ہی میری ان پریشانیوں کا حل مضمر ہو جو ان دنوں مجھے درپیش ہیں۔

نائیجیریا میں ڈاکٹرز کے تبادلے

لندن سے واپس نائیجیریا آئے ایک دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹرز کی تبدیلیوں کے متعلق خط مل گیا۔ اس کے مطابق درج ذیل تبدیلیاں کی گئی تھیں:-

۱۔ کانو کلینک جماعت کا اچھا بڑا ادارہ تھا۔ اس وقت اس میں یہ چار ڈاکٹرز کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب اوران کی اہلیہ ڈاکٹر، اور ڈاکٹر توقیر احمد صاحب اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب انچارج تھے۔ ان کو تبدیل کر کے احمدیہ ہسپتال اجوکورو (لیگوس) میں لگا دیا گیا تھا، جبکہ ڈاکٹر توقیر احمد اور ان کی اہلیہ کانو میں بدستور کام کرتے رہے۔

۲۔ ''اجوکورو'' ہسپتال سے ڈاکٹر منور احمد صاحب کو تبدیل کر کے اجی بواوڈے ہسپتال میں لگا دیا گیا تھا۔

۳۔ خاکسار ڈاکٹر بھٹہ کو اجی بواوڈے ہسپتال سے تبدیل کر کے کانو کلینک کا انچارج لگا دیا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر توقیر احمد مع اہلیہ کام کر رہے تھے اور کرتے رہے۔

۴۔ اس خط میں مزید لکھا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹہ کو نائیجیریا میں سب ہسپتالوں کا ''چیف میڈیکل افسر'' اور نگران مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مکرم شاہد احمد قریشی صاحب کو سب سکولوں کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔

ان احکامات پر فوری طور پر عمل نہ ہو سکا تھا اور نہ ہی یہ تبدیلیاں اسی ترتیب سے عمل میں آئی تھیں۔

بچوں کا تعلیمی سال ختم ہونے والا تھا لہٰذا میں امتحانات کے بعد دو ماہ کی تاخیر سے کانو کلینک کا چارج لینے جا سکا تھا۔

ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب نے اسی اثناء میں کانو کلینک کا چارج ڈاکٹر توقیر احمد کو دے دیا اور خود وہ دو ماہ کی چھٹّی کے لے کر کانو میں ہی اپنے بنگلے میں رہائش پذیر رہے۔ ان کے پاس برٹش نیشنلٹی تھی اور بچے بڑے ہو رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے

چھٹی کے دوران انگلینڈ میں اپنے بچوں کو سیٹ کیا اور پھرا کیلے اجوکورو ہسپتال کا چارج لینے گئے تھے۔

ڈاکٹر منور احمد صاحب کے پاس بھی برٹش نیشنلٹی تھی اور بچے ان کے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ جب یہ اجوکورو ہسپتال سے چارج دے کر فارغ ہوئے تو یہ مجھ سے چارج لینے اجی بواوڈے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے بچوں کو برطانیہ میں سیٹ کرنے کے لیے چھٹی انہوں نے بھی لمبی لے لی تھی اور برطانیہ چلے گئے تھے۔ ایک میں ہی تھا جس کی نیشنلٹی اگر تھی بھی تو مفید مطلب نہ رہی تھی۔ اور بچے میرے ان کے بچوں سے بھی بڑے تھے۔ اور پھر چھٹی میں اتفاق سے ان تبدیلیوں سے پہلے لے چکا تھا۔ اب اگر میں اپنے بچوں کو سیٹ کرنے کی سوچتا بھی تو کہاں، کیسے اور کب؟ چنانچہ خاموشی سے کانو کے لیے رختِ سفر باندھنے لگا۔ ڈاکٹر سردار حمید احمد کا ذکر آیا ہے تو بعض پرانی یادیں ذہن میں اُبھر آئی ہیں۔ بہتر ہے آگے بڑھنے سے پہلے ان کا ذکر کر دوں۔

ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب - کچھ پرانی یادیں

ڈاکٹر حمید احمد صاحب کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب میں لاہور میں تعلیم الاسلام کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ بہت مخلص اور ملنسار نوجوان تھے۔ ان ہی دنوں جب حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ لاہور تشریف لائے تو ٹی۔ آئی۔ کالج کی طرف سے حضور کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا تھا۔ اس فنکشن میں سردار حمید احمد صاحب نے تلاوت کی تھی اور مجھے یاد ہے کہ انہوں نے سورۃ الاعلیٰ پڑھی تھی۔ میں ان کی تلاوت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ہماری ڈیوٹی اس ٹیبل پر تھی جس پر حضور رضی اللہ عنہ بعض مہمانانِ خصوصی کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اس دعوت کی ایک بات جو مجھے عجیب لگی تھی وہ ''فرنی'' تھی جو مٹی کی چھوٹی چھوٹی پرچوں میں پھیلا کر جما دی گئی تھی۔ دو پلیٹس جوڑ کر ہر مہمان کو پیش کی گئی تھیں۔ حضور نے ایک پلیٹ لی اور دوسری چھوڑ دی تھی۔ اسی طرح دوسرا کھانا بھی حضور نے کم ہی تناول فرمایا تھا۔ ہم نے حضور کا پس خوردہ سنبھال لیا تھا اور بعد میں تبرک کے طور پر آپس میں بانٹ لیا تھا۔ اس کے بعد پاکستان میں اگر حمید احمد صاحب سے کبھی ملاقات ہوئی تو اس وقت مجھے یاد نہیں۔

پھر ستمبر ۱۹۷۱ء میں جب میں نائیجیریا گیا تو دو اڑھائی ماہ بعد جماعت احمدیہ نائیجیریا کا جلسہ سالانہ لیگوس میں منعقد ہوا۔ جلسہ پر سردار حمید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو بہت خوشی ہوئی۔ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اُن کی اہلیہ ابادان ٹیچنگ ہسپتال میں جاب کرتی تھیں اور یہ میڈیکل کا کوئی کورس کر رہے تھے۔ اس کے بعد بھی اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ ہم اُن کے ہاں ابادان بھی جاتے رہے تھے۔

ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب کی اکارے آمد

لیگوس میں دسمبر ۱۹۷۲ء میں منعقدہ جلسہ سالانہ میں مَیں اکارے سے آ کر شامل ہوا تھا۔ اس وقت میرے پاس گاڑی نہ تھی اور لئیق احمد چودھری صاحب جو اکارے کے قریب بطور انجینئر کام کرتے تھے ہمیں اپنی گاڑی میں لیگوس لے کر گئے تھے۔ ان کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔

جلسہ میں برادرم شکیل احمد منیر صاحب اور ڈاکٹر حمید احمد صاحب بھی شامل تھے۔ شکیل احمد منیر صاحب نے ہم سب کو دعوت دی کہ جلسہ کے بعد ہم انکے ساتھ واری (Warri) چلیں اور چند دن اُن کے ہاں گزاریں۔ کرسمس کی چھٹیاں تھیں، سب راضی ہو گئے۔ ان کی تین گاڑیوں میں میری فیملی بھی بآسانی سما گئی تھی۔ سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم واری پہنچے۔ چند دن خوب لطف اندوز ہوئے اور پھر شکیل احمد منیر صاحب سے ہم نے اجازت لی، شکریہ ادا کیا اور واپس چل دیئے۔

واپسی پر میں نے ڈاکٹر سردار حمید صاحب سے کہا کہ شام ہو گئی ہے۔ آئیں رات ہمارے ہاں ٹھہر جائیں۔ چنانچہ انہوں نے میری دعوت قبول کر لی اور رات اکارے میں ٹھہرے۔

رات کھانے کے بعد میں اور ڈاکٹر حمید احمد بالکونی میں کھڑے شہر کی روشنیوں اور اردگرد کی پہاڑیوں کا نظارہ کرنے لگے۔ ہم نے پرانی یادیں تازہ کیں اور ایک دوسرے کے قصے سنے سنائے۔ پھر اچانک ڈاکٹر صاحب بولے: ''یار یہ ڈیڑھ دو گھنٹہ میں تم نے بڑا پُر تکلّف ''تھری کورس ڈنر'' تیار کر لیا ہے۔ اس جنگل میں تمہیں یہ سب کچھ کہاں سے مل جاتا ہے۔''

میں نے بتایا کہ شروع میں بہت پریشانی ہوئی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے ایک نائیجیرین دوست کے ذریعہ ''سپلائی لائن'' کھول دی۔ وہ ہر ماہ ٹرک لے کر لیگوس جاتا ہے۔ ہم اس کو لسٹ دے دیتے ہیں اور امیر صاحب خرید کر اسے دے دیتے ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر ڈاکٹر صاحب نے کہا

''تم نے وقف کیا ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ وقف کروں لیکن ایک خوف سا ہے۔''

میں نے پوچھا خوف کس بات کا ہے، تو بولے:

''اس وقت ہماری تنخواہ کئی سو پاؤنڈز ہے اور بمشکل بچوں کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ وقف میں سنتے ہیں کہ ساٹھ پاؤنڈز ملتے ہیں۔ بچے تمہارے بھی تین ہیں۔ یہ بتاؤ گزارہ کیسے کرتے ہو۔''

میں نے کہا:

''یہ تو پتہ نہیں گزارا کیسے ہو جاتا ہے لیکن ہو بہت اچھا جاتا ہے۔ میں تو دس پندرہ پاؤنڈز بچا بھی لیتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ تنخواہ نہیں تحفہ ہے جو خلیفہ وقت کی طرف سے ملتا ہے اور اس میں بہت برکت ہے۔''

پھر میں نے کہا:

''اس بنیادی الاؤنس کے ساتھ دیگر مراعات بھی تو ہیں۔ اور پھر کلینک اچھی چلے تو آمد میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔''

پھر ہم وقف، قربانی اور توکّل ایسے موضوعات پر کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ ۱۹۷۱ء میں جب میں نے بارہ سالہ ملازمت چھوڑ کر وقف کیا تو میرے ایک دیرینہ دوست ڈاکٹر نے میرے بڑے بھائی سے کہا کہ ''بہتر تھا ریٹائرمنٹ کے بعد دو چار سال وقف کر دیتا۔ یہ وقف تو نری قربانی ہی قربانی ہے۔ کچھ بڑھاپے کا بھی سوچ لیتا۔'' بھائی

صاحب نے مجھ سے اس کی رائے کا ذکر کیا تو میں نے کہا ''اس کی رائے اپنی جگہ بجا لیکن یہ میں کیسے مان لوں کہ اگر سرکاری ملازمت کروں تو میرا بڑھاپا محفوظ ہے اور اگر خدائی خدمتگار بنوں تو بڑھاپا غیر محفوظ ہے۔'' اگلی صبح ناشتے کے بعد ہمارے یہ معزز مہمان آگے چل دیئے۔

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر حمید احمد صاحب نے وقف کیا اور گھانا میں سرجن کے طور پر خدمت کی توفیق پائی۔ پھر ان کو نائیجیریا میں احمدیہ کلینک کانو کا انچارج لگا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے کئی سال تک کام کیا اور کلینک کی ترقی اور توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور اب ۱۹۸۶ء میں ان کا تبادلہ ہوا تو میں ان کی جگہ کانو کلینک کے انچارج کے طور پر جانے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میرے جانے سے پہلے ہی ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب کلینک کا چارج ڈاکٹر توقیر احمد صاحب کو دے کر فارغ ہو چکے تھے اور کچھ چھُٹی لے کر کانو میں ہی رہائش پذیر تھے۔

اجی بواوڈے سے کانو - ایک کٹھن سفر

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ڈاکٹر منور احمد صاحب اجوکورو ہسپتال سے فارغ ہو کر انگلینڈ چھُٹی پر چلے گئے تھے۔ لہٰذا مجھ سے اجی بواوڈے ہسپتال کا چارج لینے کے لیے ایک نوجوان نائیجیرین ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ ان کا نام نورالدین اکین ڈیلے (Nur-Ud-Din Akindele) تھا۔ میں ان کو جانتا نہ تھا گو میں نے ان کو ایک دو دفعہ احمدیہ کلینک اپاپا (لیگوس) میں ڈاکٹر انوارالدین کے ہاں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر نورالدین اکین ڈیلے صاحب کو چارج دے کر سامان تو میں نے باندھ لیا۔ لیکن کانو میں رہائش کا مسئلہ بن گیا۔ کانو کلینک کے اُوپر دو بڑے اچھے کشادہ فلیٹ تھے۔ ایک میں ڈاکٹر توقیر احمد صاحب رہتے تھے اور ان کے اُوپر دوسرے فلیٹ میں ڈینٹل سرجن رہتے تھے جو کانو کلینک کے ڈینٹل شعبہ کے انچارج تھے۔ ان کا نام بھی حمید اللہ تھا۔ (یہ وقف سے فراغت کے بعد کراچی میں پریکٹس کرنے لگے تھے اور چند سال قبل اُن کو اغوا کر کے نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔)

ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب کرائے پر باہر بنگلہ لے کر رہتے تھے اور کلینک کا چارج دینے کے بعد یہ چھُٹی پر بدستور اپنے بنگلہ میں رہائش پذیر رہے۔ ان حالات میں میرے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے لیے کوئی اور رہائش تلاش کرتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں پہلے اکیلا کانو جاؤں اور کسی مکان کا بندوبست کر کے پھر سامان اور بچوں کو لے کر جاؤں۔ لہٰذا میں کانو گیا اور ڈاکٹر توقیر احمد کے گیسٹ روم میں ٹھہرا۔ ہسپتال کے کام سے فارغ ہو کر میں مکان کی تلاش میں نکل جاتا۔ کلینک کے سٹاف اور ایک ایجنٹ نے بھی تلاش میں مدد کی لیکن سب سے بڑھ کر مدد ڈاکٹر سردار حمید احمد صاحب نے کی۔ یہ شہر کے مختلف علاقوں سے بھی واقف تھے اور میری ضرورت کی نوعیت سے بھی۔ کوئی دو ہفتہ کی تگ و دَو کے بعد ہم نے ایک مناسب مکان ڈھونڈ لیا اور میں سامان اور بیوی بچوں کو لینے واپس اجی بواوڈے آیا۔

اب مشکل یہ آن پڑی کہ بیوی بچے تو ہوائی جہاز کے ذریعہ لیگوس سے کانو جا سکتے تھے لیکن سامان قدرے زیادہ تھا۔ مولوی صفی الرحمٰن خورشید صاحب میرے وہاں مشیر اور مددگار تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک پک اپ کرائے پر لی جائے اور اس میں سامان لاد کر ایک دفعہ پھر میں اکیلا ہی کانو جاؤں۔

ایک ورکشاپ کا منیجر قدرے واقف تھا۔ اس سے بات کی تو وہ معقول معاوضہ لے کر سامان کو کانو چھوڑ آنے پر راضی ہو گیا۔ لیگوس سے کانو ایسے ہی ہے جیسے لاہور سے کراچی۔ ہزار گیارہ سو کلومیٹر تو ہو گا۔ اجی بواوڈے سے کوئی سو کلومیٹر کم کر لیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر صبح جلدی نکل جائیں تو مغرب کے وقت تک کانو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک صبح مولوی صفی الرحمٰن صاحب نے ہمیں دعا کے ساتھ رخصت کیا۔ راستے میں کچھ کھانے اور کچھ مطالعہ کا سامان میں نے ساتھ رکھ لیا تھا۔ سوڈیڑھ سو کلومیٹر تو ٹھیک گئے پھر سامان کے اُوپر جو پلاسٹک کی چادر ڈال کر باندھ رکھی تھی اس میں ہوا بھر گئی اور گاڑی غیر متوازن ہو گئی۔ اس چادر کو ٹھیک کر کے چلتے تو ہوا پھر کسی نہ کسی طرح گھس جاتی۔ بار بار رُک کر اس کو ٹھیک کرتے رہے۔ پھر بارش نے آلیا۔ چاروں طرف جنگل بیابان اور موسلا دھار بارش۔

ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سڑک بارش سے اور بھی خراب اور خطرناک ہو گئی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ چور ڈاکو کا خوف الگ تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ یہ مہم جُوئی کر کے شاید میں نے غلطی کی ہے۔ اور غلطی کا یہ احساس مجھے اور بھی زیادہ توبہ، استغفار اور دعاؤں میں غرق کر رہا تھا۔ کھانے پینے اور مطالعہ کے لیے جو کچھ ساتھ لیا تھا، اس کو تو ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہ آئی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا دھڑ کا ہر سفر میں رہتا ہے۔ ٹائر پنکچر ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کرتے رہے جب بارش تھمی تو ڈرائیور نے جیک نکالا اور لگا گاڑی کو اُٹھانے۔ لیکن وزن کی وجہ سے گاڑی اُٹھ ہی نہ رہی تھی۔ میری گھبراہٹ دیکھی تو اس نے مجھے ایک درخت کے نیچے پتھر پر بٹھا دیا اور خود دو تین پتھر تلاش کر کے لایا۔ جیک کے نیچے پتھر ٹکا کر اس نے گاڑی اُٹھالی اور ٹائر بدل لیا۔ اور پھر اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کی ''اجازت'' دی۔ آگے چل کر ایک چھوٹا سا شہر آیا۔ وہاں ٹائر کی مرمت کروانے لگے تو پتہ چلا کہ ٹائر بری طرح مجروح ہے لہٰذا نیا ٹائر خریدا اور پھر آگے چلے۔ اب رات کا سفر تھا اور تھکاوٹ اور پریشانی سے برا حال تھا۔ بمشکل رات بارہ بجے تک ہم ''کاڈونا (Kaduna)'' پہنچ سکے۔ وہاں ہم رات ہوٹل میں ٹھہرے۔ تقریباً سو کلومیٹر آگے کانو تھا۔ اگلی صبح ناشتہ کے بعد ہم چلے اور صبح دس بجے ہم احمدیہ کلینک کانو پہنچ گئے۔ جلدی سے سامان کلینک کے ایک کمرے میں رکھوایا اور ڈرائیور کو فارغ کیا۔ اس کو واپسی کی جلدی تھی۔ اسی دن رات تک وہ واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے بھی یہ سفر تلخ تجربہ تھا اور شاید ایک خسارے کا سودا بھی۔ میں نے آئندہ دو تین دن میں گھر کی صفائی وغیرہ کروا کر سامان اس میں شفٹ کیا اور پھر میں واپس اجی بواوڈے پہنچا اور بیوی بچوں کو لے کر کانو آیا۔

باب ہشتم

نائیجیریا میں میرے آخری چار سال

(کانو کے واقعات)

نائیجیریا میں میرے آخری چار سال ''کانو (Kano)'' میں گزرے۔ یہ چار سالہ دور بہت صبر آزما اور انقلابی تھا۔ آتے ہی حالات کا رُخ بڑی سرعت کے ساتھ بدلنے لگا تھا اور میں اس کے اُتار چڑھاؤ اور پیچ وخم کے ساتھ ساتھ بے اختیار بہتا چلا گیا۔ کسی سوچ بچار یا ہاتھ پاؤں مارنے کی مہلت ملی نہ گنجائش دیکھی۔ بس اسی میں خیر سمجھی کہ یہ بنتے، بگڑتے اور بدلتے حالات جدھر دھکیلے لئے جارہے ہیں مَیں اُدھر ہی سرِ تسلیم خم کئے اور دعاؤں کا سہارا لیے بڑھتا چلا جاؤں۔ اور پھر بالآخر حالات نے ایسا موڑ لیا جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ڈاکٹر توقیر احمد صاحب کی پاکستان واپسی

ستمبر ۱۹۸۶ء میں مَیں نے احمدیہ کلینک کانو میں کام شروع کیا تو ڈاکٹر توقیر احمد صاحب نے میرے ساتھ بہت اچھا تعاون کیا۔ مجھے ان کمپنیوں، بنکوں اور اداروں سے متعارف کرایا جو علاج کے لیے ہماری کلینک سے منسلک تھے۔ آہستہ آہستہ شہر کی اہم شخصیات سے بھی ملتے رہے۔

فروری ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر توقیر احمد صاحب نے دو ہفتہ کی چھٹی پر انگلینڈ جانے کا پروگرام بنایا۔ جب وہ چھٹی سے واپس آئے تو اُن کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی لہٰذا وکیل التبشیر صاحب لندن کی ہدایت کے مطابق اُن کو واپس پاکستان بھجوا دیا گیا اور میں نے انہی کی ہدایات پر ایک مسلمان نائیجیرین ڈاکٹر کو ملازم رکھ لیا اور اس طرح ہسپتال کا کام بخوبی چلتا رہا۔ باہر کا مکان چھوڑ کر اب میں کلینک کے اُوپر ڈاکٹر توقیر احمد کے خالی کردہ فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔

ڈاکٹر مبشر احمد صاحب کی کانو کلینک میں تقرّری

ڈاکٹر توقیر احمد صاحب کے جانے کے بعد دو تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے امیر صاحب کا خط ملا کہ ڈاکٹر مبشر احمد اور ان کی اہلیہ کی تقرّری احمد کلینک کانو میں کر دی گئی ہے۔ میں ان کو عرصہ سے جانتا تھا۔ اجی بواوڈے کی نواحی بستی ''اموسان'' (Amosan) میں انہوں نے ۱۹۸۰ء میں ہسپتال کا آغاز کیا تھا۔ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے ان کے ہسپتال کا معائنہ فرمایا تھا۔ پھر ۱۹۸۳ء کے آخر میں اُن کو اُویری (Owerri) میں کلینک کا آغاز کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہاں اُنہوں نے ساڑھے تین سال کام کیا۔ اور اب ۱۹۸۷ء میں ان کو اُویری سے تبدیل کر کے کانو کلینک میں لگا دیا گیا تھا۔

جب ڈاکٹر مبشر احمد صاحب کانو آئے تو میں نے اُن کو اپنے فلیٹ کے اُوپر ڈینٹل سرجن والے فلیٹ میں ٹھہرایا کیونکہ

ڈینٹل سرجن چھٹی پر پاکستان گئے ہوئے تھے۔ پھر ایک ڈیڑھ ماہ میں اُنہوں نے باہر اپنے لیے ایک بنگلہ تلاش کر لیا اور اس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ ہسپتال میں یہ بہت اچھا کام کرتے رہے اور تعاون کرتے تھے۔ خاموشی سے آتے، اپنا کام کرتے اور چلے جاتے۔ بات چیت کم ہی کرتے تھے۔

پولیس سٹیشن طلبی

چند دن بعد خفیہ پولیس کے دو سپاہی ہسپتال آئے اور مجھے پولیس سٹیشن چلنے کو کہا۔ میں گیا تو پولیس افسر نے کہا کہ (Uba Ahmad) اُوبا احمد نامی کسی مریض کا خط ملا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ تم علاج ٹھیک نہیں کرتے۔ اصلی ڈاکٹر نہیں ہو۔ مریضوں کی جان کو خطرہ ہے وغیرہ۔ اس نے کہا کہ تم ان سپاہیوں کو لے جاؤ اور اپنی ڈگری، رجسٹریشن، تجربہ اور ایمیگریشن وغیرہ کے سرٹیفکیٹس کی نقول ان کے ہاتھ بھیج دو اور ہسپتال کا رجسٹر چیک کراؤ۔ چنانچہ وہ سپاہی میرے ساتھ آئے اور جملہ نقول حاصل کیں اور جب رجسٹر چیک کیا تو اس سال بھر میں اس نام کا کوئی مریض وہاں درج نہ پایا۔

اس طرح یہ بات یہاں ختم تو ہو گئی لیکن مجھے گھبراہٹ ہونے لگی کہ یار لوگ تو اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے ہیں۔ اس واقعہ کی اطلاع میں نے امیر صاحب کو، صدر نصرت جہاں بورڈ کو اور لندن میں وکیل التبشیر صاحب کو فوری طور پر دے دی تھی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا دورہ نائیجیریا

جنوری ۱۹۸۸ء میں آڈیٹر صاحب اپنا دورہ مکمل کر کے واپس لندن گئے اور اپنی آڈٹ رپورٹ حضور کی خدمت میں پیش کی۔ فروری ۱۹۸۸ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے گھانا اور نائیجیریا کا دورہ فرمایا۔ حضور لیگوس تشریف لائے تو جماعت کے عہدہ داران اور ممبران نصرت جہاں بورڈ نے حضور سے ملاقات کی اور تین روز بعد حضور کانو بھی تشریف لائے۔

کھانا پکانے کی سعادت

کانو جماعت نے احمدیہ سکول کے پرنسپل مکرم رفیق احمد ثاقب صاحب سے مشورہ کے بعد یہ طے کیا تھا کہ کانو میں حضور اور حضور کے قافلے کا قیام احمدیہ سکول کے کمپاؤنڈ میں ہوگا۔ اس غرض کے لیے پرنسپل صاحب اور چودھری بشیر احمد صاحب نے اپنے مکانات فارغ کر دیئے تھے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ کھانا مَیں تیار کر کے وہاں پہنچایا کروں۔ میرے لیے یہ بہت اعزاز اور سعادت کی بات تھی۔ تاہم ذمہ داری کا احساس بھی بھاری تھا کیونکہ کلینک اور سکول میں کئی میل کا فاصلہ تھا اور راستے میں ٹریفک بھی بہت ہوتی تھی۔ خوف تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور میں کھانا وقت پر پہنچاتا رہا۔ اور حضور نے پسند فرمایا۔ پہلے روز دوپہر کا کھانا تناول فرماتے ہوئے حضور نے ایک بچی سے پوچھا کہ یہ کھانا کس نے پکایا ہے تو بچی نے جواب دیا ''آنٹی بھٹہ'' نے۔ حضور نے فرمایا: ''ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔'' حضور کے بھانجے

سید قاسم احمد شاہ صاحب وہاں موجود تھے۔ انہوں نے یہ پیغام مجھے دیا تھا کہ اہلیہ تک پہنچا دوں۔ دوسرے روز کانو سے واپس لیگوس جانے کے لیے جب حضور کانو ائیر پورٹ پر تھے تو ہم ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ حضور نے اہلیہ سے پوچھا: ''میرا پیغام مل گیا تھا۔ آپ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔'' اہلیہ نے عرض کی ''جی حضور پیغام مل گیا تھا، یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' اور پھر اس ذرہ نوازی کو اہلیہ نے ساری عمر یاد رکھا۔ یہاں جرمنی آ کر اپنی سہیلیوں سے جب کبھی کھانے پکانے کی باتیں کرتیں تو وہ بڑی خوشی سے حضور کی اس ذرہ نوازی اور قدر دانی کا ذکر کرتیں۔ اور یہ بھی ذکر کرتیں کہ ۱۹۸۰ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نائیجیریا تشریف لائے تھے تو اس وقت بھی دوپہر کا کھانا پکا کر ابادان پہنچانے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی تھی۔

لیگوس میں الوداعی ملاقات

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کانو سے واپس لیگوس تشریف لے گئے تو میں نے حضور کے ارشاد کے مطابق اسی نائیجیرین مسلمان ڈاکٹر کو ملازم رکھ لیا جسے ڈاکٹر توقیر احمد صاحب کے جانے کے بعد رکھا تھا۔ دو روز بعد حضور کا دورہ قریب الاختتام تھا۔ میں اور ڈینٹل سرجن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کانو سے لیگوس گئے تا کہ الوداعی ملاقات کر سکیں۔ وہاں سب ڈاکٹرز کے ساتھ حضور کی گروپ فوٹو میں ہم شامل ہوئے۔ شام کو کانو واپس آنے کے لیے ہم نے حضور سے اجازت مانگی تو حضور نے شرفِ معانقہ بخشا اور نصائح اور دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت عنایت فرمائی۔

واپسی کی اجازت

خاکسار نے چھ سال کے لیے وقف کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اٹھارہ سال خدمت کی توفیق پائی۔ اب میرے گھریلو حالات نائیجیریا میں مزید قیام کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس صورتحال میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے خاکسار کو واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ایک فلیٹ سے دوسرے فلیٹ میں

مکرم امیر صاحب نے مجھے ایک ماہ میں احمدیہ کلینک کے فلیٹ کو خالی کرنے کا کہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ا کین ڈیلے نے بعد میں چھ دن میں خالی کر کے سکول کے ایک کواٹر میں منتقل ہونے کا کہہ دیا۔ چنانچہ میں نے کتابوں کے دو تین کارٹن تیار کر رکھے تھے۔ اُسی شام ان کو سکول والے کوارٹر میں چھوڑ آیا۔ دوسرا سامان بھی ہم جلدی جلدی باندھنے لگے تھے۔ دوسرے روز میں مارکیٹ سے شاپنگ کر کے واپسی پر مکرم مظفر احمد منصور صاحب سے ان کے دفتر میں جا ملا۔ یہ ایم۔ اے منصور صاحب میرے دیرینہ دوست تھے۔ اجی بواوڈے میں بھی ہم اکٹھے رہ چکے تھے۔ انہوں نے ''اگر یمان'' نام سے ایک کمپنی کانو میں قائم کر رکھی تھی۔ اُن کو علم تھا کہ میں احمدیہ کلینک کانو سے الگ ہو چکا ہوں۔ میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے پوچھا ''اب کہاں جاؤ گے؟''

میں نے کہا ''فی الحال تو سکول کے ایک مکان میں شفٹ ہو رہا ہوں۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔''

انہوں نے کہا ''میں جانتا ہوں اس مکان کو۔ وہ دُور بھی ہے اور چھوٹا بھی۔ وہاں گرمی اور گھٹن بہت ہے اور پانی کا مسئلہ بھی۔''

میں نے کہا ''یہ مسائل تو ہیں اور پھر میرے پاس گاڑی بھی نہیں۔ لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔''

یہ سنتے ہی انہوں نے اپنی میز کی دراز کھولی اور چابیوں کا ایک گچھا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولے ''میری کمپنی کا منیجر دو ہفتہ پہلے نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا فرنشڈ فلیٹ خالی ہے۔ مزید چھ ماہ کا کرایہ ادا شدہ ہے۔ جائیں اور اس میں شفٹ ہو جائیں۔'' ان حالات میں منصور صاحب کی یہ پیشکش اللہ تعالیٰ کی عجیب تائیدِ الٰہی تھی۔ میں نے سنا تو میری خوشی کی انتہاء نہ تھی۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اُٹھا اور پھر آئندہ تین دن میں ان کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ چھٹے دن میں نے احمدیہ کلینک کے فلیٹ کی چابیاں ڈاکٹر اکین ڈیلے صاحب کے حوالے کر دیں۔ ساتھ ہی میں نے کلینک کی گاڑی کی چابی بھی ان کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دی۔ ایک فلیٹ سے نکال کر اللہ تعالیٰ نے دوسرے فلیٹ میں بٹھا دیا تھا۔

گاڑی کا بندوبست

مکرم سید قاسم احمد شاہ صاحب نے ان دنوں میری بہت مدد کی تھی۔ وہ گاہے گاہے فلیٹ میں ہمارا حال پوچھنے آتے تھے۔ میری اہلیہ کو ان کے بچوں سے مل کر بڑا حوصلہ اور سکون ملتا تھا۔ جس روز میں نے کلینک کی چابیاں اور گاڑی واپس کرنی تھی، اس سے ایک روز پہلے شاہ صاحب آئے تو میں نے کچھ پریشانی کا اظہار کیا کہ کل میں نے کلینک کی گاڑی واپس کرنی ہے اور پھر بغیر گاڑی کے بڑی مشکل ہو گی۔

شاہ صاحب نے فوراً کہا کہ زاریہ یونیورسٹی کے پروفیسر منیر رشید صاحب کے پاس اس وقت دو گاڑیاں ہیں۔ ان کا ایک دوست دو ماہ کی چھٹّی گیا ہے اور اپنی گاڑی پروفیسر صاحب کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ چلو! ان سے مل کر بات کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم گئے اور شاہ صاحب نے پروفیسر صاحب سے بات کی تو وہ اپنی گاڑی دو ماہ کے لیے مجھے دینے پر راضی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے میں ان کا بہت مشکور ہوا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر اکین ڈیلے کی دی گئی چھ دن کی مہلت کے اندر اندر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مجھے فرنشڈ فلیٹ مہیا کر دیا تھا بلکہ گاڑی بھی عنائت فرما دی تھی۔

گرفتاری سے پھر بال بال بچا

کلینک سے الگ ہوئے مجھے دس بارہ دن ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن مولوی نصیر احمد چودھری صاحب میرے ہاں آئے اور بتایا کہ ایک پولیس افسر جیپ میں سپاہی لے کر احمدیہ کلینک آیا تھا اور ڈاکٹر اکین ڈیلے سے پوچھتا تھا کہ ''ڈاکٹر بھٹّہ

کہاں ہے؟ کمشنر پولیس کی طرف سے ہمیں حکم ملا ہے کہ ڈاکٹر بھٹّہ کو فوری طور پر گرفتار کر کے ملک بدر(Deport) کر دیا جائے۔''ڈاکٹر اکین ڈیلے نے اس سے کہا کہ''ڈاکٹر بھٹّہ اب یہاں نہیں رہتا۔ جہاں وہ رہتا ہے اس کا مجھے علم نہیں۔ایک دو دن میں پتہ کر کے میں ڈاکٹر بھٹّہ کو لے کر خود پولیس سٹیشن آ جاؤں گا۔''اس پر پولیس افسر واپس چلا گیا۔

یہ سن کر مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ دو روز تک تو میں گھر پر ہی چھپا رہا۔ پھر اتوار کی صبح کو میں کلینک چلا گیا اور ڈاکٹر اکین ڈیلے سے پوچھا کہ''کیا معاملہ ہے۔کیا شکایت تھی میرے خلاف۔''

ڈاکٹر اکین ڈیلے نے کہا''پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہے۔کل آ جانا۔چل کر پولیس افسر سے بات کریں گے۔''میں نے پوچھا''کیا شکایت تھی میرے خلاف۔سنا ہے پولیس افسر نے تمہیں کوئی کاغذ بھی دیا ہے۔''پہلے تو وہ ہچکچایا پھر اس نے کہا کہ

''میں دکھا تو دیتا ہوں لیکن کاپی نہیں کرنے دوں گا۔''

میں نے دیکھا تو شکایت کنندہ وہی''اُویا احمد''تھا اور ویسی ہی شکایات تھیں جیسی پہلے خط میں تھیں۔

میں خاموشی سے واپس آ گیا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ کوئی نیا کیس نہیں ہے۔خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک ماہ کی بجائے ایک ہفتہ میں فلیٹ خالی کرنے کا حکم ملا اور یہ حکم بھی خود میرے ہی مفاد میں ثابت ہوا ورنہ اگر میں فلیٹ میں ہوتا تو اس دفعہ تو پولیس مجھے گرفتار کر ہی لیتی،خواہ بعد میں چھوٹ ہی جاتا۔

کلینک سے میں سیدھا مظفر منصور صاحب کے پاس گیا اور ساری بات اُن کو بتائی۔اُنہوں نے کہا کہ کل میری کمپنی کے وکیل کو ساتھ لے کر پولیس افسر سے مل لینا۔دوسرے روز جب میں وکیل کے ساتھ پولیس سٹیشن گیا تو گیٹ پر وکیل نے کچھ سوچ کر مجھے کہا کہ بہتر ہے پہلے میں اکیلا جاؤں۔ چنانچہ میں باہر ٹھہر گیا۔تھوڑی دیر بعد وکیل باہر آیا اور مجھے بتایا کہ''پولیس افسر بہت ناراض ہے۔اچھا ہوا تم ساتھ نہیں اندر گئے۔''کہتا تھا کہ''کمشنر کی طرف سے ہمیں بار بار پوچھا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر بھٹّہ ابھی تک گرفتار کیوں نہیں ہوا۔میں نے کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر بھٹّہ باہر گیا ہوا تھا۔آج آ جائے گا اور کل ہم حاضر ہو جائیں گے۔''

یہ سُن کر مجھے سخت گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے اسی روز شاپنگ کر کے ہفتہ دس دن کا راشن خرید کر گھر میں ڈال دیا۔شام کو میں اپنے دو ایک نائیجیرین دوستوں سے ملنے گیا جو سرکاری افسر تھے۔خیال تھا کہ شاید وہ کچھ مدد کر سکیں۔لیکن کوئی گھر پر نہ ملا۔ واپسی پر رات ہو چکی تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کی۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر باہر نکلا، ہاتھ اُٹھائے اور دعا کرنے لگا۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔رات بھر سوچتا رہا کہ دو ماہ پہلے جب پولیس نے بلایا تھا تو اس وقت میں جماعت کی ملازمت میں تھا۔کلینک کا انچارج تھا۔لیکن اب تو میں بے روزگار اور بے سہارا ہوں۔ پولیس کچھ بھی سلوک کر سکتی ہے۔

اگلے روز مظفر منصور صاحب بھی ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن گئے۔ہم تینوں پولیس افسر کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ جب

وکیل نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر بھٹہ ہے تو پولیس افسر نے مجھ سے کہا ''اگر تم وکیل کے ساتھ نہ آتے تو میں تمہیں حوالات میں بند کر دیتا۔ ہم پر بہت دباؤ ہے تمہیں گرفتار کرنے کا۔ کمشنر بار بار پوچھ رہا ہے۔ اب میں تمہیں ایک دن دیتا ہوں، کل تک تم اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات لے کر حاضر ہو۔''

میں نے اعتماد کے ساتھ اُس کو جواب دیا

''مجھے وقت کی ضرورت نہیں، میں سب کاغذات ساتھ لایا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے پاسپورٹ، ریذیڈنس پرمٹ، ڈگری اور جماعت نائیجیریا کے خط اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اسی طرح نائیجیریا میڈیکل کونسل کے رجسٹریشن اور گزشتہ سولہ سال کا ''سرٹیفکیٹ آف گڈ سٹینڈنگ'' بھی پیش کر دیئے۔ یہ سرٹیفکیٹ میں نے احتیاطاً میڈیکل کونسل سے حاصل کر لیا تھا۔ چند ماہ پہلے جب ایسی ہی شکایت پر مجھے پولیس سٹیشن بلایا گیا تھا تو اس کے بعد مجھے خطرہ تھا کہ شاید پھر بھی ایسی شرارت ہو۔ اب پولیس افسر کا رویّہ بدل گیا۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ ایسا ہی ایک خط ''بومپائی'' پولیس سٹیشن میں بھی چند ماہ پہلے موصول ہوا تھا۔ اور ڈی ایس پی نے تحقیق کی تھی اور اس کو جعلی پایا تھا۔ یہ محض شرارت ہے کسی کی میرے خلاف۔ اس پر پولیس افسر نے یقین دِلایا کہ اگر یہ بات ہے تو فکر کی ضرورت نہیں۔ وہ حکام بالا کو اصل حقائق سے آگاہ کر دے گا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا کہ خدا نے ایک بہت بڑی بلا سر سے ٹال دی تھی۔

چند دن بعد میں پولیس افسر سے پھر ملا تو اس نے بتایا کہ اس نے تحقیق کر کے رپورٹ اُوپر بھیج دی ہے اور پھر اُس نے کہا ''ہے تو یہ خفیہ لیکن میں اس کی ایک نقل تمہیں دے دیتا ہوں۔ اگر پھر کوئی شرارت کرے تو یہ تمہارے کام آئے گی۔'' (رپورٹ کی یہ نقل یہاں جرمنی میں بھی میرے پاس موجود ہے۔)

چند ہفتے بعد وہ پولیس افسر مجھے ایک دن پٹرول سٹیشن پر ملا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر اس نے پوچھا ''تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تمہارے خلاف شرارت کی تھی؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے کہا ''یہ کانو اور لیگوس کے چند تمہارے مخالفین تھے۔ ان میں سے کچھ غیر ملکی بھی ہیں۔''

ملازمت کی اجازت

رہائش اور گاڑی کے فوری مسائل حل ہوئے تو میں نے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ عام طور پر تو یہی خیال تھا کہ پاکستان چلے جائیں لیکن پاکستان میں میرا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ نہ ہی وہاں کے حالات نقل مکانی کی اجازت دیتے تھے۔ لیکن اُدھر نائیجیریا کے حالات بھی سازگار نہ تھے، تاہم ایک دو سال میں یہاں مزید ٹھہرنا چاہتا تھا، منجھلے لڑکے کا ''یابا کالج آف ٹیکنالوجی'' میں آخری سال تھا اور پھر سوچ بچار اور تیاری کے لیے بھی تو وقت درکار تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک دو سال کے لیے یہاں ملازمت کر لی جائے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ بہتری کس بات میں

ہے۔حضور کی خدمت میں ملازمت کی اجازت کی درخواست کروں۔اگر اجازت ملی تو ملازمت کروں گا ورنہ واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے فون پر وکیل التبشیر صاحب سے بات کی اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔مکرم ساقی صاحب مرحوم نے کہا کہ وہ حضور کی خدمت میں آج ہی نوٹ لکھ کر بھجوا دیں گے۔ میں کل اسی وقت پھر فون پر ان سے رابطہ کرلوں۔

دوسرے روز میں نے فون کیا تو وکیل التبشیر صاحب نے بتایا کہ ''حضور نے آپ کو نائیجیریا میں ملازمت کی اجازت مرحمت فرمادی ہے۔ہم امیر صاحب نائیجیریا کو لکھ رہے ہیں کہ وہ آپ کو No objection Certificate جاری کردیں۔'' اس خبر سے مجھے بہت خوشی اور سکون ملا۔صرف اس لیے نہیں کہ ملازمت کی اجازت مل گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ میری اس ملازمت کو تائیدایزدی حاصل ہوگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب اللہ تعالیٰ یہ ملازمت کا مسئلہ بھی جلد حل فرمادے گا۔ خلیفۂ وقت کی اجازت سے ایک ملازمت ۱۹۷۱ء میں چھوڑی تھی اور پھر خلیفۂ وقت کی اجازت سے ہی اب ۱۹۸۸ء میں کسی ملازمت کی تلاش میں تھا۔اس چھوڑنے کو اللہ تعالیٰ نے بابرکت فرمایا تھا اور اب امید تھی کہ اس کے ڈھونڈنے میں بھی وہ بہتری کے سامان پیدا فرمادے گا۔

سرکاری ملازمت کا ہاتھ سے نکلنا

ڈاکٹر نائیڈو سرکاری ہسپتال کانو میں ریڈیالوجسٹ تھے۔ ہماری احمدیہ کلینک کے لیے بھی یہ کام کرتے تھے۔ مجھے احمدیہ کلینک سے الگ ہوئے دو تین دن ہی ہوئے تھے اور میں اُوپر فلیٹ میں سامان باندھ رہا تھا کہ رات کو ڈاکٹر نائیڈو صاحب کا بیٹا آیا اور ایک پیکٹ دے کر کہنے لگا۔

''پتاجی نے بھیجا ہے، کہتے تھے کہ اس میں آپ کے لیے خوشی کی خبر ہے۔''

میں نے پیکٹ کھول کر دیکھا تو ایک مقامی اخبار تھا جس کے اندر پورے صفحہ پر پھیلا کٹسینا (Katsina) سٹیٹ گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹروں کی بھرتی کے لیے اشتہار تھا۔اس وقت کی صورتحال کے پیش نظر مجھے اس اخبار سے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔کسی ملازمت کا تو خیال تک نہ تھا۔تاہم میں نے وہ اخبار سنبھال لیا تھا۔

اب جبکہ رہائش، گاڑی اور دیگر مسائل حل ہو چکے تھے اور حضور کی طرف سے ملازمت کی اجازت بھی مل چکی تھی تو میں نے وہ اخبار نکالا اور میڈیکل کی ایک اعلیٰ پوسٹ کے لیے درخواست دے دی۔اور پھر درخواست کی پیروی کے لیے میں کٹسینا کے چکر لگانے لگا۔ یہ کانو سے کوئی ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ریگستانی علاقہ تھا،ٹوٹی پھوٹی، ناہموار سڑک تھی، موسم گرم تھا۔صبح جاتا شام کو دیر سے واپس آتا۔ ہفتہ دس دن بعد مجھے انٹرویو کے لیے بلالیا گیا۔ایک سیکشن افسر نے میری اچھی مدد کی۔ دو دن بعد گیا تو اس نے بتایا کہ تمہیں سلیکٹ کرلیا گیا ہے۔ پھر دو دن بعد گیا تو اس نے کہا کہ تقرری کا خط ٹائپ ہوگیا ہے۔کل آکر وصول کرلینا۔صرف چیئرمین کے دستخط ہونے باقی ہیں۔ میں بہت خوش تھا کہ بالآخر دو تین ہفتہ کی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ملازمت مل

گئی تھی۔ خط تو میں کسی وقت بھی وصول کر سکتا تھا۔ دو دن بعد عید الضحیٰ تھی۔ قربانی کے لیے بکرا بھی خریدنا تھا۔ اور پھر چکر لگا لگا کر تھک بھی بہت گیا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ عید کے بعد جا کر خط وصول کر لوں گا۔

محمد حنیف صاحب انہی اساتذہ میں سے تھے جو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اجی بواوڈے اور اس کے گرد و نواح میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اُن سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ اب کٹسینا میں پولی ٹیکنیک میں استاد تھے۔ ملازمت کی اس بھاگ دوڑ میں انہوں نے میری بہت مدد کی۔ دفاتر میں لیے پھرتے رہے۔ عمومی راہنمائی کرتے رہے اور پھر دوپہر کو میں ان کے ہاں کھانا بھی کھاتا اور آرام بھی کرتا۔ انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ''جہاں اتنی تگ و دَو کی ہے ایک چکر اور لگا لیں اور آ کر خط وصول کر لیں۔ بات بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ عید کی تیاری تو ایک دن میں بھی ہو سکتی ہے۔'' لیکن میں نے اُن کی بات نہ مانی اور یہی کہتا رہا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ عید کے بعد آ کر خط وصول کر لوں گا۔

میں عید کے دوسرے روز ہی کٹسینا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سیکشن افسر مجھے دیکھتے ہی دفتر سے باہر کہیں چلا گیا اور پھر شام تک واپس نہ آیا۔ اگلے روز گیا تو وہ شام کو ملا اور ٹال مٹول کرنے لگا کہ ابھی تک دستخط نہیں ہوئے، پھر آنا۔ حنیف صاحب نے بتایا کہ غیر احمدی پاکستانی ڈاکٹرز کو علم ہو گیا تھا اور عید کی چھٹیوں کے دوران انہوں نے اپنا کام دکھا دیا ہے۔ پھر چند دن بعد مجھے انٹرویو کے لیے دوبارہ بلایا گیا اور فیل قرار دے کر میری درخواست ردّ کر دی گئی۔ ملازمت میرے ہاتھ میں آ کر نکل گئی تھی۔

سرکاری ملازمت کا نعم البدل

جس اخبار میں کٹسینا (Katsina) سٹیٹ گورنمنٹ کا اشتہار تھا اسی میں ایک کونے میں ایک بہت چھوٹا سا اشتہار ایک کانو کی کمپنی کی طرف سے بھی تھا کہ ان کو ایک میڈیکل ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے اُن کو بھی ایک مختصر سا خط لکھ دیا تھا۔ نیچے اپنے نام کے ساتھ ''بھٹہ'' نہیں لکھا تھا۔ اور پتہ بھی ڈاکٹر نائیڈو کی معرفت لکھا تھا تا کہ میری شناخت ذرا راز میں رہے۔ پھر میں کٹسینا کے چکروں میں ایسا کھویا کہ اس درخواست کو یکسر بھول ہی گیا تھا۔ میری ساری توجہ، تگ و دَو اور خواہش کا مرکز تو کٹسینا کی جاب کا حصول تھا۔ اور یہ جاب میرے ہاتھ میں آ کر نکل چکی تھی۔ تقریباً ایک ماہ تک میں نے گرد و گرمی میں بھاگ دوڑ کی تھی اور اب میں گھر میں تھکا ہارا اور مایوس بیٹھا پچھتا رہا تھا کہ میں نے عید سے پہلے کیوں نہ خط وصول کر لیا۔

اسی پریشانی میں گُم سُم بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر نائیڈو کا بیٹا آیا اور ایک خط دے گیا۔ وہ کمپنی کا خط تھا جس میں مجھے چند دن بعد انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ اگر یہ خط عید سے پہلے ملتا تو شاید میں کٹسینا کی جاب کے شوق میں کمپنی کے انٹرویو پر جاتا ہی نہ۔ لیکن اب مایوسی کے عالم میں ملا تو غنیمت جانا، انٹرویو پر تین چار ڈاکٹر اور بھی تھے۔ کمپنی کے دفاتر دُور نہ تھے۔ میں گھومتا، شاپنگ کرتا سیکرٹری سے پتہ کرتا رہتا۔ تین روز بعد اُس نے بتایا کہ اس کا خیال ہے فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ پھر دو روز بعد مجھے بلایا گیا۔ شرائط پر بات ہوئی اور تقرری کا خط مجھے مل گیا۔ اچھا معقول معاوضہ تھا۔ رہائش اور گاڑی مع ڈرائیور تھی اور چھٹی

وغیرہ بھی درج تھی۔

میں نے کمپنی کے ہسپتال میں کام شروع کر دیا۔ دو ہفتہ بعد مجھے پروفیسر منیر رشید صاحب کی گاڑی واپس کرنی تھی۔ میں روزانہ ہی کمپنی سے گاڑی کا مطالبہ کرتا لیکن وہ یہی کہہ دیتے کہ ''انتظام کر رہے ہیں، ورکشاپ میں ہے ابھی واپس نہیں آئی۔'' جس روز میں نے پروفیسر صاحب کی گاڑی واپس کرنی تھی اس سے ایک روز پہلے مغرب کے وقت ڈرائیور گاڑی لے کر آ گیا۔ میں نے تو متبادل کے طور پر ایک ٹیکسی کا بندوبست بھی کر لیا تھا لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ غیر متوقع طور پر کمپنی کی گاڑی اور ڈرائیور کا ایک رات پہلے آ جانا بہت ایمان افروز تھا۔

اسی طرح رہائش کے لیے بھی مجھے دو تین ماہ انتظار کرنا پڑا۔ کمپنی نے کہہ دیا تھا کہ تم اپنی مرضی کی رہائش تلاش کر لو ہم کرایہ وغیرہ ادا کر دیں گے۔ لیکن مجھے کوئی معقول رہائش مل نہ رہی تھی۔ بالآخر انہوں نے اپنا گیسٹ ہاؤس مجھے رہائش کے لیے دے دیا۔ یہ فرنشڈ، ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ تھا۔ جس میں تین بیڈ رومز تھے اور بڑا سا ڈرائینگ روم، سٹور، کچن وغیرہ تھے۔ ساتھ باغیچہ مع مالی اور نوکر، گیٹ کیپر تھے۔

اس طرح میں پھر ایک دفعہ آباد و شاداب ہو گیا تھا جو خدا تعالیٰ نے دیا وہ میری اُمیدوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ کٹسینا کی نوکری کا تو اس نعمت خداوندی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وہ تو دُور دراز ریگستانی علاقہ تھا اور سرکاری رہائشوں کی خستہ حالی کا مجھے اندازہ تھا۔ بھلا ہو اُن کٹسینا کے غیر احمدی ڈاکٹروں کا کہ اُن کی مخالفت میرے لیے بادِ مخالف ثابت ہوئی اور مجھے کانو میں ہی خدا تعالیٰ کے فضل سے اس سے کہیں بہتر ملازمت میسر آ گئی۔

کمپنی کا یہ ہسپتال چھوٹا سا تھا۔ کام زیادہ نہ تھا۔ فارغ وقت میں مطالعہ اور تلاوت میں گزارنے لگا تھا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہوا کہ یہ ہسپتال عرصہ سے بند پڑا تھا۔ اس کو چلانے کی پہلی کوششیں ناکام رہی تھیں اور اب کمپنی نے پھر ایک دفعہ، آخری دفعہ اس کو چلانے کا فیصلہ کیا۔ اور کمپنی نے یہ فیصلہ اُن ہی دنوں میں کیا جن دنوں میں احمدیہ کلینک سے الگ ہوا تھا۔ مجھے ڈاکٹر نائیڈو کا وہ پیغام یاد آتا جو اس نے اپنے بیٹے کے ذریعہ بھجوایا تھا کہ ''اس اخبار میں آپ کے لیے خوشی کی خبر ہے۔'' وہ کون سی خبر ہے، یقیناً اس کو بھی علم نہ ہوگا۔ اخبار کے پورے صفحہ پر جلی حروف میں چھپے ڈاکٹروں کی مختلف اسامیوں کے لیے اشتہار کے ہوتے ہوئے اگلے صفحہ پر کمپنی کے صرف دو سطری چھوٹے سے اشتہار کا نظر میں آ جانا محض اتفاق نہ تھا۔

کانو سٹیٹ گورنمنٹ کی ملازمت

کمپنی کے ہسپتال میں چند ماہ ہی کام کیا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ہسپتال زیادہ دیر چلے گا نہیں۔ کمپنی کا یہ آخری تجربہ بھی ان کے حسبِ منشاء نہ تھا۔ حالانکہ انہوں نے ایک گائنا کالوجسٹ بھی ملازم رکھ لیا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ یقین ہو گیا

تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہسپتال کھلایا ہی مجھے سال بھر کے لیے سہارا دینے کے لیے تھا تا کہ میں اس دوران اپنے مستقبل کے لیے کچھ سوچ سکوں۔ چنانچہ انہی دنوں اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرما دیئے کہ دونوں بڑے لڑکے جرمنی منتقل ہو گئے۔ اور اب مجھے باہر نکالنے کے لیے اس ہسپتال کا بند ہونا ایسے ہی ضروری تھا جیسے میرا احمد یہ کلینک سے الگ ہونا۔ ورنہ میں کب ہلنے والا تھا وہاں سے۔

پورے نو ماہ بعد کمپنی نے وہ ہسپتال بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم انہوں نے مجھے اپنے بنگلہ میں مزید تین ماہ تک ٹھہرنے کی اجازت دی اور کسی نئی ملازمت کی تلاش میں میری ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی۔ ان تین ماہ میں مَیں نے کانو میں ہی سٹیٹ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کر لی۔ پرنسپل میڈیکل افسر کی جاب تھی جو دوسری سب سے بڑی جاب تھی۔ تاہم مجھے نظر آ رہا تھا کہ اب زیادہ دیر نائیجیریا میں ٹھہرا نہیں جا سکتا۔ ملک کے عمومی حالات غیر ملکیوں کے لیے سازگار نہ تھے۔ جو غیر ملکی ڈاکٹر پہلے سے کام کر رہے تھے ان کو اپنے کنٹریکٹ کی تجدید میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ سرکاری ملازمت ملتے ہی میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی تھی۔

لوڈ شیڈنگ

کمپنی کے اس بنگلہ میں رہتے ہوئے میں نے سوچا کہ مجھے ابھی سے سامان ہلکا کر کے یہاں سے نقل مکانی کی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ مجھے نائیجیریا میں رہتے ہوئے تقریباً بیس سال ہونے کو آئے تھے۔ اس عرصہ میں تھوڑا تھوڑا بھی بنائیں تو گھر کا خاصہ سامان بن جاتا ہے۔ اور پھر ہم تو اس خیال سے بھی بناتے رہے کہ جب پاکستان جائیں گے تو ساتھ لے جائیں گے۔ نوکر چاکر اور اوس پڑوس میں بات کی تو دو ایک اشیاء بک سکیں باقی سامان تو ویسے ہی پڑا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ لوڈ شیڈنگ کیسے ہو۔

۱۹۷۱ء میں کندیاں سے نائیجیریا روانہ ہوتے وقت بھی ایسی ہی لوڈ شیڈنگ کی تھی۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے غائب سے سامان پیدا فرما دیئے تھے۔ اور اب بھی اسی نے مشکل آسان فرمائی۔

ایک دن ملازمہ آئی اور کہنے لگی کہ اس نے ایک انجینئر سے بات کی ہے۔ وہ شام کو سامان دیکھنے آئے گا۔ چنانچہ وہ آیا، سامان دیکھا، دیواروں پر لگی قدرتی مناظر کی بڑی چھوٹی پینٹنگز بھی دیکھیں۔ اور پھر اس نے سب سامان کا سودا کیا اور چیک دے کر چلا گیا۔ پھر وہ گاڑی لایا اور وین پر سب سامان لاد کر لے گیا۔ ہم ہلکے پھلکے ہو گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ہم کمپنی کے بنگلہ کو خالی کر کے سرکاری رہائش میں آسانی سے منتقل ہو سکیں گے اور پھر جب ملک کو خیر آباد کہنے کا مرحلہ آئے گا تو فائنل تیاری میں بھی دقت نہ ہو گی۔

سرکاری رہائش کا حصول-ایک مشکل مرحلہ

کانو سٹیٹ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد میں سرکاری رہائش کے لیے متعلقہ حکام سے ملنے لگا۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ان کے پاس ڈاکٹروں کی رہائش گاہوں کی لسٹ تھی۔وہ میں نے دیکھی اور خود بھی جا کر وہ بنگلے دیکھے جو خالی تھے۔لیکن وہ مجھے دے نہیں رہے تھے۔پھر میں نے دیکھا کہ میرے بعد جو ڈاکٹر آئے ہیں وہ ان بنگلوں میں رہنے لگے ہیں۔ میں اگر زیادہ زور دیتا تو وہ مجھے کسی مکان کا پتہ دے دیتے کہ وہ دیکھ لیں۔ میں دیکھتا تو وہ باہر ویرانے میں کوئی الگ تھلگ خستہ مکان ہوتا جس کی کھلی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹے ہوتے۔کوئی کنڈی تالا نہ ہوتا۔ایسے جیسے بھوت پریت کی آماجگاہ ہو۔میں حیران تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں میرے ساتھ۔یہ تو بعد میں کھلا کہ وہاں تو رشوت کا بازار گرم ہے۔ میں سخت پریشان تھا کہ مجھے تو تین ماہ میں کمپنی کا بنگلہ خالی کرنا ہے اور تقریباً دو ماہ گزر چکے ہیں لیکن یہاں تو رہائش کی کوئی صورت بن ہی نہ رہی تھی۔

کانو میں پاکستانی کمیونٹی اچھی بڑی تھی۔بعض دوست بطور انجینئر کام کرتے تھے۔ایک پاکستانی انجینئر حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔بہت صدمہ ہوا۔ہم ان کے ہاں تعزیت کے لیے جاتے رہے۔پھر اُن کی فیملی پاکستان منتقل ہو گئی۔

دو چار ہفتہ بعد چودھری بشیر احمد صاحب نے جو احمدیہ سکول میں ٹیچر تھے، مجھ سے کہا کہ آپ رہائش کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔اس فلیٹ کے لیے کیوں کوشش نہیں کرتے جو اس مرحوم انجینئر کی فیملی کے جانے کے بعد خالی ہوا ہے۔میں نے کہا کہ وہ تو انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہے۔میڈیکل سٹاف کے لیے تو الگ ہیں۔اس پر چودھری صاحب نے بتایا کہ اگر انجینئرنگ والوں کے پاس مکان خالی ہو تو وہ ڈاکٹر کو بھی دے سکتے ہیں۔پھر انہوں نے ایک اور پاکستانی انجینئر کا نام لے کر کہا کہ ان سے مل کر بات کریں شاید بات بن جائے۔

میں نے ان پاکستانی انجینئر صاحب سے بات کی تو وہ مجھے متعلقہ افسران کے پاس لے گئے۔وہ اچھی طرح پیش آئے۔ میں دو تین مرتبہ گیا اور اچھا امید افزا جواب ملتا رہا۔پھر وہ انجینئر صاحب چھٹی پر پاکستان چلے گئے بعد میں مَیں مکان کے سلسلے میں متعلقہ افسر سے جب ملا تو اس نے کہا کہ اور تو سب ٹھیک ہے۔اب آپ بڑے افسر سے مل لیں۔چنانچہ جب میں بڑے افسر سے ملا تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ملاقات کے بعد جب میں نچلے افسر سے ملا اور بتایا کہ مکان کے بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی تو وہ خاموش ہو گیا۔میں بھی خاموشی سے واپس آ گیا۔مجھے پتہ چل گیا تھا کہ رشوت مانگی جا رہی ہے۔پھر میں نے اُدھر جانا چھوڑ دیا۔اسی طرح وقت گزرتا گیا اور مکان کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

عدالت کا نوٹس اور نصرتِ الٰہی

کمپنی کے بنگلہ کو خالی کرنے کے لیے جو تین ماہ دیئے گئے تھے وہ گزر چکے تھے۔کمپنی مجھے کئی بار یاد دہانی کرا چکی تھی۔ ادھر سرکاری رہائش کی کوئی صورت بن نہ رہی تھی۔پھر ایک روز ایک شخص گیٹ پر آیا۔مجھے بلایا اور وصولی کے دستخط کروا کر ایک خط

میرے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا۔ وہ عدالت کی طرف سے نوٹس تھا کہ چھ دن کے اندر اندر یہ رہائش خالی کر دو ورنہ......

میں صدمہ سے نڈھال اندر جا کر خاموش لیٹ گیا۔ یہاں تو چھ ماہ میں کوئی مکان نہ مل سکا تھا۔ چھ دن میں کہاں جاتا۔ رات بھر دعاؤں اور سوچوں میں غرق رہا کہ اب کیا ہوگا۔ اہلیہ کو میں نے کچھ نہ بتایا۔ اگلے روز میں ہسپتال کے کام سے فارغ ہوکر حسبِ معمول ڈاکخانہ گیا تو وہاں مجھے وہ انجینئر صاحب مل گئے جو چھٹی سے واپس آ گئے تھے۔ میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا کب آئے۔ کیسی رہی چھٹی اور پھر میں نے کہا کہ وہ فلیٹ تو مجھے نہ مل سکا۔ انہوں نے کہا:

''میں نے آتے ہی پتہ کیا تھا۔ میں نے اُن سے بات کر لی ہے۔ آپ صبح جا کر چابیاں لے لیں۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''کیا واقعی؟'' انہوں نے کہا کہ ''افسران کو غلطی کا احساس ہو گیا تھا، بعد میں آپ اُدھر گئے نہیں۔ اب آپ صبح جا کر چابیاں لے لیں۔'' چنانچہ اگلے روز صبح میں نے چابیاں لیں۔ اُن کا شکریہ ادا کیا اور پھر فلیٹ کو جا کر دیکھا۔ ضرورت کا فرنیچر موجود تھا۔ البتہ صفائی دھلائی کی ضرورت بہت تھی۔ پھر میں ہسپتال اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

بیٹی کی اچانک آمد

شام کو میں واپس گھر آیا تو اہلیہ کو بتایا کہ مکان کا بندوبست ہوگیا ہے۔ تم اب تیاری شروع کر دو۔ میں خود بھی اپنی کتابوں کو پیک کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں سوچ رہا تھا کہ ایک دو روز تو مکان کی صفائی میں ہی گزر جائیں گے۔ وہ فلیٹ شہر سے باہر نئی کالونی شراڈا میں تھا جو کئی میل دُور تھی۔ ہسپتال کے کام سے فارغ ہوکر اگر میں دو تین چکر اپنی چھوٹی سی گاڑی میں لگاؤں تو بھی بقیہ تین دن میں اُدھر منتقل ہونا میرے لیے مشکل تھا۔ دوسری منزل پر سامان چڑھانا الگ مسئلہ تھا۔

دوسرے روز میں ہسپتال میں تھا کہ کسی نے بتایا کہ چیف میڈیکل افسر کے دفتر میں میرے لیے ایک فون کال ہے۔ میں گیا تو جرمنی سے بیٹی بول رہی تھی ''ہمارا پروگرام تو پاکستان جانے کا تھا۔ تیاری کر لی تھی، پھر اچانک ہم نے کانو آنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ ہم کل شام Egypt ایئر لائنز سے کانو پہنچ رہے ہیں۔''

اس خبر نے جذبات میں ہلچل سی مچادی تھی۔ چھ سال پہلے بیٹی کو لیگوس سے رخصت کیا تھا۔ پھر ۱۹۸۶ء میں چار دفعہ جرمنی کے ویزہ کی کوشش کی تھی لیکن نہ ملا تھا۔ اس وقت ظفر نے کہا تھا کہ آپ پیرس میں ٹھہریں ہم آپ کو کار کے ذریعہ لے آتے ہیں لیکن میں نے کہا تھا کہ نہیں، اس طرح نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا ملاقات کرا دے گا۔ اور اب اللہ تعالیٰ یہ ملاقات کرا رہا تھا۔ اہلیہ کو بتایا تو وہ تو جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکی تھی۔ دوسرے روز وہ آ گئے۔ بہت دیر تک رات باتیں کرتے رہے۔ اُن کا آنا ہمارے لیے باعث مسرت تو تھا ہی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا اچانک ورود نصرتِ الٰہی کا نزول تھا جس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔

فیملی میٹنگ

دوسرے روز ہسپتال سے فارغ ہو کر میں سیدھا کمپنی کے ڈائریکٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میری بیٹی اور داماد چھ سال بعد آئے ہیں۔ تم نے چھ دن گھر خالی کرنے کے لیے دیئے تھے جس میں سے تین تو گزر چکے ہیں۔ مجھے دو تین ہفتے مزید دے دو تاکہ ہم چند دن بیٹی کے ساتھ سکون سے گزار سکیں اور پھر آہستہ آہستہ نئے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ لیکن ڈائریکٹر نے معذرت کی کہ چیئرمین پہلے ہی ناراض ہے کہ میں نے تمہیں بہت ڈھیل دی ہے۔ اب مزید کوئی گنجائش نہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ آگے جو ویک اینڈ آ رہا ہے۔ مجھے یہ ویک اینڈ تو دے دو۔ میں بنگلے کی چابیاں جمعہ کی بجائے سوموار کو تمہیں دے دوں گا۔ چنانچہ اس پر وہ مان گیا۔

رات نماز عشاء کے بعد میں نے سب کو بلایا اور میٹنگ کی۔ بیٹی سے کہا کہ ''تم لوگ آئے نہیں، بھیجے گئے ہو، عین انہی دنوں مجھے تمہاری سخت ضرورت تھی۔'' پھر میں نے عدالت کے نوٹس کا بتایا اور کہا کہ اب ہمارے پاس نئے گھر میں شفٹ ہونے کے لیے چند دن ہیں۔ اگلے دو دن میں ہم اُدھر صفائی کریں گے اور پھر تین دن میں سامان لے جائیں گے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم نے ہفتہ کے روز تک بنگلہ خالی کر دیا۔ اتوار کو ہم نے بنگلہ کی اچھی طرح صفائی کی اور سوموار کو میں نے بنگلے کی چابیاں، شکریہ کے ساتھ ڈائریکٹر کو واپس کر دیں۔ اس بحران سے اللہ تعالیٰ نے عجب اعجازی رنگ میں نکالا تھا اور میری مدد کے لیے غائب سے سامان پیدا فرمائے تھے۔ اور پھر اس ایک بحران پر ہی کیا موقوف۔ اس خاردار اور دشوار گزار بیابانِ حیات میں ہر مشکل مرحلے اور نازک موڑ پر اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی ہے اور اپنی حفظ و امان میں رکھا ہے۔ **فالحمد للّٰہ علی ذالک**

گھر میں سیٹ لیکن مُلک میں اَپ سیٹ

بیٹی اور ظفر تین ہفتہ ہمارے پاس ٹھہرے۔ اس دوران انہوں نے نئے گھر کو سیٹ کرنے اور سنوارنے سجانے میں ہماری مدد کی۔ ماں بیٹی نے مل کر پردوں کے لیے کپڑا خریدا اور سلائی کی۔ گدیوں پر نئے غلاف چڑھائے اور ساتھ ساتھ وہ ہمیں ہجرت کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب ہمیں نائیجیریا میں مزید نہیں رہنا چاہیے۔ اکثر لوگ جا بھی چکے تھے۔ اسائلم کے قوانین کے بارے میں مجھے پورا علم نہ تھا۔ دل میں کچھ خوف تھا اور شرح صدر نہ ہوتا تھا۔ وہ وضاحت کر کے میری اُلجھنیں دُور کرتے رہے اور بالآخر مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ گھر میں سیٹ کرتے کرتے مُلک سے انہوں نے اَپ سیٹ کر دیا تھا۔

میں سمجھا تھا کہ وہ ''نقل مکانی'' میں میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہیں لیکن ان کا آنا اس سے کہیں زیادہ بابرکت اور تائید ایزدی کا حامل نکلا۔ ان کے حوصلے، مشورے نے مجھے ''نقل مُلکی'' ہی نہیں ''نقل براعظمی'' پر آمادہ کر دیا تھا۔ اگر وہ نہ آتے تو شاید میں اپنے مستقبل کے بارہ میں وہ فیصلہ نہ کر پاتا جو میں نے کیا۔ وہ واپس جرمنی روانہ ہوئے تو میں نے اپنی کتابوں کا کارٹن اُن کے ساتھ کر دیا اور وہ اس کو کارگو کے ذریعہ بک کرا کر لے گئے۔ میں نے بعد میں ان کو لکھا ''جہاں میری کتابیں ہیں سمجھو میں

روحانی طور پر وہیں ہوں۔اور مجھے اُمید ہے اللہ تعالیٰ جسمانی طور پر بھی مجھے وہاں پہنچا دے گا۔''

روانگی کی تیاری۔''ایں خیال است ومحال است وجنوں''

بیٹی اور ظفر کے واپس جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہاں سے نکلا جائے تو کیسے اور کب۔میرا کنٹریکٹ ایک سال کا تھا اور تقریباً چار ماہ باقی تھے۔یہ کوئی بڑا عرصہ نہ تھا اور کنٹریکٹ کے خاتمے پر میں بآسانی نکل سکتا تھا۔اتفاق سے اُن دنوں لندن میں بنک سے میرا تنازعہ چل رہا تھا۔اچھی گرما گرم خط وکتابت ہوتی رہی تھی۔اس سلسلہ میں لندن جانے کے لیے میں نے دس دن کی ہنگامی چھٹی لے لی اور بُکنگ بھی کرالی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ لندن سے واپس آکر ساڑھے تین ماہ بعد میں پھر اپنی سالانہ چھٹی پر جاؤں گا۔اگر کسی طرح میری یہ ہنگامی چھٹی میری سالانہ چھٹی میں بدل جائے تو ایک ہی چکر میں سب کام ہو جائیں گے۔لیکن اُن حالات میں ایسا سوچنا ''خیال است ومحال است وجنوں'' تھا۔جو ڈاکٹر اپنا کنٹریکٹ پورا کر کے چھٹی اور اپنی واجبات لینا چاہتے تھے وہ خجل خراب ہو رہے تھے۔روزانہ رشوت کے خلاف اُن کے شکوے شکایات سنتا تھا۔نہ جانے ایسا انہونا سا خیال میرے دل میں کیسے آگیا۔

پرسنل برانچ میں ایک بڑی عمر کا سیکشن افسر میرا بڑا لحاظ کرتا تھا۔شاید اس لیے کہ میں اس کا ہم عمر تھا۔میں کبھی کبھی اس کے پاس جا کر اپنے مسائل ڈسکس کر لیتا تھا۔میں اس کے پاس گیا اور اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔اس نے پوچھا تمہارا کنٹریکٹ کتنا پورا ہوا ہے۔میں نے بتایا کہ ایک سال کا تھا اور آٹھ ماہ سے کچھ دن اُوپر ہو چکے ہیں۔اس نے کہا''ایک پرانا انگریز کے زمانے کا قانون ہے تو سہی کہ اگر کوئی افسر اپنی دو تہائی کنٹریکٹ پورا کر لے تو استثنائی حالات میں اس کا کنٹریکٹ چھوٹا کر کے اس کو چھٹی اور واجبات دیئے جا سکتے ہیں۔لیکن اس قانون کا نہ تو کسی کو علم ہے نہ ہی کبھی اس پر عمل ہوا ہے۔''

میں نے اس سے کہا کہ میری ہنگامی چھٹی منظور ہو چکی ہے۔میں اگر درخواست دوں کہ اس کو استثنائی حالات کے پیشِ نظر سالانہ چھٹی میں بدل دیا جائے تو کیا تم سفارش کرو گے۔اس نے یقین دلایا کہ''جب مجھ سے پوچھا جائے گا تو میں کہہ دوں گا کہ ایسا ممکن ہے۔''

غیر ممکن کا ممکن ہو جانا

میں نے گھر جا کر ایک درخواست ڈرافٹ کی جس میں چار ٹھوس وجوہات بیان کر کے درخواست کی کہ میری اس ہنگامی دس دن کی چھٹی کو کنٹریکٹ کے خاتمے کی چھٹی میں بدل دیا جائے اس سے میرے ہنگامی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور سرکار کی بھی بھلائی ہوگی۔

میں درخواست لے کر چیف میڈیکل افسر کے دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ چھٹی پر ہے اور اس کی جگہ پی ایم او(P.M.O) کام کر رہا ہے۔یہ ایک بہت امید افزا خبر تھی کیونکہ چیف بہت سخت آدمی تھا۔میں جب بھی اس سے ملا بے رُخی سے پیش آیا۔مجھے

اس کی طرف سے خیر کی امید نہ تھی۔اس کے برعکس پی۔ایم۔او ایک شریف النفس نوجوان ڈاکٹر تھا جس سے میں واقف تھا۔میں نے پی۔ایم۔او سے مل کر اپنی درخواست پیش کی۔ پڑھتے ہی وہ ہنس پڑا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے درخواست میری طرف بڑھا دی اور بولا''نہیں نہیں ڈاکٹر!ایسا نہیں ہوسکتا۔پرسنل برانچ کبھی اس کو منظور نہ کرے گی۔''

''آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں''میں نے اس سے پوچھا اور پھر دوبارہ اپنی درخواست اس کو دیتے ہوئے کہا:

''آپ پوچھ لیں پرسنل برانچ سے،اگر وہ ردّ کر دیں تو ٹھیک ہے،نہ سہی''

میرے دو تین دفعہ کہنے پر اس نے بادلِ نخواستہ درخواست رکھ لی۔ میں نے آتے ہوئے اس سے کہا کہ''اگر پرسنل برانچ نے منظوری دے دی تو امید ہے تم میری مدد کرو گے۔''اس نے پورا یقین دِلایا کہ وہ مدد کرے گا۔دوسرے دن میں گیا۔تو اس نے کہا کہ پرسنل برانچ نے تو ہاں کر دی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ چیئرمین منظور نہ کرے گا۔ میں نے کہا کہ یہ اب تمہارا کام ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔اس نے کہا کہ''میں پرسنل برانچ کے انچارج افسر سے بات کروں گا تا کہ ہم دونوں چیئرمین سے ملیں۔اس سے منظوری لینا بہت مشکل کام ہوگا۔''چنانچہ پی۔ایم۔او نے سینئر پرسنل افسر سے مل کر میرے لیے اس کی ہمدردی حاصل کی اور پھر اگلے روز وہ دونوں چیئرمین سے ملنے گئے۔میں دم سادھے دعاؤں میں مصروف کچھ فاصلے پر بنچ پر جا بیٹھا۔جب وہ جلدی باہر نہ نکلے تو میں اس کو اچھا شگون سمجھا کہ کہتے ہیں''دیر آید درست آید''تاہم حالتِ دل کے لیے یہ دیر تو کچھ درست نہ آید۔

کوئی پون گھنٹہ بعد وہ دونوں چیئرمین کے دفتر سے باہر نکلے۔پی۔ایم۔او نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر ماتھے سے انگوٹھے کے ساتھ پسینہ پونچھنے کا اشارہ کر کے بتایا کہ کیسی سخت محنت کرنی پڑی ہے ہمیں چیئرمین سے منظوری لینے کے لیے۔ عجب تصرف الٰہی ہوا کہ پہلے چیف میڈیکل افسر کو چھٹی پر بھیج دیا اور پھر ان دونوں افسران کو میری حمایت پر آمادہ کر دیا۔سنا تھا کہ بعد میں چیف جب آیا تو بہت بگڑا اور بولا تھا کہ ایسا ہو کیسے گیا،اور پھر مفت میں۔

ایک اور مشکل آسان-اللہ کا احسان

چیئرمین کی منظوری کے بعد میں نے آئندہ چند روز میں بھاگ دَوڑ کر کے دفتری کاروائی مکمل کروا لی اور اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے اپنے واجبات وصول کر لیے۔اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔میں آسانی اور اعتماد کے ساتھ نقل مکانی کی تیاری کر سکتا تھا۔گو میں نے اس کو بدستور پردۂ راز میں رکھا صرف مکرم شاہد احمد قریشی صاحب میرے راز دان تھے اور ان سے ہی میں مشورہ کرتا۔انہوں نے میری گاڑی کی فروخت میں بھی مدد کی تھی۔ مجھے ایسے گاہک کی ضرورت تھی جو قیمت تو پہلے ادا کر دے اور گاڑی روانگی تک میرے پاس رہنے دے۔

میں نے KLM سے اپنی ایمسٹرڈم کی بکنگ اب تین ہفتہ آگے کروالی کیونکہ اب کوئی جلدی نہ تھی اور مجھے مکمل تیاری

کے لیے وقت درکار تھا۔ اسی تیاری کے دَوران ایک روز اہلیہ نے کہا ''اس طرح بائی روڈ جرمنی جانے کو دل نہیں کرتا۔ آپ ویزہ کی کوشش کر کے تو دیکھیں۔ اگر انکار کر دیں گے تو نہ سہی، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

پہلے تو میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ کوشش وہاں کی جاتی ہے جہاں کچھ اُمید ہو۔ ۱۹۸۶ء میں چار مرتبہ جرمنی کے ویزہ کی کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اب تو ان کے کمپیوٹروں پر میرا نام چڑھا ہوگا اور پھر اب تو پروگرام بھی سارا طے پا چکا ہے لیکن میں اہلیہ کی بات سن کر خاموش رہا اور سوچنے لگا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک لبنانی بزنس مین کے الفاظ اُبھرے جو اس نے ڈیڑھ ماہ قبل کاڈونا میں برٹش ایمبسی کے ویٹنگ ہال میں کہے تھے۔ ویزہ کے انتظار میں ہمیں دوپہر کے دو بج گئے تو وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا تھا اور غصہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا

''سارا دن ضائع کر دیا ہے۔ Egypt ائیرویز والے ویزہ لگوا کر دے سکتے تھے لیکن وہ معاوضہ بہت مانگتے تھے......''

جونہی یہ الفاظ یاد آئے میں اُٹھا، گاڑی نکالی اور لگا Egypt ائیرویز کو تلاش کرنے۔ شام چار بجے میں ان کے دفتر پہنچا اور ان سے کہا کہ جرمن کونصلیٹ ''کاڈونا'' میں بند ہو گیا ہے۔ لیگوس بہت دور ہے۔ کیا آپ جرمن ویزہ کے حصول میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ کر تو سکتے ہیں اگر کاغذات پورے ہوں تو۔ میں نے پوچھا کیا کاغذات درکار ہوں گے۔ اس نے کہا:

''پاسپورٹ اور ریذیڈنس پرمٹ، ملازمت اور چھٹّی کا ثبوت اور جرمنی سے آمدہ بیٹی کے ایک دو خطوط''

دوسرے روز میں نے یہ کاغذات اور پاسپورٹ اس کو دے دیئے۔ اس نے اچھی طرح دیکھ کر تسلّی کی اور مجھے چار دن بعد آنے کا کہا۔ معاوضہ کے بارہ میں اس نے بتایا کہ ذرا زیادہ ہوگا کیونکہ کانو سے لیگوس آنے جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور لیگوس میں ہوٹل کا قیام اس میں شامل ہے۔

یہ چار دن میں نے بہت اضطراب میں گزارے۔ ماضی کے مایوس کُن تجربے کے پس منظر میں جرمنی کے ویزہ کا حصول ایک انہونی سی بات لگتی تھی۔ اسی لیگوس ایمبسی نے چار سال پہلے انکار کیا تھا۔ پھر اسلام آباد، کراچی اور لندن سے انکار ہوا تھا۔ کاغذات تو اس وقت بھی پورے تھے۔ بلکہ سپانسر کی فیکس بھی تھی اور واپسی کے ٹکٹ بھی۔ اہلیہ کو میں نے اس اضطراب میں شامل نہ کیا۔ صرف اتنا بتا دیا تھا کہ کوشش کر رہا ہوں تمہارے کہنے کے مطابق۔ اب تم دعا کرتی رہو۔

چار دن بعد میں ڈرتے ڈرتے مصری افسر سے ملا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ مجھے بٹھا کر وہ اندر گیا اور پاسپورٹ لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کھول کر ویزے دیکھے اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ یوں لگا جیسے جرمنی نہیں جنت کے ویزے مل گئے ہوں۔ کیوں نہیں! اگر بیوی کا مشورہ جنت سے نکال سکتا ہے تو داخل بھی کر سکتا ہے۔

میں نے چیک کاٹ کر اس مصری افسر کو پیش کیا اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میری مشکل حل کر دی ہے۔ اس نے کہا ''یہ جرمنی کا ویزہ آج کل واقعی بہت مشکل ہے۔ خاص کر پاکستانیوں اور افغانیوں کے لیے۔'' میں نے پوچھا ''کیوں؟'' اس

نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا ''یہ لوگ جاتے ہیں تو ٹک جاتے ہیں، واپس نہیں آتے۔'' میں نے مصنوعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''اچھا!'' اور پھر میں نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں میرے دل کا چور ظاہر نہ ہو جائے اور جلدی سے وہاں سے نکل لیا۔

گھر آ کر میں نے اہلیہ کو بتایا کہ تمہارا مشورہ تو اللہ تعالیٰ نے بہت بابرکت کر دکھایا۔ جرمنی کے ویزے مل گئے ہیں تاہم میں نے نصیحت کی کہ کسی سے ذکر نہ کرنا کہ ہم ویزہ لے کر جا رہے ہیں۔ عام تاثر یہی تھا کہ ہم ایمسٹرڈم سے بائی روڈ ہی جائیں گے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مخالف عناصر پھر کوئی شرارت نہ کریں لہٰذا میں حتی الوسع رازداری سے کام لے رہا تھا۔

کانو سے لندن۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں

''ایجپٹ ایئرویز'' کی تلاش کے دوران مجھے احمدیہ کلینک کے قریب برٹش ایئرویز کا آفس نظر پڑا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ آفس پہلے تو نہ دیکھا تھا۔ میں نے رُک کر پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ سے برٹش ایئرویز بھی کانو آنے جانے لگی ہے۔ کچھ عمومی معلومات حاصل کر کے میں آگے چلا گیا۔

اب جب کہ جرمنی کا ویزہ مل گیا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایمسٹرڈم کی بجائے میں سیدھا لندن جا کر پھر جرمنی جاؤں۔ اس طرح مجھے لندن میں چند دن قیام کا موقع مل جائے گا۔ اس قیام کے دوران میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل کر لوں گا اور زندگی کے اس نئے دور کے آغاز سے پہلے حضور کی خدمت میں دعا کی درخواست ایک بابرکت شگون ہوگا۔ چنانچہ میں برٹش ایئرویز کے دفتر گیا اور جا کر کانو، لندن، ڈوزل ڈرف کی بکنگ کرا لی۔ اور KLM کی ایمسٹرڈم کے ذریعہ بکنگ کینسل کرا دی۔ آئندہ چند دن میں میری تیاری مکمل ہوگئی۔ سوائے شاہد احمد قریشی صاحب کے میری روانگی کا کسی کو علم نہ تھا کہ کب، کہاں اور کیسے ہوگی۔

احمدیہ مسلم سکول کانو کے پرنسپل مکرم منور احمد قیوم صاحب بہت ملنسار اور مہربان دوست تھے۔ چودھری بشیر احمد صاحب وہاں ٹیچر تھے۔ انہوں نے میری گاڑی خریدی تھی۔ میں نے یہ گاڑی ایئر پورٹ پر اُن کے حوالے کرنی تھی۔ روانگی سے دو روز پہلے میں سکول گیا اور ان دوستوں سے ملا اور اپنی روانگی کی اطلاع دی۔ پھر دو روز ہم نے الوداعی ظہرانہ اور عشائیہ سے لطف اُٹھایا۔ ایک اور ٹیچر مکرم عبدالرزاق صاحب بھی انہی مخلص دوستوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

آدھی رات کو برٹش ایئرویز کی فلائیٹ تھی۔ یہ سب دوست اور بعض نوجوان ایئر پورٹ پر الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ مکرم شاہد احمد قریشی صاحب زاریہ (Zaria) سے تشریف لائے تھے۔ اتفاق سے KLM کی فلائیٹ بھی اسی وقت رات کو نصف گھنٹے کے وقفے سے اڑ رہی تھی۔ اس طرح دونوں پروازوں کے مسافر بیک وقت، چیک اِن کر رہے تھے۔ میں جب اپنا

سامان چیک اِن کر کے برٹش ایئر ویز کے ٹیگ اور ٹکٹ ہاتھ میں لیے باہر آیا تو سب تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر ایک نوجوان نے میرے پاس آ کر پوچھا ''انکل آپ ایمسٹر ڈم نہیں جا رہے؟'' میں نے کہا ''نہیں''

پھر اس نے پوچھا ''تو پھر کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''لندن حضور سے ملنے''

لندن پہنچ کر میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنی کتاب جس کا جرمن ترجمہ ہوا تھا، پیش کی۔ حضور جرمن ترجمے کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا ''انگلش سے کس قدر مختلف ہے۔'' پھر حضور نے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے عرض کی ''حضور جرمنی جا رہا ہوں'' حضور نے فرمایا ''کینیڈا کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے عرض کی ''حضور! جرمنی میں میرے بچے پہنچ چکے ہیں۔'' اس پر حضور نے فرمایا ''تو پھر تمہارا وہاں جانا نیچرل ہے۔'' میں نے حضور کی خدمت میں دُعا کی درخواست کی اور اجازت لی۔

بعد میں مَیں وکیل التبشیر مکرم ساقی صاحب سے ملا۔ کچھ دیر کانو کے حالات پر بات ہوئی۔ پھر انہوں نے کہا ''مغربی افریقہ تو نہیں، البتہ اگر ارادہ ہو تو مشرقی افریقہ بھیج سکتے ہیں۔'' میں نے کہا کہ ''فی الحال تو میں جرمنی جا رہا ہوں۔ وہاں بچوں کو سیٹ کرنے کے بعد دیکھوں گا۔''

جرمنی آمد - ابتدائی تاثرات

لندن میں چند دن کے قیام کے دوران ہم نے اپنے عزیز و اقارب سے بھی ملاقات کی۔ اور ایک وکیل سے مشورہ کر کے بنک کا مسئلہ حل کیا۔ پھر ہم جرمنی پرواز کر گئے۔ ڈوزل ڈرف ائیر پورٹ پر بیٹی اور ظفر محمود موجود تھے۔ وہ صوبہ ویسٹ فالن کے ایک چھوٹے سے شہر ہالٹرن (Haltern) میں رہتے تھے۔ شہر کی سادہ، کشادہ فضا اچھی خوشگوار تھی۔ وہ ہمیں اِدھر اُدھر سیر کرانے لے جاتے۔ شاپنگ پر جاتے تو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ہم نہ تو کسی سے کوئی بات کر سکتے تھے، نہ کسی کی بات سمجھ سکتے اور نہ ہی اِردگرد جو کچھ لکھا نظر پڑتا، وہ پڑھ سکتے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے یہاں آ کر اَن پڑھ، گنوار سے بن کر رہ گئے ہیں۔ بیٹی کے ساتھ ساتھ ہم آگے پیچھے دائیں بائیں اس طرح چلتے رہتے جیسے وہ کبھی بچپن میں ہمارے ساتھ ساتھ لگی گھومتی رہی تھی۔ بچوں کی طرح ہم بار بار اس سے مختلف سوال کرتے اور وہ بڑوں کی طرح ہمیں ہر بات بتاتی، سمجھاتی اور سکھاتی رہتی۔

چند دن میں ماحول سے کچھ مانوس ہوا تو میں اکیلا گھومنے نکلنے لگا۔ لبوں پر مہر خاموشی اور دل میں احساس کمتری لیے میں خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا چلا جاتا۔ صاف ستھرا ماحول تھا۔ احساس اجنبیت تو تھا لیکن کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ گورے چٹے، بنے سنورے لوگ بالکل "انگریز" دکھائی دیتے تھے لیکن افسوس کہ وہ "انگریزی" بہت غلط اور کرخت بول رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی سے کوئی بات کروں یا کچھ پوچھوں لیکن بات بن نہ پاتی تھی۔ عجب گھٹن سی محسوس ہوتی اور کبھی تو دل پکار اُٹھتا

؎ "یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیرے جرمن میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری"

رزق کی فراوانی لیکن............

ہمیں آئے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ پاکستان سے ظفر محمود کے والدین بھی جرمنی آ گئے۔ ظفر نے ان کو تین ماہ کے لیے سپانسر کر کے بلایا تھا۔ ان کے آنے سے گھر میں ایمان افروز واقعات بیان ہونے لگے اور ماحول خدا کے فضل سے بارونق اور بابرکت ہو گیا۔ اہل خانہ کو بزرگوں کی خدمت کا انمول موقع میسر آیا۔ حسبِ خواہش کھانے پکتے اور پھل فروٹ، خشک میوے اور بسکٹ وغیرہ ہر وقت موجود رہتے۔ ہم خدا کی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے، نمازیں ادا کرتے اور ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد آرام کرتے۔ شام کو ایک دو پاکستانی گھرانے ملنے آ جاتے تو اچھا دل بہل جاتا۔

اس رہائش کی آسانی اور رزق کی فراوانی کے باوجود میں کچھ پریشان سا رہتا۔ جرمن زبان کی دشواری میرے لیے خوف و خلش کا باعث تھی۔ اس کو سیکھے بغیر چارہ نہ تھا مگر سیکھنے کا یارا نہ تھا۔ اپنی انگریزی یہاں بے کار لگتی تھی۔ کوئی یہاں انگریزی بولتا سمجھتا نہ دیکھا تھا اور یہ صورتحال بہت مایوس کن تھی۔ ظاہر تھا کہ جرمن زبان سیکھے بغیر میل ملاقات، راہ و رسم اور تبلیغی گفتگو ممکن نہ تھی اور ایسی خاموش، بے زبان، بے آواز زندگی، زندگی نہ تھی۔ اس سے تو افریقہ ہی اچھا تھا۔

؎ "اے طائرِ افریقی اس رزق سے بھوک اچھی — جس رزق سے آتی ہو آواز میں کوتاہی"

غریب لیٹر بکس

ایک اور چیز جس کی ارزانی وفراوانی یہاں دیکھنے میں آئی وہ اخبارات اور اشتہارات تھے۔اکثر گھروں کے باہر یہ بکھرے پڑے ہوتے۔معلوم ہوا کہ یہاں اخبار مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔صبح ہی صبح کوئی آتا اور اخبار لیٹر بکس میں ٹھونس جاتا۔ پھر ایک اشتہار والا آتا اور وہ اشتہار پھنسا جاتا۔اسی طرح یکے بعد دیگرے یہ لوگ آتے رہتے اور بے چارے لیٹر بکس کے معصوم سے منہ میں زبردستی اشتہارات اور اخبارات اس طرح گھسیڑ کر چلے جاتے کہ آدھے سے زیادہ وہ باہر لٹک رہے ہوتے۔ لیٹر بکس کی حالت قابلِ رحم نظر آتی۔اب دس گیارہ بجے کے قریب ڈاکیا خط لاتا ہے،غریب ونحیف خط اپنی چھوٹی سی کٹیا پر کیم وشحیم اخباری قبضہ گروپ اور اشتہاری لینڈ مافیا کا تسلط دیکھ کر تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ڈاکیا نازک صورتحال کا جائزہ لیتا ہے۔خط کو صبر کی تلقین کرتا ہے اور اس ظالم معاشرہ میں مل جل کر گزر بسر کرنے کا مشورہ دے کر خط کو وہیں کہیں اَڑا کر چلا جاتا ہے۔

پھر تھوڑی دیر بعد گھر کا مالک چابی ہاتھ میں لیے ڈاک دیکھنے آتا ہے۔کھینچ کھینچ کر یہ پلندہ باہر نکالتا ہے اور نیچے پھینکتا جاتا ہے۔لیٹر بکس کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے تو خالی پاتا ہے۔پھر وہ ردّی کے اس ڈھیر میں سے اپنا خط ڈھونڈتا ہے۔

جرمن الفاظ کی لمبائی

ظفر محمود یہ اخبار اور اشتہار لا کر مجھے دیتا اور کہتا کہ "یہ اخبار پڑھیں اور اشتہار دیکھیں۔اس سے جرمن زبان سیکھنے میں مدد ملے گی۔" اب بتاؤ اگر اخبار پڑھ سکتا تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔یہی تو رونا تھا کہ میں صرف اخبار کو وحشت زدہ نظروں سے گھور ہی سکتا تھا۔بعض الفاظ کی لمبائی دیکھ کر دل بیٹھ جاتا۔ایک بات تو مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ جرمن زبان میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہماری انگریزی کے حروف کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس طرح اکٹھا لکھ دیا جائے کہ اس سے کوئی قابلِ فہم یا بامعنی لفظ بن نہ پائے۔حیرت ہوتی تھی کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ایک روز میں نے ایک چھوٹا سا سہ حرفی لفظ دکھا کر ظفر سے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟" اس نے بتایا یہ "اُنڈ (Und)" ہے جسے آپ "اَینڈ (And)" کہتے ہیں۔میں نے کہا "او! تیرا بھلا ہو! اس ایک غریب اَینڈ کو تو اصلی حالت میں رہنے دیتے۔اس کا بھی اُنڈ بنا کر چھوڑا۔ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

کئی الفاظ پندرہ بیس حروف پر مشتمل تھے۔بعض تو بیس پچیس حروف والے تھے۔بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سب سے لمبا لفظ تیس حروف پر مشتمل ہے۔واضح رہے کہ جرمن کے کل حروف اُنتیس ہیں۔(انگریزی سے تین زائد) یہ طویل لفظ مجھے معلوم ہے لیکن اس کا لکھنا یوں قرینِ مصلحت نہیں کہ اس سے غیر جرمنوں کے خوف وفکر میں اضافہ ہوگا اور جرمنوں کے نازِ فخر میں۔اور اندیشہ ہے کہ وہ مزید لمبے اور مشکل الفاظ نہ بنانے لگ جائیں۔جی ہاں! یہ الفاظ اتنے لمبے اصل میں ہوتے نہیں، بنائے جاتے ہیں اور مزید لمبے بنائے جا سکتے ہیں۔

اس طویل ترین لفظ کا کچھ حصہ مجھے بھول گیا تھا۔میں قریبی سکول میں جہاں غیر ملکیوں کو زبان سکھائی جاتی ہے، گیا اور دو

تین استادوں سے اس لفظ کا پوچھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایک استانی آئی اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''جو لفظ تم پوچھ رہے ہو وہ تو یاد نہیں لیکن تمہیں کتنا لمبا لفظ چاہیے! بتاؤ میں بنا دیتی ہوں۔''

پھر ایک اور استانی جو ذرا فاصلے سے سن رہی تھی، بول اُٹھی۔ میں نے کہا ہاں یہی ہے وہ لفظ۔ ذرا لکھ دو:

Donaudampfschiffskapitänsmütze

Donau steem ship's captain's cap

دراصل یہ لمبے لفظ کئی چھوٹے الفاظ کا مرکب ہوتے ہیں۔ حروف کی لمبی لائن میں سے ان چھوٹے الفاظ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے اور پھر اس لفظ کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ دوسری زبانوں میں ایسے مرکب الفاظ کو لکھتے وقت ذرا فاصلہ رکھا جاتا ہے اور پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جرمن میں فاصلہ نہیں رکھا جاتا اور غیر جرمن پریشان ہو جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں اگر ہم یہ لکھیں تو کیسا خوفناک لگتا ہے

Mainrailwaystationsbookingoffice'sincharge

یہ ایک لفظ ہے۔ حالانکہ اگر چھوٹے الفاظ میں وقفہ ڈال دیں تو وحشت ختم ہو جاتی ہے۔ Main railway station's booking office's incharge جرمن زبان کا یہاں استدلال یہ ہے کہ ''انچارج'' ایک شخص کی نشاندہی مقصود ہے۔ باقی الفاظ اس کی تخصیص کے لیے ہیں کہ وہ کس دفتر کا انچارج ہے۔ لہٰذا یہ سب اکھٹے لکھے جائیں گے اور یہ ایک لفظ ہوگا۔ یہ بات کچھ دل نہیں لگتی۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہی اس پر نظر ثانی ہو جائے۔ انتہاء پسندی خواہ لفظی ہی ہو، اس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صرف مرکب الفاظ ہی لمبے ہوتے ہیں، بعض مفرد الفاظ بھی جرمن میں قدرے لمبے ہوتے ہیں اور بولنے میں کرخت اور مشکل بھی۔ اس لیے جرمن پڑھنا، بولنے کی نسبت میرے لیے آسان لگتا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی سرکاری یا عدالتی تحریر نہ ہو۔ سرکاری، عدالتی اور پولیس پٹواری کی تحریر تو اردو کی بھی پڑھی نہیں جاتی۔ اب جوں جوں اس زبان کی سوجھ بوجھ ہو رہی ہے، پڑھنے میں مزہ آنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو اُردو، فارسی کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کی گرائمر کی گہرائی اور دشواری دیکھ کر تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہو نہ ہو عربی سے اس کا ضرور کوئی خونی رشتہ ہے۔ خوش قسمتی سے انگریزی کے سینکڑوں الفاظ تلفظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ اس میں شامل ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا ہوں۔ جرمنی کے حالات و واقعات تو آگے الگ لکھنے کا ارادہ ہے۔ یہاں تو تاریک براعظم سے اس روشن سرزمین پر اپنی آمد اور صرف ابتدائی تاثرات بیان کرنا مقصود تھا۔ اور یہ بیان میرا قدرے لمبا ہو گیا ہے اور کچھ اُونچا بھی۔

؎ ''اتنی نہ بڑھا روشنیٔ خرد کی حکایت ماضی ذرا دیکھ، حال اپنا ذرا دیکھ''

باب نہم

جرمنی میں گزرے بیس سال

(چیدہ چیدہ واقعات)

ہم مئی ۱۹۹۰ء میں جرمنی آئے۔ ہم سے آٹھ ماہ پہلے دونوں لڑکے یہاں پہنچ چکے تھے اور اپنی بہن اور بہنوئی سے مل کر اُنہوں نے سیاسی پناہ کی درخواست دے دی تھی۔ نائیجیریا میں ہمیں یہ اطلاع مل چکی تھی کہ حکومت کی طرف سے ان کو روٹی، کپڑا اور مکان جیسی سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں اور وہ ہالٹرن (Haltern) سے تقریباً سوکلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر میں خیریت سے رہنے لگے ہیں۔

اب جب ہم جرمنی آئے تو یہ لڑکے نہ تو ہمیں بہن کے ساتھ ائیرپورٹ پر نظر آئے اور نہ ہی وہ بعد میں بہن کے گھر ملنے آئے۔ ہم نے بیٹی سے پوچھا تو اس نے قدرے افسردگی سے بتایا کہ جس شہر میں ان کو رکھا گیا تھا وہ ان کا عارضی ٹھکانا تھا۔ بعد میں اُن کو وہاں سے کسی دوسرے شہر منتقل کر دیا گیا ہے۔ بیٹی نے بتایا کہ جب وہ نائیجیریا ایک ماہ ہمارے پاس گزار کر واپس جرمنی آئے تو وہ دونوں بھائی اس شہر سے جا چکے تھے۔ پولیس ان کو پہلے زنڈورف (Zindorf) لے گئی، جہاں پناہ گزینوں کا سب سے بڑا کیمپ ہے اور پھر وہاں سے دو تین ہفتہ بعد ان کو جرمنی کے جنوب میں صوبہ بائرن (Bayern) کے ایک سرحدی قصبہ ایمن سٹیڈ (Immenstadt) میں شفٹ کر دیا گیا۔ یہ قصبہ ہمارے اس شہر ہالٹرن سے تقریباً آٹھ سوکلومیٹر دُور ہے اور وہاں سے اُن کا آنا فی الحال بہت مشکل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قصبہ آسٹریا کی سرحد کے پاس پہاڑوں پر واقع ہے اور قریب ہی وہ ''سب سے اُونچا گاؤں'' اوبرسٹ ڈرف (Oberstdorf) ہے جہاں ونٹر سپورٹس ہوتی ہیں۔

ہمیں یہ سن کر بہت مایوسی ہوئی اور پریشانی بھی۔ پردیس میں اگر عزیز و اقارب قریب ہوں تو بہت تسلّی اور حوصلہ رہتا ہے۔ بیٹی نے ہمیں مزید بتایا کہ انہوں نے وکیل سے بھی اس سلسلہ میں بات کی تھی اور وکیل نے بھی اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ ایک صوبہ کے اندر تو شہر تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس طرح سینکڑوں میل دُور کسی دوسرے صوبہ میں پھینک دینا سننے میں نہیں آیا۔ وکیل نے اس سلسلہ میں پولیس کو خط بھی لکھا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ (اُس وقت مشرقی اور مغربی جرمنی ابھی اکٹھے نہ ہوئے تھے۔)

ہم چونکہ نئے نئے جرمنی آئے تھے اور سیاسی پناہ کی درخواست دینے کی سوچ رہے تھے۔ لہٰذا ہمیں یہ سب کچھ سن کر بہت پریشانی لاحق ہوگئی۔ ہمیں تو قدم قدم پر بیٹی کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت تھی اور یہ سوچ کر ہی ہمارا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر ہمیں بھی کہیں سینکڑوں میل دُور پھینک دیا گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ بایں ہمہ میرے دل میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر ان لڑکوں کو استثنائی طور

پراس طرح دُور بھیج دیا گیا ہے جبکہ بہت سے پناہ گزین یہاں ہمارے اردگرد اسی صوبہ میں ہی آباد ہو رہے ہیں تو اس میں بھی ضرور کوئی نہ کوئی حکمتِ الٰہی ہوگی، جس کا اظہار اپنے وقت پر ہو جائے گا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اظہار چند دن بعد ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ گو ہمیں احساس بہت دیر بعد ہوا۔

سیاسی پناہ کی درخواست-مشورہ وکیل کا-حکمت خدا کی

جرمنی آنے کے ہفتہ دس دن بعد ہم نے وکیل سے مل کر سیاسی پناہ کی بات کی۔ وکیل کو میں نے نائیجیریا میں اپنی طبّی اور تبلیغی سرگرمیوں کا بتایا اور یہ بھی کہ پاکستان میں ہماری مخالفت سخت ہے اور گھر کو جلا دیا گیا تھا۔ میرے حالات سن کر وکیل نے بیٹی سے کہا ''یہاں ویسٹ فالن صوبے میں سیاسی پناہ کی درخواستوں پر فیصلے نہیں ہوتے۔ اچھے بُرے سب کیس معرضِ اِلتوا میں پڑے رہتے ہیں۔ تمہارے باپ کے کیس میں جان ہے۔ اس کا فیصلہ اُمید ہے کہ اس کے حق میں ہوگا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اُن کی سیاسی پناہ کی درخواست کسی ایسے صوبے میں دی جائے جہاں فیصلے ہوتے ہیں۔'' اس نے مشورہ دیا کہ ''کارلزروئے (Karlsruhe)'' بہتر رہے گا۔

بیٹی نے جب وکیل کے مشورے کا ذکر مجھ سے کیا تو مجھے وکیل کی بات اچھی نہ لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ شہر ''کارلزروئے'' ہالٹرن سے تقریباً چار سو کلومیٹر دُور ہے۔ پولیس نے بھائیوں کو آٹھ سو کلومیٹر دُور پھینک دیا تھا اور اب یہ وکیل ہمیں بیٹی سے چار سو کلومیٹر دُور بھیج رہا تھا۔ میں نے احتجاج کیا اور بیٹی سے کہا کہ وہ وکیل سے کہہ دے کہ فیصلے کو چھوڑے اور ہمیں یہاں ہی کہیں اس صوبے میں سیٹ کرا دے۔

جب بیٹی نے وکیل سے میرا اعندیہ بیان کیا تو اس نے کہا کہ شاید مجھ تک اس کی بات ٹھیک سے پہنچ نہیں پائی۔ لہٰذا اس نے خود آہستہ آہستہ انگریزی میں مجھ سے بات کی اور سمجھایا کہ وقتی آسانی نہ دیکھو، انجام کار کارلزروئے جانا تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ فیصلے کے بعد تم پھر اِدھر آ سکتے ہو۔ اس صوبہ میں تم سالہا سال تک بغیر کسی حقوق کے پھنسے رہو گے جبکہ فیصلہ کے بعد تمہیں بہتر حقوق مل جائیں گے۔

کارلزرئے کا پریشان کُن چکر

وکیل کی باتیں سن کر میں بادل نخواستہ راضی ہو گیا۔ دوسرے ہی روز بیٹی اور ظفر ہمیں ''کارلزروئے'' لے گئے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو بعد دوپہر تین بج رہے تھے۔ بہت وسیع کمپاؤنڈ کے اندر پولیس سٹیشن پر جا کر جب بات کی تو پولیس افسر نے ظفر سے پوچھا:

''ان کو کہاں سے لائے ہو؟'' ظفر نے کہا ''ہالٹرن سے ان کو لے کر آیا ہوں۔''

اس پر پولیس افسر نے کہا کہ

''وہاں اُس صوبے میں ان کی ''ازیل'' کیوں نہیں کرائی۔ یہاں کیوں لائے ہو؟''

ظفر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر افسر نے پوچھا ''تمہارے پاس گاڑی ہے؟''

جب ظفر نے بتایا کہ اس کے پاس گاڑی ہے تو افسر نے کہا:

''لے جاؤ ان کو واپس، اور وہاں جا کر ''ازیل'' کرالو۔''

مایوس ہو کر ہم وہاں سے واپس روانہ ہو گئے۔ پولیس افسر کی ساری بات تو سمجھ نہ آئی تھی لیکن اس کے سخت رویّے سے میں خوفزدہ ہو گیا تھا اور میں نے تہیّہ کر لیا کہ اب وکیل سے کہہ کر اُسی صوبے میں ہی درخواست دے دوں گا۔ بیٹی اور داماد کا قُرب تو اور بھی زیادہ ضروری محسوس ہونے لگا تھا۔

کارلزروئے کی ''بنڈس آمٹ (Bundesamt)'' میں سیاسی پناہ کی درخواست بذریعہ ڈاک

ہم دوسرے روز پھر وکیل کے پاس گئے اور وہ سارا ماجرا کہہ سنایا جو کارلزروئے میں پیش آیا تھا۔ وکیل نے سنا تو سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد بولا ''سیاسی پناہ کی درخواست ملک میں کسی بھی نیشنل آفس میں دی جا سکتی ہے۔ جب تم لوگ وہاں کارلزروئے پہنچ گئے تھے تو پولیس افسر کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ تمہیں واپس جانے کا کہتا۔ یہ اس افسر نے زیادتی کی ہے اور میں اس سلوک کی جو اس نے تم سے کیا ہے، معافی مانگتا ہوں۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا ''اب تم جاؤ اور بیٹی کے ہاں ایک دو ہفتے آرام کرو۔ میں تمہاری درخواست بذریعہ ڈاک اسی کارلزروئے کے نیشنل آفس (بنڈس آمٹ) کو ارسال کروں گا۔''

ایک دفعہ پھر میں وکیل کے مشورے پر راضی ہو گیا۔ اس نے بذریعہ ڈاک میری درخواست بھیج دی اور درخواست کی نقل دو دن بعد مجھے مل گئی۔ میں نے دو ہفتہ بیٹی کے ہاں قیام کیا۔ ظفر کے والدین آئے ہوئے تھے۔ ہم نے جرمنی کے مختلف علاقوں کی سیر کی اور ارد گرد جماعت کے دوستوں سے میل ملاقات کی۔ فرینکفرٹ کا چکر بھی لگایا۔

سیاسی پناہ گزینوں کے کیمپ میں

دو ہفتہ بعد ہم پھر کارلزروئے کے وسیع و عریض کیمپ میں گئے۔ اب کے دیکھا تو وہاں مختلف ملکوں کے لوگوں کی قطاریں لگی تھیں۔ زیادہ تر مشرقی یورپ کے لوگ تھے۔ دو تین گھنٹے کے بعد ہماری باری آئی۔ پولیس نے کچھ سوالات کئے، دستخط کرائے، انگلیوں کے نشان لیے اور اس طرح ہماری رجسٹریشن ہو گئی۔ ہمیں ایک کمرہ دے دیا گیا جو اچھا کھلا تھا اور ہماری ضرورت کے مطابق اس میں تین بستر لگے تھے۔ کھانے کے لیے ہم ایک بڑے ہال میں جاتے۔ وہاں لائن میں لگ کر ہم کھانے کی ٹرے اُٹھاتے اور کرسیوں پر بیٹھ کر بڑے آرام سے کھانا کھاتے۔ بیٹی اور ظفر شام تک ہمارے ساتھ رہے اور پھر وہ ہمیں حوصلہ دِلا کر واپس چلے گئے۔

اندر کیمپ کے کمپاؤنڈ میں رہائشی بلاکس کے علاوہ گراؤنڈ بھی تھا جہاں لوگ کھیل کود کرتے۔ ایک بڑے کمرے میں

ٹیلیویژن اور اخبارات وغیرہ تھے۔لوگ وہاں بیٹھ کر اکثر ٹی وی پر فٹ بال میچ دیکھتے اور اپنے اپنے ملک کی ٹیم کی کارکردگی پر خوشی سے تالیاں بجاتے۔ اچھا بلّا گُلّا ہوتا۔ خاموش طبع لوگوں کے لیے ایک پرسکون لائبریری بھی تھی۔ کالج کے ہوسٹل جیسی زندگی تھی، دو تین دن میں مختلف بلاکس کا چکر لگا کر میں نے تین چار پاکستانیوں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ ان کے عزیز رشتہ دار اُن سے ملنے آتے۔ اُن سے ہمیں وہاں جماعت کے بارے میں معلومات ملیں۔کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک گھر میں جمعہ ہوتا تھا۔ اجازت لے کر جمعہ میں شامل ہوا۔ احباب سے ملاقات ہوئی۔ اکثر پناہ گزین ہی تھے جن کو اب کیمپ سے باہر گھروں میں رہنے کی اجازت مل چکی تھی۔

مربی سلسلہ ڈاکٹر محمد جلال شمس صاحب کے ساتھ تبلیغی نشست میں شمولیت

اسی جمعہ کی نماز میں یہ اطلاع ملی کہ اتوار کو اسی جگہ اجلاس ہوگا۔ میں انتظامیہ سے اجازت لے کر اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ دیکھا کہ سب دوست خاموش بیٹھے کچھ یاد کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو بتایا کہ آج مربی صاحب نے نماز کا ترجمہ سننا ہے۔ مجھے بھی فکر ہوئی کہ بار بار یاد کرنے کے باوجود یہ التحیات کچھ مشکل پیش کرتی ہے۔ میں نے کسی سے مترجم نماز لے کر اس پر نظر دوڑائی۔

اتنے میں مربی سلسلہ مکرم محمد جلال شمس صاحب صدر جماعت مکرم ڈاکٹر نعیم احمد طاہر صاحب کے ساتھ تشریف لائے۔ وہ دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے اور ایک ایک کر کے دوستوں کو بلا کر ترجمے کا امتحان لینے لگے۔ میں داخل ہوا تو مربی صاحب نے نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو انہوں نے پوچھا:

''آپ کہیں وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹہ تو نہیں جو نائیجیریا میں تھے اور جنہوں نے عیسائیت پر بہت سے کتابچے لکھے ہیں؟''

میں نے کہا ''جی میں وہی ہوں اور نائیجیریا سے ہی آیا ہوں۔'' اس پر مربی صاحب نے ڈاکٹر نعیم احمد طاہر صاحب سے کہا ''یہ ہماری جماعت کے بڑے سکالرز میں سے ہیں۔ انہوں نے کئی تبلیغی کتابچے لکھے ہیں۔ اور ایک کتاب کا جرمن ترجمہ بھی ہوا ہے۔''

پھر مربی صاحب نے کہا کہ امتحان تو آپ کا ہم نہیں لیتے۔ البتہ یہ بتائیں کہ کیا آج شام فارغ ہیں؟ میں نے کہا کہ جی میں فارغ ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اجلاس کے بعد مجھے قریبی بستی میں ایک تبلیغی نشست پر جانا ہے۔ آپ بھی ساتھ چلیں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا۔ راستے میں مربی صاحب نے ایک جگہ گاڑی روکی اور میکڈونلڈ سے ٹھنڈے اور میٹھے دودھ کے گلاس اور چکن برگر لے کر آئے۔ بہت بھوک لگی تھی اور بہت مزہ آیا تھا۔ پھر ہم افریقی، عربی اور ترکی دوستوں کے ساتھ تبلیغی میٹنگ میں شامل ہوئے۔ رات کو مربی صاحب مجھے واپس میرے کیمپ چھوڑ گئے۔

اس تنہائی اور پریشانی کے ماحول میں اس ملاقات نے اچھا خوشگوار اور حوصلہ افزاء اثر چھوڑا اور میں نے محسوس کیا کہ میں

اس ملک میں اجنبی سہی لیکن یہاں کی جماعت میں اجنبی نہیں۔ اس سے پہلے فرینکفرٹ کے ایک چکر میں ظفر محمود میری ملاقات مکرم امیر صاحب جرمنی عبداللہ واگس ہاؤزرر اور ہدایت اللہ صاحب ہبش سے کرا چکا تھا۔ وہ میری کتاب کے جرمن ترجمہ کے حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ غائبانہ تعارف تھا۔

نیشنل آفس برائے سیاسی پناہ میں انٹرویو (پروٹو کال)

اس کیمپ کے اندر ہی پولیس کی بلڈنگ سے ملحقہ تین دفاتر تھے جن میں پناہ گزینوں کے انٹرویو ہوتے اور ان کی درخواستوں کا فیصلہ ہوتا۔ نوٹس بورڈ پر لسٹیں لگ جاتی تھیں کہ کس کا انٹرویو کب اور کس دفتر میں ہوگا۔ جن کے انٹرویو ہو جاتے ان کو آگے دوسرے شہروں میں چھوٹے کیمپوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ اُن کی بھی لسٹیں لگ جاتی تھیں۔ روزانہ صبح لوگ نوٹس بورڈ کو جا کر دیکھتے۔ آٹھ دس دن بعد ہمارا نام بھی انٹرویو کی لسٹ میں آ گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے اس انٹرویو (پروٹو کال) میں چند سوالات پوچھے گئے جن کے جواب میں مَیں نے نائیجیریا میں اپنے وقف کے دوران اپنی طبّی اور تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ ثبوت کے طور پر کچھ خطوط دکھائے اور وہ کتابچے جو لکھے تھے، پیش کئے۔ ایک پاکستانی شخص عبداللہ نامی مترجم تھا۔ انٹرویو کے دو روز بعد ہمارا نام چالیس پچاس لوگوں کی لسٹ میں آ گیا جن کے بارے میں لکھا تھا کہ دو روز بعد ان کو ایک شہر "برٹین (Bretten)" میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ میں نے بیٹی کو فون کر کے اپنے انٹرویو اور اب برٹین میں اپنے نئے ایڈریس سے مطلع کیا اور پھر ہم اپنے بیگ پیک کرنے لگے۔

افسرانِ بُنڈس آمٹ کے ساتھ مجلس سوال و جواب

پروٹو کال کے تیسرے روز مجھے مترجم عبداللہ ملا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے دیر سے تلاش کر رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ "آپ کو بلایا گیا ہے کل شام چار بجے۔" میں نے گھبرا کر پوچھا "کیوں خیر تو ہے، پروٹو کال تو ٹھیک ہی ہو گئی تھی، اب کیا ہوا؟"

اس نے کہا "گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تینوں افسران اکٹھے ایک کمرے میں بیٹھیں گے۔ میں کل شام آپ کو لے جاؤں گا۔"

میں نے کہا کہ کل تو ہمیں یہاں سے شفٹ کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا کہ انہوں نے پولیس سے کہہ دیا ہے اور آپ کا قیام یہاں دو روز کے لیے بڑھا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلے روز چار بجے مجھے مترجم ایک کمرے میں لے گیا جہاں تینوں افسران بیٹھے تھے۔ ایک ان میں سے خاتون تھی۔

مترجم کے ذریعہ انہوں نے سوال پوچھنے شروع کیے۔ پہلے انہوں نے پوچھا کہ پاکستان میں کیا پرابلم ہے آپ کو؟ کیوں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کیا فرق ہے آپ میں اور دوسرے مسلمانوں میں؟

ان سوالوں کے جواب میں مَیں نے مثال سے سمجھانا بہتر خیال کیا۔ میں نے کہا کہ دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام یہود کی طرف آئے تھے۔ یہود نے ان پر اور انکے ماننے والوں پر ظلم وستم ڈھایا تھا اور ان کے ماننے والے مجبوراً اردگرد کے ممالک میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ مسیح دوبارہ آ چکے ہیں لہٰذا اب وہی ظلم وستم کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ عوام کے ساتھ اب حکومت بھی ہم پر ظلم کرنے لگی ہے تو ہمیں مجبوراً غیر ممالک میں پناہ لینی پڑ رہی ہے۔

جہاں تک فرق کا تعلق ہے میں نے وضاحت کی کہ ہم اسلام کے سب بنیادی عقائد وہی رکھتے ہیں جو غیر احمدی مسلمان رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت مسیح اور اُنکے حواری وہی بنیادی عقائد رکھتے تھے جو یہود کے تھے۔ فرق جو ہے وہ اعمال کے اندر خلوص اور روح کا ہے۔ یا پھر بعض پیشگوئیوں کی غلط تشریح کا۔ پھر میں نے ایلیا کے آسمان سے آنے کی پیشگوئی کی مثال دے کر وضاحت کی۔

میرے جوابات کی تیزی اور تفصیل سے مترجم کا سر چکرا گیا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد مترجم نے معذرت کر لی۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں انگریزی میں ہی جواب دیتا رہوں لیکن ذرا آہستہ آہستہ۔

اب انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ تم لوگ ایک ہی قوم ہو۔ کیوں نہیں کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے جہاں لوگ تم کو نہ جانتے ہوں۔ لوگ کیسے پہچانتے ہیں کہ تم لوگ احمدی ہو؟ تمہاری مسجدوں اور اُن کی مسجدوں میں کیا فرق ہے؟ رہن سہن میں کیا فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالات کے میں نے مناسب جواب دیئے اور وضاحتاً کہا کہ ایک مخلص احمدی اپنے چہرے مہرے، کردار اور اَخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم میں چھپ نہیں سکتا۔ اور پھر جب ہم دوسرے مسلمانوں کے غیر اسلامی رسم ورواج اور رسومات میں شامل نہیں ہوتے تو فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنی وضع قطع، رہن سہن اور طور طریقوں سے دوسرے سے الگ دکھائی پڑتے ہیں۔ مسجدوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نہیں البتہ ہماری نسبتاً سادہ اور چھوٹی ہوتی ہیں۔

آخر میں انہوں نے پوچھا کہ یہاں جو لوگ آتے ہیں وہ یاجوج ماجوج، دجال کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے سوالوں کے جواب میں وہ کسی گدھے کا ذکر بھی کرتے ہیں جو آگ کھائے گا اور کہتے ہیں کہ سورج مغرب سے چڑھے گا، یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سن کر میں ہنسا اور پھر میں نے وضاحت کی کہ مسیح کی آمدِ ثانی کے سلسلے میں یہ نشانیاں ہمارے لٹریچر میں بیان ہوئی ہیں۔ بعض بائیبل میں بھی مذکور ہیں اور یہ تمثیلی زبان میں ہیں۔ پھر میں نے اُن کی تشریح کی اور آخر میں بتایا کہ یہ ''ہوائی جہاز اور بحری جہاز'' اور یہ ''ٹرین، ٹرک اور ٹریلرز'' سب گدھے ہیں۔ جن سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اس زمانے میں گدھوں سے لیا جاتا تھا اور یہ آگ سے چلتے ہیں۔

تقریباً اڑھائی گھنٹہ تک یہ سوال وجواب ہوتے رہے اور وہ خاصے محظوظ ہوئے تھے۔ یہاں آتے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے

ایسی اعلیٰ اور اہم شخصیات تک پیغامِ حق پہنچانے کی توفیق عطا فرمادی تھی جنہوں نے جماعت کے بہت سے دوستوں کے فیصلے کرنے تھے۔ میری سیاسی پناہ کا آغاز تو بڑے بابرکت انداز سے ہو گیا تھا۔ فالحمد للّٰہ۔

درخواست کی منظوری

سوال و جواب کی اس ملاقات کے دوسرے دن ہمیں کارلزروئے سے برٹین منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ہم پچاس ساٹھ لوگ ایک عمارت میں ٹھہرے۔ ہر فیملی کو الگ کمرہ دے دیا گیا تھا۔ یہاں ہمیں کچا راشن دیا جاتا اور کچن میں ہم خود پکاتے کھاتے رہے۔ ایک اور پاکستانی احمدی فیملی بھی وہاں تھی وہ گجرات سے تھے۔ اُن کے دونو جوان لڑکے اچھے مددگار ثابت ہوئے۔

وہاں گئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ مجھے ایک خط ملا۔ کھولا تو وہ سرکاری خط تھا جس کو میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔ دفتر میں سوشل ورکرز کے پاس جا کر دکھایا تو انہوں نے بتایا کہ تمہاری سیاسی پناہ کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔

درخواست دینے سے پہلے جو دو تین ہفتے ہم ہالٹرن میں ٹھہرے تھے اُن میں ملنے جلنے والوں سے یہی تاثر ملا تھا کہ فیصلے میں مہینوں بلکہ برسوں بھی لگ سکتے ہیں اور اکثر درخواست ردّ بھی ہو جاتی ہے اور پھر اپیل کرنی پڑتی ہے۔

اس پس منظر میں یہ منظوری کا خط بہت حوصلہ افزا تھا اور ایمان افروز بھی۔ کمرے میں جا کر میں نے خط کو پھر دیکھا۔ اس میں میرے سارے کتابچے نام بنام درج تھے۔ یہی ''چند تصاویر بتاں'' اور ''کچھ حسینوں کے خطوط'' میری زندگی بھر کا اثاثہ تھا جس کو سینے سے لگائے میں افریقہ سے نکلا تھا اور اسی کو میں نے یہاں افسر مجاز کے سامنے رکھ دیا تھا۔ عجب رحمتِ خداوندی کہ انہی کتابچوں کو فیصلہ کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے صاف دکھا دیا کہ اگر وہ نوازنے پر آئے تو اپنے کیسے کیسے کمزور اور خطا کار بندوں کی کیسی کیسی حقیر کاوشوں کو نواز دیتا ہے۔ کاش انہی تحریروں کا کوئی نکتہ اگلے جہان میں بھی قابلِ قدر ٹھہر جائے کہ سنتے ہیں وہ بڑا نکتہ نواز ہے۔

خدا بھلا کرے اس وکیل کا جس نے نہ صرف صائب مشورہ دیا بلکہ باصرار اس مشورہ پر مجھ سے عمل بھی کروایا۔ ورنہ میرے دونوں بیٹوں کا وکیل بھی وہی تھا اور ان لڑکوں کا کیس سال بھر سے لٹک رہا تھا۔

''اوبرکال باخ'' - یورپ کا ''احمد وال''

برٹین میں ہم کوئی مہینہ بھر ٹھہرے۔ پھر ہمیں اور دوسری پاکستانی فیملی کو ایک بس میں سوار کرایا اور کسی اوبرکال باخ (Oberkollbach) نامی جگہ کے لیے لے کر چل پڑے۔ دو تین گھنٹہ تو بس کسی شاہراہ پر دوڑتی ہوئی بڑے بڑے شہروں سے گزرتی رہی پھر وہ پہاڑی علاقوں میں داخل ہو گئی۔ ندی نالوں کے کناروں اور پہاڑوں کے سایوں میں چلتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ سنسان جنگل میں سے گزرنے لگی۔ ہم تو پہلے ہی حیران تھے کہ برٹین سے صرف ہم دو پاکستانی فیملیز ہی کو کیوں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ پوری بس میں صرف ہم ہی تھے۔ اب مجھے گھبراہٹ ہونے لگی کہ یہ ہمیں اتنی دُور کس علاقہ میں لے جا رہے ہیں۔

پہاڑ اُونچے اور سرسبز درختوں سے اس طرح اَٹے پڑے تھے کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے وادیوں، گھاٹیوں کی گہرائی سے اندازہ ہوتا کہ ہم مسلسل بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں۔ بے زبان تھے، ڈرائیور سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتے تھے۔ سوچتا تھا دونوں لڑکوں کو بھی اسی طرح پہاڑوں پر آسٹریا کی سرحد تک لے گئے تھے۔

خدا خدا کر کے پہاڑ ختم ہوا تو ایک بستی میں بس رُکی۔ ہم اُترنے کی تیاری کرنے لگے تو ڈرائیور نے اشارے سے کہا کہ نہیں، ابھی بیٹھے رہو۔ وہ اُتر کر ایک عمارت میں گیا اور وہاں سے کچھ کاغذات لے کر آیا اور پھر چل پڑا۔ شاید پہاڑ کی کوئی چوٹی سر ہونے سے رہ گئی تھی۔ اب تو یوں لگا جیسے بس نہیں ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں۔ ہر طرف آسمان ہی نظر آ رہا تھا۔ چند کلومیٹر کے بعد عین پہاڑ کی چوٹی پر کوئی سو پچاس گھروں کی چھوٹی سی بستی آ گئی۔ بستی کے وسط میں ایک تین منزلہ عمارت کے صحن میں بس رُکی۔ دو آدمی باہر نکلے، ہم نے بیگ اُتارے اور میں نے ایک سے پوچھا کہ اس سامنے والے کمرے میں جاؤں؟ اس نے آسمان کی طرف انگلی کر کے بتایا ''نہیں، وہاں سب سے اُوپر۔'' میں نے دل میں کہا ''بیٹا تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔''

سب سے اُوپر چھت کے پاس دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ ہمیں مل گیا اور دوسرا دوسری فیملی کو۔ کچن اور باتھ روم مشترکہ تھا۔ اُن کے سامنے کچھ جگہ خالی تھی۔ وہاں ایک میز اور چار کرسیاں لگی تھیں۔ کھانا تو ہم اپنے کمروں میں ہی کھاتے البتہ یہ میز لکھنے پڑھنے کے کام آنے لگا۔ میں نے لڑکوں کی نماز، قرآن کلاس بھی وہاں لگانی شروع کر دی تھی۔ کھڑکی سے ہری بھری گھاس سے لہراتی وادیوں اور سرسبز درختوں سے جھومتے پہاڑوں کا نظارہ خوب تھا۔ کہیں کہیں کچھ گھر بھی نظر آتے تھے۔ دُور وادی میں گائیں چرتی نظر آتی تھیں۔ چمنیوں سے اُٹھتا دھواں بتا رہا تھا کہ یہاں آگ لکڑی سے جلائی جاتی ہے۔ گھروں میں لکڑی کے فٹ بھر کے ٹکڑے برابر کاٹ کر دیواروں کے ساتھ چھت تک لگائے ہوتے تھے۔

گاؤں بہت چھوٹا تھا۔ کوئی ڈاکٹر تھا نہ کوئی کیمسٹ، کوئی شاپنگ سنٹر نہ تھا، ایک بیکری کی دکان تھی جس سے میں ڈبل روٹی خریدنے جاتا تو دیکھتا کہ دو تین بوڑھی عورتیں روایتی دیہاتی لباس میں ملبوس بیکری کی بڑی مالکن سے کھُسر پھُسر کر رہی ہوتیں۔ بالآخر جب وہ رخصت ہونے لگتیں تو مالکن ان کی ٹوکریوں میں دو چار بسکٹ قسم کی کوئی چیز بطور ''جھونگا'' ڈال دیتی۔ اور وہ بڑی مسرور اور مشکور روانہ ہوتیں۔ بیکری کا مالک اچھا ملنسار آدمی تھا، کچھ انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ وہاں ہمارے پاس کوئی ریڈیو، ٹی وی تو تھا نہیں۔ اس بیکری کے مالک سے کہہ کر میں نے ٹائم میگزین منگوانا شروع کر دیا تھا۔

اوبرکال باخ میں ایک چھوٹا سا بنک تھا۔ سرکار نے اس میں ہمارے اکاؤنٹ کھلا کر ہمیں کارڈ دے دیئے۔ بنک میں ہماری سوشل ہیلپ کی رقم آ جاتی اور وہاں سے ہم حاصل کر لیتے۔ اسی طرح سرکار نے ہمیں گرم کپڑے اور جوتے خریدنے کے لیے بھی رقم مہیا کر دی تھی۔ دس پندرہ میل کے فاصلے پر Calw (کالو) ضلعی صدر مقام تھا۔ اچھا شہر تھا۔ وہاں ہمارے سرکاری ادارے بھی تھے اور شاپنگ سنٹر بھی، سکول بھی وہیں تھے۔ ہمارے گاؤں کے بچے صبح ایک بس سے ''کالو'' جاتے اور دوپہر کو واپس

آتے۔ہم سب سودا سلف وہیں سے خرید کر لاتے۔ کالو میں دو تین احمدی دوست تھے۔ کلیم احمد صاحب فیملی کے ساتھ رہتے تھے اور وہ ہمیں ملنے آتے رہتے۔ کچھ عرصہ بعد قریبی دیہات میں اور احمدی دوست بھی پاکستان سے آ کر ہماری طرح رہنے لگے تھے۔اس طرح ہم مل کر جمعہ پڑھنے لگے۔ پھر وہاں جماعت قائم ہوگئی اور میں اس جماعت کا پہلا صدر منتخب ہوا۔

سوشل آفس کی طرف سے گاڑی کی اجازت

جتنی ہماری کوشش اور خواہش تھی کہ بچوں کے قریب رہیں۔قدرت نے اُتنا ہی ہمیں اُن سے دُور کر دیا تھا۔اب ہم بیٹی سے تقریباً پانچ سو کلومیٹر دُور تھے اور دوسری طرف بیٹے تقریباً دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔انہوں نے محکمہ سے اجازت لی اور اپنے دوستوں کے ساتھ پروگرام بنا کر اوبر کال باخ کا چکر لگایا۔عرصہ کے بعد ملے تھے،رات ٹھہرے اور دوسرے روز چلے گئے۔ اُنہوں نے ہماری اس جنگل میں تنہائی پر تشویش اور تعجب کا اظہار کیا۔ پھر کچھ دیر بعد بیٹی نے چکر لگایا تو وہ بھی اس ماحول سے کچھ پریشان ہوئی۔اُن کا خیال تھا کہ اس ماحول میں کم از کم گاڑی تو ہونی چاہیے ہمارے پاس۔ میں خود بھی گاڑی کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹی سی پرانی گاڑی مجھے فوری طور پر خرید دی۔ قانونی طور پر جو سوشل ہیلپ پر گزارہ کر رہے ہوں اُن کو گاڑی رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جس روز گاڑی میرے نام رجسٹرڈ ہوئی اس کے دوسرے روز ہی سوشل آفس کا خط آ گیا کہ میں دفتر آ کر اُن سے ملوں۔

میں گیا تو افسر نے کہا کہ تم نے گاڑی کیسے لے لی ہے۔اس کی تو اجازت نہیں۔رقم کہاں سے لی ہے۔میں نے جواباً وضاحت کی ''جس گاؤں میں مجھے آپ نے رکھا ہے وہاں ڈاکٹر ہے نہ کوئی کیمسٹ۔میری اہلیہ دائم المریضہ ہے۔ہمیں کسی وقت بھی ایمرجنسی پڑ سکتی ہے۔اس پر میرے بچوں نے تشویش کا اظہار کیا ہے اور ہمیں گاڑی لے دی ہے۔اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں تو میں گاڑی فروخت کر دیتا ہوں لیکن اگر کوئی ہرج مرج ہو گیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔''

میری بات سن کر وہ افسر کچھ دیر خاموش رہا۔اس نے پھر کہا کہ میں جا سکتا ہوں۔دوسرے روز ہی مجھے اس کا خط مل گیا کہ اہلیہ کی صحت اور اس گاؤں کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر گاڑی کی اجازت دی جاتی ہے۔

گاڑی کی اجازت کا یہ پروانہ بہت مفید ثابت ہوا۔اس کے بعد یہاں ریکلنگ ہاؤسن (Recklinghausen) میں بھی سوشل آفس کی طرف سے دو بار مجھے گاڑی رکھنے پر باز پرس ہوئی اور اسی پروانے کی بنیاد پر میں نے وضاحت کی اور اُن سے اجازت لی۔میرے خیال میں مجھے اس ویرانے میں رکھنے کی حکمتوں میں سے ایک یہ بھی حکمت تھی۔ میں نے ہمیشہ گاڑی رکھی اور اپنے نام پر رکھی۔ ورنہ عام طور پر سوشل ہیلپ لینے والے لوگ اگر رکھتے ہیں تو کسی دوسرے کے نام سے رجسٹر کرواتے ہیں۔

مسٹر ھوپے (Hoppe) -ایک سرگرم عیسائی دوست

اس تین منزلہ عمارت کی زمینی منزل پر ایک کنڈرگارٹن تھا۔ساتھ ہی میاں بیوی دو ٹیچر رہتے تھے جو اس سکول کو چلاتے

تھے۔اُن سے ہمیں وہاں کے رسم ورواج اور زبان کے ہلکے پھلکے فقرات سمجھنے میں مدد ملی۔درمیانی منزل پر انتظامیہ کے دفاتر تھے۔ گویا وہ کمیٹی گھر تھا۔انتظامیہ کا صدر مسٹر ہینسن (Henssen) اچھا ملنسار آدمی تھا۔کبھی کبھی ہمارے پاس آتا تو اچھی معلومات کا تبادلہ ہوتا۔کوئی رہائشی مسئلہ ہوتا تو فوراً حل کر دیتا۔

ایک روز رات نو دس بجے مجھے ہلکی سی میوزک کی آواز سنائی دی۔میں حیران تھا کہ دفاتر اور سکول تو اس وقت بند ہیں۔یہ میوزک کون بجا رہا ہے۔میں آہستہ آہستہ نیچے اُترا تو درمیانی منزل پر ایک کمرے میں پندرہ بیس مرد عورتیں بیٹھی تھیں۔ہاتھ میں سب کے بائیبل تھی اور ایک درمیانی عمر کا وجیہہ شخص ستار پر زبور کے گیت گا رہا تھا۔

مجھے دیکھا تو انہوں نے اندر آنے کو کہا۔میں بیٹھ گیا۔گیت کے بعد اس شخص نے پھر کوئی تقریر شروع کر دی۔آخر میں مَیں نے اپنا تعارف کرایا اور انہوں نے بتایا کہ وہ اس بستی اور گرد ونواح کے باسی ہیں۔اور ہر اتوار کو یہاں اکٹھے ہو کر بائیبل سٹڈی کرتے ہیں۔میں نے کچھ دلچسپی ظاہر کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔اُن کا مقرر میرا اچھا دوست ثابت ہوا۔اس کا نام مسٹر ''ھوپے(Hoppe)'' تھا۔ہم سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر اس کا اچھا وسیع گھر تھا۔کسی فرم میں اچھے عہدہ پر تھا۔اور سب سے اچھی بات یہ کہ وہ اچھی انگریزی بولتا تھا۔

ہم بائیبل کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے۔وہ اسلام، پاکستان اور افریقہ کے بارے میں مجھ سے سوال کرتا رہتا۔وہ دعا کا بہت قائل تھا اور اپنے حلقے میں اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے مسائل دعا کے ذریعہ حل کرتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ حضرت مسیح سے اُس کا تعلق ہے اور وہ مسیح کے ذریعہ دُعا کر کے بیماروں کو اچھا کر دیتا ہے۔چند ماہ بعد جب مجھے پتہ میں پتھری کی وجہ سے درد ہوئی تو اُس نے مجھ سے دعا کرنے کی اجازت مانگی۔میں نے کہا کہ کرو دعا، میری درد بڑھتی گئی اور پھر ایمبولنس منگوائی گئی اور ہسپتال میں اپریشن کا فیصلہ ہوا۔اپریشن سے ایک روز پہلے وہ میرے کمرے میں آیا اور پھر اجازت مانگی کہ وہ دعا کے ذریعہ اپریشن ٹلا دے گا لیکن اس کی دُعا کے باوجود اپریشن کروانا پڑا تھا۔

باوجودیکہ اس سے اختلافی مسائل پر گرما گرم بحث ہوتی تھی وہ میرا بڑا ہمدرد تھا اور ہر طرح میری مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ مجھے جلدی سے جلدی یہاں کسی ہسپتال میں جاب مل جانی چاہیے۔وہ مجھے صوبہ کی ہیلتھ منسٹری میں لے کر گیا اور کچھ فاصلے پر Tropical بیماریوں کا ہسپتال تھا وہاں بھی لے کر گیا اور چیف میڈیکل افسر سے ملایا تھا۔جب ہم اوبر کال باخ (Oberkollbach) سے بالآخر رخصت ہوئے تو اُس نے تحائف دے کر ہمیں الوداع کیا تھا۔

ماما لافلر(Mama Lofler) اور ماما میڈر(Mama Madeor)

یوں تو بستی کے سب لوگ ہی ہم سے اچھی طرح پیش آتے لیکن دو عمر رسیدہ خواتین نے ہمارا خاص خیال رکھا۔ماما لافلر کا سن ستّر سے اُوپر ہوگا۔اسے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ پناہ گزین آئے ہیں تو وہ کیک لے کر ہمیں خوش آمدید کہنے ہمارے پاس آئی۔

اہلیہ سے بڑے پیار سے ملی۔ پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ زبان کی مشکل کے باوجود ہم نے آپس میں سمجھ سمجھا لیا تھا۔ کچھ دن بعد وہ پھر آئی اور گرم کپڑے لے کر آئی اور ساتھ ہی ہمیں اپنے گھر دعوت دی۔

ہم گئے تو چائے کیک کے ساتھ اس نے ہماری تواضع کی۔ اس کا خاوند مسٹر لافلر بہت خوش مزاج انسان تھا۔ وہ جنگ عظیم میں سپاہی کے طور پر لڑا تھا۔ جنگ کے بعد اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا اور وہ چرچ میں پادری بن گیا اور اب بڑھاپے میں وہ گھر پر ہی رہتا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں جو افریقہ کے کسی ملک میں Nuns کے طور پر کام کرتی تھیں۔ چھٹی پر گھر آتیں تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

ماما میڈر کی عمر اسّی کے قریب تھی۔ تاہم وہ نہ صرف اپنے گھر کے سارے کام کاج خود کرتی بلکہ گاڑی بھی چلاتی تھی۔ وہ اُستانی کے طور پر سکول میں کام کرتی رہی تھی۔ انگریزی جانتی تھی اور بعض بچوں کو انگریزی سیکھنے میں مدد دیتی تھی۔ اس لحاظ سے اُس سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ وہ ہمیں اکثر چائے پر بلاتی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ وہ جرمن زبان ہمیں سکھانے کی کوشش کرتی۔ دو دفعہ ہمیں وہ اپنی گاڑی میں دوسرے شہروں میں اپنے عزیزوں سے ملانے لے کر گئی۔ جب میری بیٹی ہمیں ملنے آتی تو وہ خاص طور پر ہمیں چائے پر بلاتی۔ میز کو موم بتیوں سے سجا کر بڑے فخر سے بتاتی کہ یہ کیک میں نے خود اپنے باغیچہ سے سیب توڑ کر بنایا ہے۔ انگریزی، جرمن سے ملی جلی اچھی خوشگوار محفل ہو جاتی۔ اس موقع کی ویڈیو ابھی تک ہمارے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے اس اُداسی اور تنہائی کے دَور میں ہماری پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کی اور اچھا سلوک کیا تھا۔

کالا سیاہ جنگل یا سبز و سفید جنت

اتوار کے روز میں دیکھتا کہ اردگرد کے بعض الگ تھلگ گھروں میں کچھ خاص رونق سی ہو جاتی۔ کئی گاڑیاں کھڑی ہوتیں۔ لوگ اندر باہر آتے جاتے۔ ایک روز میں نے کنڈرگارٹن کے اس ٹیچر سے پوچھا کہ یہاں اتوار کو کیا ہوتا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ علاقہ شوارز والڈ (Schwarz Wald) (سیاہ جنگل) کہلاتا ہے۔ آب و ہوا کی صفائی اور فضا کی لطافت کے لحاظ سے یہ صحت افزا علاقہ ہے۔ بعض مریضوں کو ڈاکٹر اس علاقے میں دو چار ماہ گزارنے کا مشورہ دیتے ہیں تو اُن کے لواحقین یہاں ہزاروں خرچ کر کے مکان کرائے پر لیتے ہیں اور اپنے مریضوں کو یہاں رکھتے ہیں۔ پھر اتوار کے روز یہ اپنے مریضوں سے ملنے آتے ہیں۔ یہ ملک کا مہنگا ترین علاقہ ہے اور دُور دُور سے مریض یہاں آتے ہیں۔"

میں نے یہ سنا تو ذہن میں مری، شملہ اور ڈلہوزی ایسے نام اُبھرے۔ ایبٹ آباد تو میں نے دیکھا بھی تھا۔ میں نے سوچا جس کو میں سزا سمجھا تھا وہ کہیں جزا ہی نہ ہو۔ شاید خدا نے مجھے یہاں افریقہ کی بیس سالہ گرد و گرمی کی اثرات دُور کرنے کے لیے ہی بھیجا ہو۔ میرا تو ڈاکٹر بھی وہی ہے اور "لواحقین" بھی وہی۔ یکا یک مجھے اپنی صحت بہتر محسوس ہونے لگی۔ میں نے اہلیہ سے کہا "یہ

پریشان ہونا چھوڑو اور یہاں اپنے قیام کی قدر کرو۔ شام کو میرے ساتھ سیر پر چلا کرو۔ یہاں تو ہمیں اپنی صحت افزا کرنے کے لیے رکھا گیا ہے۔''

اس کے بعد ہم باقاعدہ شام کو سیر پر نکل جاتے۔ میں نے تو جوگنگ بھی شروع کر دی تھی۔ گاڑی ملی تو میں نے صاف ستھری چھوٹی چھوٹی سڑکوں کے سرسبز وادیوں میں بچھے جال پر گھوم کر علاقہ دیکھنا شروع کیا۔

ہر سو سہانا سماں تھا اور ہر طرف دلکش نظارہ، قدرتی حسن سے مالا مال یہ جنگل تو جنت کا ٹکڑا نظر آتا تھا جو گرمیوں میں درویشوں کا سبز چولہ پہنچ لیتا تھا تو سردیوں میں حُوروں کا سفید لباس۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ جرمنی آتے ہی ہمیں وہاں سوا سال قیام نصیب ہو گیا۔ بعد میں ہم کئی بار بیٹوں کے پاس گئے تو ایلپس پہاڑوں کی بھی سیر ہو جاتی رہی۔

اوبرکال باخ کے قیام کے دوران قدم قدم پر بلوچستان کے ''احمد وال'' کا زمانہ یاد آتا رہا۔ حالات و واقعات میں بعض اوقات مماثلت اتنی گہری اور نمایاں ہوتی کہ یوں لگتا جیسے اُس زمانے کی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی شوٹنگ اب دوبارہ یورپ میں رنگین فلم پر ہو رہی ہو۔ وہی کہانی تھی اور وہی کردار۔ اب ماحول ذرا ماڈرن تھا اور صحرائے تھل کی جگہ کالا جنگل۔ بچوں کو بھی شاید اسی لیے ہم سے دُور رکھا گیا کہ ''سین پارٹ'' بدل نہ جائے۔

جرمن زبان کا کورس

احمد وال کی تنہائی میں اگر دینی کتب کے مطالعہ کی توفیق ملی تھی تو یہاں کی تنہائی میں جرمن زبان سیکھنے کا موقع میسر آ گیا۔ اوبرکال باخ میں آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ محکمہ ملازمت (آربائٹس اُمٹ-Arbeitsamt) کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ میرا نام اس کلاس میں شامل کر لیا گیا ہے جو چند روز بعد ہی شروع ہونے والی تھی۔ مجھے کہا گیا کہ میں کالو (Calw) جا کر سکول سے دیگر ضروری معلومات حاصل کر لوں۔

ہفتہ میں پانچ دن صبح آٹھ سے دو پہر ایک بجے تک کلاس ہوتی۔ چھ ماہ کا کورس تھا۔ دوسرے سب طلباء اور طالبات روس اور مشرقی یورپ سے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کورس اُن واپس آنے والوں کے لیے تھا جن کے والدین جنگ عظیم کے دوران جرمنی سے مشرقی یورپ ہجرت کر گئے تھے۔ مجھے بھی انہی میں سے سمجھ لیا گیا تھا۔ گھر سے سکول تک آنے جانے کا خرچہ دیا جاتا اور کھانے پینے کی رقم الگ آنے لگی تھی۔ پھر جرمنی کی مشہور ہیلتھ انشورنس کمپنی ''Aok'' نے لکھا کہ کورس کے دوران میری ہیلتھ انشورنس اُن کے ذریعہ ہو گی اور مجھے کہا گیا کہ میں اپنا مکمل طبّی معائنہ کرواؤں۔

میرے چھوٹے بیٹے عطاء القدوس کو بھی Calw میں ہی ایک بچوں کے سکول میں داخلہ مل گیا۔ اس طرح ہم دونوں باپ بیٹا صبح بستی کے دوسرے بچوں کے ساتھ بس سے Calw جاتے اور ڈیڑھ بجے واپس آتے۔ چھ ماہ بعد امتحان ہوا۔ اکثر ہم میں سے پاس ہو گئے لیکن میں ان چھ سات طلباء میں سے تھا جن کے بارے میں سمجھا گیا کہ پیشہ وارانہ ضرورت کے لحاظ سے

معیار تسلی بخش نہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے مزید چار ماہ کا کورس تجویز کیا گیا۔ اس طرح دس ماہ کے بعد میں کلاس میں دوسری پوزیشن لے کر پاس ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہوا کہ جرمن زبان کے حوالے سے جو دہشت میرے سر پر سوار تھی اس کا علاج آتے ہی کر دیا۔ اب زندگی یہاں آسان ہو گئی اور دلچسپ بھی۔ دبے اور خاموش جذبات کو آواز مل گئی اور کہہ سکتا تھا

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

معدے کے اُلسر اور پتّے کی پتھری کا علاج

زبان کی مشکل دور کرنے کے ساتھ ساتھ خدا نے وہاں بعض دیرینہ جسمانی عوارض کا بھی علاج فرما دیا تھا۔ نائیجیریا میں قیام کے دوران مجھے معدے میں سوزش کی تکلیف ہو گئی تھی۔ جس کا علاج برسوں ہوتا رہا۔ بار بار تکلیف عود کر آتی تھی۔ یہاں جرمنی آ کر بھی تکلیف ہوئی اور ہالٹرن میں ہسپتال میں بھی چند دن داخل ہونا پڑا تھا۔ وہاں بتایا گیا کہ معدے میں اُلسر ہے اور کچھ خون بھی رِس رہا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بتایا کہ تمہارے پتہ میں پتھری بھی ہے جو فی الحال تو کوئی تکلیف نہیں دے رہی لیکن کسی وقت بھی مسئلہ بن سکتا ہے لہٰذا کسی مناسب وقت پر تکلیف سے پہلے ہی اس کا اپریشن کروا لینا۔

معدے کا اُلسر دو تین ہفتہ میں خدا کے فضل سے مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا اور میں اپنی زبان کی کلاس میں جاتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ امتحان کے دو ہفتہ بعد میں پتہ کا اپریشن کروا لوں گا لیکن یہ دو ہفتہ کا آرام اس ''ٹریننگ سنٹر'' میں شاید تضیع اوقات تھا۔ امتحان کے دوسرے روز ہی میرے پیٹ میں سخت درد شروع ہو گیا۔ میں معدے کا درد ہی سمجھتا رہا اور دوا کھاتا رہا لیکن تکلیف بڑھتی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے کچھ دوا دی۔ ٹیکہ لگایا اور ساتھ ہی کہا کہ اگر آرام نہ آئے تو ایمبولینس بلا کر ہسپتال چلے جانا۔ مغرب کے قریب ایمبولینس بلائی اور ہسپتال جا کر معلوم ہوا کہ پتّے کی پتھری نے ٹیوب کو بلاک کر دیا ہے لہٰذا اپریشن کے سوا چارہ نہیں۔ دوسرے روز ٹیسٹ وغیرہ ہوتے رہے۔ معلوم ہوا کہ ٹیوب بلاک ہونے سے جگر پر بُرے اثرات شروع ہو گئے ہیں۔ آنکھوں میں یرقان بھی ہلکا سا دیکھا جا سکتا تھا۔ اگلے ہی روز صبح سب سے پہلے میرا اپریشن ہوا۔

چھ انچ لمبا کٹ دیا تھا لہٰذا ٹھیک ہونے میں وقت لگا۔ دو ہفتہ میں ہسپتال کے اندر چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ وہیں مجھے انشورنس کمپنی کا خط بیٹے نے لا کر دیا، لکھا تھا کہ تمہارا زبان کا کورس ختم ہو چکا ہے۔ کورس ختم ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ بعد تمہاری انشورنس ختم ہو جائے گی۔ ہفتہ بعد ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر میں گھر آ گیا۔ جس تاریخ کو ڈسچارج ہوا وہ وہی تھی جو انشورنس کے خط میں آخری تاریخ لکھی تھی۔ تب مجھے سمجھ آئی کہ امتحان کے بعد دو ہفتے آرام کرنے کی مہلت مجھے کیوں نہ ملی اور یہ درد دوسرے روز ہی کیوں شروع ہو گیا تھا۔

علمی اور ادبی جمود کا علاج

اس جنگل کے ایک سالہ قیام کے دوران جہاں خدا نے جرمن زبان سکھائی اور جسمانی عوارض کا علاج کیا۔ وہاں اُس

نے اس علمی اور ادبی جمود کو بھی توڑا جو گزشتہ چند سال سے ذہن میں جڑ پکڑ گیا تھا۔ نائیجیریا کے آخری چند سال جو کانو میں گزرے وہ ہنگامہ خیز اور پریشان کُن تھے۔ اس دوران کسی تقریر و تحریر کا موقع ملا تھا نہ کسی تبلیغی نشست کا۔ یہاں جرمنی میں آئے تو کچھ ایسا ہی خیال تھا کہ عملی زندگی تو بس افریقہ تک ہی تھی۔ یہاں جرمنی میں تو بس بقیہ ایام زندگی صرف یادِ الٰہی میں گزارنے ہیں۔ عملی لحاظ سے کسی تحریر، تقریر یا تبلیغ کا امکان تو دُور دُور تک نظر نہ آتا تھا۔ ایسی کوئی اُمنگ کبھی سر اُٹھاتی بھی تو زبان کی مشکل اور ''ازیل'' اور رہائش وغیرہ کے پریشان کن مسائل اس کو وہیں دبا دیتے۔ بڑی جماعتوں میں شامل ہو کر انسان پھر کچھ دیکھا دیکھی بہاؤ میں آ جاتا ہے لیکن اُس کالے جنگل میں پہاڑ کی چوٹی پر تو ماضی کی تقریر و تحریر کی یادیں بھی مدھم پڑنے لگی تھیں۔ لیکن پھر خدا تعالیٰ نے وہاں اس پہلو سے بھی ذہن کی صفائی اور زنگ کی دھلائی کے سامان پیدا فرما دیئے۔ آخر خدا لے کر گیا تھا اُس صحت افزا مقام پر، کسر کیسے رہ جاتی۔

تقاریر کے مواقع

میں صدر جماعت تھا لہٰذا ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں آباد پاکستانی دوستوں سے رابطہ رہتا تھا۔ جمعہ بھی اُنہی میں سے ایک دوست کے ہاں ہوتا۔ کلیم احمد صاحب سب سے پرانے کالو (Calw) میں رہنے والے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ صوبہ کا صدر مقام سٹٹ گارٹ (Stutgart) تقریباً پچاس میل دُور ہے۔ وہاں جماعت کا سنٹر تھا جہاں مربی سلسلہ مکرم ڈاکٹر عبدالغفار صاحب مقیم تھے۔ ہم وہاں گئے۔ مربی صاحب سے تعارف ہوا، جماعتی حالات کا علم ہوا اور واپس آتے ہوئے کچھ جماعتی لٹریچر لیتا آیا۔

کچھ عرصہ بعد اطلاع ملی کہ سٹٹ گارٹ میں سیرت النّبی کا جلسہ ہو رہا ہے اور مجھے اس میں تقریر کرنی ہوگی۔ چنانچہ میں نے تیاری کی اور ''صداقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از روئے بائیبل'' کے موضوع پر تقریر کی۔ اس جلسہ کی یادگار تقریر مکرم ڈاکٹر نعیم احمد طاہر صاحب کی تھی جنہوں نے دُرود کی اہمیت پر نہایت ایمان افروز تقریر کی تھی۔ بہت دل گداز انداز سے دُرود کی اہمیت و افادیت بیان کی تھی۔ آج تک یاد آتی ہے۔

سکول کی دو تین چھٹیاں آئیں تو ہم ہالٹرن میں بیٹی کے پاس گئے۔ وہاں ریجن کی جماعتوں نے ایک ہال میں جرمن اور دوسرے غیر احمدی دوستوں کو بلا کر سوال و جواب کی محفل کا بندوبست کیا ہوا تھا اس میں مجھے تقریر کے لیے کہا گیا اور سوالوں کے جواب بھی دیئے۔

اس طرح اس جرمن کورس کے دوران اللہ تعالیٰ نے کچھ تقریر کے مواقع پیدا کر دیئے۔ تحریری میدان میں تو خدا تعالیٰ اچھے خاصے امتحان میں سے گزار کر واپس لایا تھا۔

جرمنی میں پہلی تحریر۔جلسہ سالانہ جرمنی کے لیے متبادل تقریر کی تیاری

جرمن زبان کی کلاس میں جاتے ہوئے مارچ ۱۹۹۱ء میں مجھے پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ٹیچر کی طرف سے گھر کا کام اب مشکل سے مشکل تر ہو گیا تھا۔ دو پہر کو سکول سے واپس آتا اور شام کو گھر کا کام لے کر بیٹھ جاتا۔ اِنہی دنوں مجھے مبلغ انچارج جرمنی مکرم مسعود احمد صاحب جہلمی کا خط ملا۔لکھا تھا کہ اگست میں ہونے والے جرمنی کے جلسہ سالانہ کے لیے مجھے متبادل مقرر چنا گیا ہے۔ جون تک میں تقریر تیار کر کے بھیج دوں تاکہ ترجمہ ہو سکے۔موضوع جو دیا گیا تھا وہ تھا ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تبلیغ''

محترم جہلمی صاحب سے میں کالج کے زمانے سے واقف تھا۔ بعد میں اُن کی شادی بھی وزیرآباد میں ہوئی جو میرا بھی سسرال تھا۔ یہاں جرمنی آکر میں ان سے فرینکفرٹ میں مل چکا تھا۔لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے بارے میں اس قدر خوش فہم واقع ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ وہ مجھے تو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس وقت میں کہاں اور کیسا پھنسا ہوا ہوں۔ میرے پاس ایسی تقریر کی تیاری کے لیے وقت تھا نہ سکت تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موضوع ایسا انوکھا اور انجانا تھا کہ بہت غور وفکر اور مطالعہ کا تقاضہ کرتا تھا۔ کتابیں کہاں سے لوں۔کب پڑھوں، کیا لکھوں، کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ایسے کسی موضوع پر کوئی تقریر یا تحریر سنی پڑھی یاد نہ آتی تھی۔

معذرت کرنے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے معذرت کا خط لکھا لیکن دوسرے روز سکول جاتے ہوئے میں خط کو پوسٹ کرتے کرتے رُک گیا۔سوچا ''پہلے کب تم نے کبھی اپنی خوشی اور مرضی سے کوئی تقریر کی یا تحریر لکھی ہے، اسی طرح دباؤ میں آکر ہی کچھ کر گزرتے رہے ہو۔اب بھی اپنی سی کوشش کر دیکھو۔ یہ معذرت کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔''

کچھ دن سوچتا رہا۔ایک دوست کو ساتھ لیا ور سٹٹ گارٹ جا کر مربی صاحب مکرم ڈاکٹر عبدالغفار صاحب سے ملا۔ ان سے اپنی مشکل بیان کی۔مشورہ کیا اور اُن سے چند کتب مستعار لیں اور واپس آکر مطالعہ کرنے لگا۔ دو ماہ کا وقت تھا۔ آہستہ آہستہ پڑھتا لکھتا رہا۔سوچ و بچار کے لیے کھڑکی سے پہاڑوں اور وادیوں کا پرسکون سکوت منظر میسر تھا۔ چھت کے قریب اُس لکڑی کے مخروطی سے کمرے میں جرمن، اردو کتابوں اور کاغذوں میں گھرا میں اپنے آپ کو اُس راہب کی طرح محسوس کرتا جو پہاڑ کی چوٹی پر کسی خانقاہ میں بیٹھا پرانے صحائف میں دبا ہو۔

ڈیڑھ دو ماہ کے بعد میں نے جو کچھ ہو سکا لکھ کر بھیج دیا۔اور پھر میں اصل مقرر کی خیر خیریت کی دعا کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میں موضوع سے انصاف نہیں کر پایا۔ وہ اس قابل نہ تھا کہ معزز سامعین تک پہنچتا اور نہ ہی میں اپنے آپ کو اس لائق سمجھتا کہ اُن کا سامنا کر پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی۔اس خلوت میں وہ دو ماہ کی لکھائی پڑھائی میرے جمود کو توڑنے کے لیے بہت کافی تھی۔تاہم چند سال بعد کولون میں ایک سیرت النبی کے جلسہ میں اس مضمون کو پیش کرنے کی توفیق مل گئی تھی۔اور پھر تبلیغی جمود کے لیے ایک اور امتحان آ گیا۔

جرمنی میں پہلی تبلیغی گفتگو-امریکن اور کوریّن منّادوں کے ساتھ مباحثہ

سٹٹ گارٹ کے نواحی بستی وائب لِنگن (Weiblingen) میں جماعت کے اچھے مخلص دوست رہتے تھے۔ یہوواوٹنس (Yahowa Witness) وہاں ان کے پاس اکثر آتے اور اُن سے بحث کرتے تھے۔ جرمن زبان اچھی طرح نہ جاننے کے سبب سے ہمارے دوست کچھ مشکل محسوس کرتے۔ ویسے بھی اس فرقہ کے لوگ کٹڑ تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ہمارے دوستوں نے اُن سے کہہ دیا کہ تم کوئی انگریزی بولنے والا اپنا آدمی لاؤ۔ ہم بھی کسی انگریزی بولنے والے کو بلا لیتے ہیں۔ اس طرح ذرا کھُل کر اختلافی مسائل پر بات کرلیں گے۔ چنانچہ وہ راضی ہوگئے اور تاریخ اور وقت مقرر ہوگیا۔ ہمارے دوستوں نے مربی سلسلہ مکرم ڈاکٹر عبدالغفار صاحب سے اس مناظرے کا ذکر کیا اور کہا کہ کسی انگریزی بولنے والے احمدی کا بندوبست کریں جو اُن سے بات کر سکے۔

یہ پس منظر ہے اس پیغام کا جو مکرم ڈاکٹر عبدالغفار صاحب کی طرف سے مجھے ملا۔ پیغام میں مجھے کہا گیا تھا کہ میں وقت مقررہ پر وائب لِنگن پہنچ کر عیسائیت کے نمائندوں سے بات کروں۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ عیسائیوں سے ایسی گفتگو کئے برسوں گزر چکے تھے۔ مہارت رہی تھی نہ حوالے یاد تھے۔ اور پھر وہاں افریقہ میں تو عام لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہاں یورپ میں اُونچے درجہ کے ماہرین سے اچانک مُٹھ بھیڑ ہورہی تھی۔ جوں جوں میں سوچتا میرا پتہ پانی ہورہا تھا۔ (اس وقت تک میرے پتّے کا اپریشن نہیں ہوا تھا۔) معذرت کرنے کا خیال آیا لیکن دل کہہ رہا تھا "تیرے پاس کوئی راہِ فرار نہیں، وقت مقرر ہو چکا ہے۔ حکم مل چکا ہے، صرف تین دن باقی ہیں، کچھ بھی ہو تجھے جانا ہوگا۔"

اُس اتوار کو بعد دوپہر میں نے گاڑی نکالی اور روانہ ہوگیا۔ بیگ میں ایک بائیبل اور چند پمفلٹس تھے۔ وائب لِنگن کا ایڈریس دکھا کر لوگوں سے راہ پوچھتا میں عین وقت پر ہی پہنچ سکا۔ دوست بے چینی سے منتظر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آئے بیٹھے ہیں، ایک امریکن ہے اور دوسرا کوریّن۔ میں نے وضو کیا، دعا کی اور اندر چلا گیا۔

اندر بڑی سی میز پر وہ دونوں موٹی موٹی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ ایسے مصروف تھے جیسے کسی امتحان کی تیاری کر رہے ہوں۔ ایک دوسرے کو کچھ بتا سمجھا بھی رہے تھے دبی زبان میں۔ انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے آرام سے بیٹھ کر اُن کو سلام کر کے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر ہلکی پھلکی تعارفی سی باتیں شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ میں نے اُن کے عقائد کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ وہ بتاتے رہے اور پھر گفتگو کا انداز یہ ہوگیا کہ میں سوال کرتا اور وہ جواب دیتے۔ میں اعتراض کرتا اور وہ وضاحت کرتے۔

ایسے مباحثوں میں اگر حوالے تلاش کرنے پڑیں تو بڑی بدمزگی ہوتی ہے۔ وقت ضائع ہوتا ہے، گفتگو کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور استدلال کمزور پڑ جاتا ہے اور مجھے اسی بات کی سب سے بڑی گھبراہٹ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے میری اس کمزوری کا علاج عجب

انداز سے کیا۔ میں انکے جواب کے توڑ میں بائیبل کے حوالے کا ذرا ذکر کرتا تو کوریّن فوراً حوالہ نکال کر پڑھ دیتا۔ میں اُن کی وضاحت کو رڈ کرنے کے لیے بائیبل کے حوالے کا اشارہ ہی کرتا تو وہ کوریّن اصل حوالہ پیش کر دیتا۔ پتہ نہیں یہ اس کوریّن کی سادگی تھی یا دیانت داری، بہرحال بائیبل کا وہ بہت ماہر تھا۔ گفتگو کے دوران یوں لگتا تھا جیسے وہ اُس امریکن کا مددگار کم اور میرا معاون زیادہ ہو۔ اڑھائی گھنٹے کی بحث کے دوران مجھے اپنے بیگ کو کھولنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ میں میز پر ہاتھ رکھے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عقلی اور نقلی دلائل سے اُن کے عقائد کی خامیاں بیان کرتا رہا اور اُن کی وضاحتوں کو توڑتا رہا۔ اور وہ گھبرا کر نئی وضاحتوں کی تلاش میں بائیبل کی ریفرنس بُک اور کنٹری کے ورق اُلٹ پلٹ کرتے رہے۔

مسیح کا ابن اللہ ہونا

وہ اپنے بیان میں مسیح کو ''خدا کا بیٹا'' کہتے۔ میں نے شروع میں ہی اس بات کو پکڑ لیا اور کہا کہ یہ تو بائیبل کی ایک اصطلاح ہے جو خدا کے نبیوں، ولیوں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ بائیبل میں یہ الفاظ دوسرے انبیاء کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً اسرائیل اور سلیمان کے لیے۔ حوالے کوریّن نے نکال دیئے۔ امریکن نے وضاحت کی کہ وہاں یہ الفاظ اور مفہوم رکھتے ہیں اور مسیح کے لیے اور رنگ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا

مسیح کو علم تھا کہ یہ الفاظ پہلے عمومی رنگ میں استعمال ہو چکے ہیں اور یہ کہ وہ خصوصی طور پر خدا کا بیٹا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہ وضاحت کرتا کہ وہ خصوصی طور پر خدا کا بیٹا ہے۔ لیکن نہ صرف اس نے کوئی وضاحت نہیں کی بلکہ اس کے برعکس اپنے آپ کو ''ابن آدم'' کہہ کر لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ابنِ آدم کیوں کہتا تھا۔ کیا وہ جھوٹ بولتا تھا۔ اب میں کس کی بات مانوں؟ مسیح کی یا آپ لوگوں کی؟

جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے پوچھا:

''وہ خدا کا جسمانی بیٹا تھا یا روحانی''

امریکن نے کچھ سوچ کر جواب دیا ''روحانی''

میں نے فوراً اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ پھر تو کوئی پرابلم نہیں۔ ہم بھی روحانی بیٹے بن سکتے ہیں اور خدا ہمارا بھی باپ بن سکتا ہے۔ طریقہ حضرت مسیح نے ہی بتایا ہے۔ متی کی انجیل میں ہے کہ

''تم اگر لوگوں کے گناہ معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ تم کو معاف کرے گا۔''

پورا حوالہ کوریّن نے پڑھ دیا۔ اس سے پہلے لکھا ہے کہ ''تم دعا کیا کرو۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان میں ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔'' (متی باب ۶:۹،۱۴)

میں نے پوچھا مسیح خدا کو اپنا باپ بھی کہتا ہے اور دوسروں کا باپ بھی کہتا ہے۔ کہاں گئی وہ خصوصیت جو مسیح کو خاص

ابن اللہ بناتی ہے، وہ خاموش رہے۔

گناہوں کی معافی اور کفّارہ

پھر میں نے کہا کہ یہی آیت کفارہ کا مسئلہ بھی حل کر دیتی ہے۔ مسیح کہتا ہے کہ اگر تم لوگوں کے گناہ معاف کرو گے تو خدا تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ مسیح نے کسی کفارہ یا اپنی قربانی کا ذکر نہیں کیا گناہوں کی معافی کے لیے۔ اس پر اچھی بحث شروع ہوگئی۔ انہوں نے اپنا مروّجہ عقیدہ بیان کیا کہ خدا نے بھیجا ہی بیٹے کو اس لیے تھا کہ وہ انسان کے گناہوں کے کفّارہ کے طور پر قربانی دے اور اس نے صلیب پر مر کر قربانی دی۔

میں نے اُن سے بڑے دوستانہ انداز سے کہا کہ جو آپ نے بیان کیا ہے وہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ آیئے اب دوسرا رُخ بھی دیکھتے ہیں۔ آج سے دو ہزار سال پہلے ایک واردات ہوئی تھی۔ اس کے حقائق جاننے کے لیے ہمیں جذبات سے ہٹ کر واقعات پر غور کرنا چاہیے۔

پھر میں نے واقعہ صلیب سے پہلے اور بعد کے واقعات ترتیب وار بیان کرنے شروع کیے۔ اب حوالوں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ میرے بیان کی سر ہلا کر تصدیق کرتے رہے۔ آخر میں مَیں نے کہا کہ یہود نے حضرت مسیح کو قتل کرنے کی سازش اور کوشش کی لیکن خدا نے ایسے لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اُن کی کوشش کو بڑی حکمت سے ناکام بنا دیا۔ خود یہود کو بھی شک ہی تھا اُن کی موت میں۔ اسی لیے وہ پیلاطوس کے پاس گئے تھے کہ پہرہ بٹھا دے اس کی قبر پر۔ عوام میں یہی مشہور تھا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں لیکن حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو اس ''اُوپر والے کمرے'' میں مل کر اور ہاتھ دکھا کر یقین دِلایا تھا کہ میں زندہ ہوں۔

اب امریکن نے کہا کہ بائبل کہتی ہے کہ وہ مر گئے تھے۔

میں نے فوراً کہا کہ بائبل یہ بھی کہتی ہے کہ وہ تیسرے روز زندہ ہو گئے تھے۔ کیا اُن کا تیسرے روز زندہ ہو جانا ہی اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ بظاہر مردہ نظر آتے تھے لیکن حقیقتاً مرے نہ تھے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ حادثات میں کئی لوگ مردہ کے طور پر ہی ہسپتال میں لائے جاتے ہیں اور پھر دنوں بلکہ مہینوں کے بعد وہ ''جی اُٹھتے'' ہیں۔ ایسے مُردوں کا زندہ ہونا تو آج کل عام بات ہے۔ پھر میں نے قدرے جوش سے کہا:

''آپ امریکہ سے آئے ہیں جو دنیا کا سب سے بڑا ترقی یافتہ ملک ہے۔ ہم اب جرمنی میں بیٹھے ہیں جو یورپ کا ترقی یافتہ ملک ہے۔ اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں ایک تیسری دنیا کے پسماندہ ملک سے آ کر اتنی سادہ سی بات بتا رہا ہوں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر کورین نے کہا کہ بائبل کہتی ہے کہ وہ گناہوں کی معافی کے لیے قربان ہونے کے لیے آئے تھے۔ میں نے نرمی سے سمجھایا

دیکھیں قربانی وہ ہوتی ہے جو خوشی اور اپنی مرضی سے دی جائے۔ نہ کہ وہ جو روتے پیٹتے مجبوراً دی جائے۔ متی میں ہے کہ

صلیب سے پہلے رات کوحضرت مسیح نے رو رو کر باپ سے دعا کی تھی کہ یہ پیالہ ٹل جائے۔ اگر وہ آئے ہی جان دینے کے لیے تھے تو پھر یہ دعا کیوں اور کیسے؟اس پر امریکن بول اُٹھا کہ'' آگے یہ بھی ہے کہ مسیح نے کہا تھا کہ'' جیسے تیری مرضی ویسا ہی ہو''

میں نے وضاحت کی:

''بات باپ کی مرضی کی نہیں، بیٹے کی مرضی کی ہے۔ بیٹے نے تو رو رو کر اپنی مرضی بتادی کہ وہ جان دینے کے لیے تیار نہیں اور بار بار باپ سے درخواست کی کہ یہ گھڑی ٹال دے۔ باقی اگر باپ نے اپنی مرضی ٹھونسنا چاہی تو بیٹا کیا کرسکتا تھا۔ پھر تو مجبوری تھی۔ آخری دم تک بیٹا راضی نہ تھا اسی لیے تو اس نے صلیب پر باپ کو پکار کر کہا''ایلی ایلی لما سبقتنی''

پھر میں نے کہا:

''بیٹے کا موت سے اس قدر ڈرنا سمجھ سے باہر ہے۔ ہزاروں لوگ دنیا میں اپنی دنیاوی اغراض کے لیے جان قربان کر دیتے ہیں۔ فوجیوں کو دیکھو، ملک کے لیے کیسے اپنی جانیں نچھاور کرتے ہیں لیکن یہ''خدا کا بیٹا'' اس قدر کمزور اور ڈرپوک نکلا کہ موت سے ڈر کر روتا رہا۔ حالانکہ باپ نے بتایا ہوگا کہ''بیٹا تم اصلی موت نہیں مروگے۔ صرف تین دن کے لیے تم نے وہاں مرنے کا ڈرامہ کرنا ہے۔ جونہی پردے گریں گے، اندھیرا چھائے گا اور تماشائی رخصت ہوں گے تو تم اُٹھ کر میرے پاس آ جاؤ گے۔ لیکن اس عارضی موت کے لیے بھی بیٹا تیار نہ تھا اور خوف زدہ ہو کر روتا رہا۔''

میری یہ بات امریکن کو بہت چُبھی اور وہ پکار اُٹھا:

''نہیں نہیں وہ موت سے ڈر کر نہیں روتا تھا۔ وہ تو انسانوں کے گناہوں کو یاد کر کے رو رہا تھا۔''

میں نے کہا''نہیں وہ موت سے ڈر رہا تھا۔'' اس نے انکار کیا۔ میں نے پھر کہا۔ اس نے پھر انکار کیا۔ جب اس نے تیسری بار کہا کہ''نہیں، ہرگز وہ موت سے نہیں ڈر کر روتا تھا۔'' تو میں نے کورِیّن سے کہا:

وہ عبرانیوں میں پانچویں یا چھٹے باب میں کہیں مسیح کے رونے اور دعا کرنے کا ذکر ہے وہ نکال کر ذرا پڑھنا۔ اس نے حوالہ نکالا اور پڑھا''اس نے اپنی بشریّت کے دِنوں میں زور زور سے پکار کر اور آنسو بہا بہا کر اُسی سے دعائیں اور التجائیں کیں جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا۔ اور خدا ترسی کے سبب سے اُس کی سنی گئی۔''(عبرانیوں باب۵:۷)

میں نے کورِیّن سے دوبارہ پڑھنے کو کہا۔ جب وہ اِن الفاظ پر پہنچا''جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا'' تو میں نے اس کو روک دیا اور خود یہ الفاظ تین دفعہ دہرائے:

''جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا۔'' ''جو اس کو موت سے.......... جو اس کو موت سے..........''

میرا اُن الفاظ کا دُہرانا آخری تنکا ثابت ہوا۔ ٹھپ سے کتابیں بند ہوگئیں اور امریکن نے آگے جھک کر مجھے دیکھا اور پوچھا''یہ بتاؤ تم ہو کون لوگ؟''

میں نے گردن جھکا کر سکون کا سانس لیا اور پھر کرسی سے ٹیک لگائی اور چند لمحات خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا: ''مسیح دوبارہ آ چکا ہے۔ اور اُسی نے ہمیں یہ سب کچھ سکھایا ہے۔ یہ ویسا ہی دَور ہے جیسا پال پیٹر، لوقا، مرقس کا دَور تھا۔ ہم اسی کے پیغام کو دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ امریکہ میں بھی ہمارے مشن ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا کیا آپ نے جماعت احمدیہ کا نام نہیں سنا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے جماعت کے دوستوں سے جو وہاں موجود تھے، کہا کہ ان کو جماعت کا لٹریچر دیں۔ بعد میں ہم نے بے تکلّفی سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھایا۔

زندگی کے سب سے مشکل مناظرے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت سے سب سے آسان اور کامران بنا دیا تھا۔

فالحمد لله علی ذالك وما توفیقی الا بالله العلی العظیم

نیلا پاسپورٹ - آدھی نیشنلٹی

کارلزروئے کے نیشنل آفس (بنڈس آمٹ) نے انٹرویو کے دو ہفتہ بعد میری سیاسی پناہ کی درخواست منظور کر لی تھی۔ اس کے بعد میں بریٹن سے ہوتا ہوا ''اوبر باخ'' نامی اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ گیا۔ یہاں آ کر مجھے میرے وکیل نے اطلاع دی کہ نیشنل آفس کے اس فیصلے کے خلاف سرکاری وکیل نے اپیل کر دی ہے۔ اس طرح میری سیاسی پناہ کی درخواست کی منظوری حتمی فیصلے تک التواء میں پڑ گئی۔ تاہم پہلے فیصلے کے تحت مجھے کچھ سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ جن میں سے ایک اہم سہولت تو یہی جرمن زبان کا کورس تھا۔ جس سے میں فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ دوسری اہم سہولت ملک میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی جو اگر فیصلہ میرے خلاف ہوتا تو نہ ہوتی اور میں اپنی ضلعی حدود تک محدود ہو کر رہ جاتا۔ اس اجازت کی بدولت میں جرمنی کے جلسہ سالانہ میں شامل ہوا۔ اسی طرح دیگر اردگرد کے شہروں میں بھی جاتا رہا۔

کئی ماہ تک کیس اُوپر کی عدالت میں پڑا رہا۔ پھر من ہائیم کی عدالت سے بلاوا آیا، ہم گئے۔ سماعت ہوئی اور جون ۱۹۹۱ء میں پھر خدا کے فضل سے فیصلہ ہمارے حق میں آیا۔ اس فیصلہ کو حتمی فیصلہ قرار دیا گیا اور اس کے خلاف سرکار کو اپیل کا حق نہ دیا گیا تھا۔ اس طرح ہم جرمنی کے نیلے پاسپورٹ کے حقدار قرار پائے جس کو آدھی نیشنلٹی ہی سمجھا جاتا ہے۔ اب ہمیں یہاں سیاست کے سوا تقریباً سارے شہری حقوق حاصل ہو گئے۔ اس پاسپورٹ پر ہم پاکستان کے سوا دنیا کے سارے ملکوں میں جا سکتے تھے۔ چنانچہ بعد میں ہم نے اسی پاسپورٹ پر ہالینڈ، فرانس اور انگلینڈ کے سفر کئے۔

مکان کی تلاش - پھر وہی پریشانی

اُس نیلے پاسپورٹ کے بعد ہمیں بستی کی انتظامیہ کی طرف سے اجازت نامہ ملا کہ ہم جرمنی میں کہیں بھی مکان تلاش

کر سکتے ہیں۔اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس تیسری منزل پر چھت کے قریب جو رہائش تھی،اس کو خالی کر دیں۔میرا جرمن زبان کا کورس ستمبر ۱۹۹۱ء میں ختم ہو رہا تھا۔لہٰذا اس وقت تک وہاں ٹھہرنا میری مجبوری تھی۔تاہم میں نے تو نیلے پاسپورٹ کے ملتے ہی اِدھر اُدھر مکان کے لیے گھومنا شروع کر دیا تھا۔اور فون پر جماعت کے چند دوستوں سے اس بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل کی تھیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ جو سوشل ہیلپ پر گزارہ کرتے ہوں اُن کو اچھا مکان مشکل سے ہی ملتا ہے۔جرمن عوام عمومی طور پر تو پناہ گزینوں سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن اپنے پڑوس میں بسانا پسند نہیں کرتے۔لہٰذا کسی اچھی رہائش کی کسی اچھے علاقے میں ملنے کی اُمید مجھے نہیں رکھنی چاہیے۔سکول سے آکر میں اس شواز والڈ کے بے آباد سے کھلے کھلے علاقے میں اردگرد کی بستیوں میں نکل جاتا اور کسی مکان کے بارے میں پوچھتا۔لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے اور سُنی اَن سُنی کر دیتے۔

کبھی کوئی چھوٹا سا کمرہ دکھا دیتا۔ایک نے نیچے تہہ خانہ میں واشنگ مشین کے پاس ایک کمرہ دکھایا جو اس نے عارضی دیواریں کھڑی کر کے بنایا تھا۔کچن،باتھ روم وغیرہ کہیں نہ تھا۔

باتھ روم کے ذکر سے مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ میری اہلیہ بیمار ہوئی تو اس کو کالو (Calw) ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں کمرے میں دوسرے بستر پر ایک جرمن عورت تھی جو اچھی ملنسار تھی۔میری بیٹی ماں کو دیکھنے آئی تو وہ جرمن عورت اس سے مل کر بہت خوش ہوئی۔اس نے اپنا پتہ دے کر اہلیہ سے کہا کہ ہم اُس سے ملنے اُس کے گھر آئیں۔کچھ عرصہ بعد بیٹی پھر آئی تو ہم سب اس جرمن عورت کے گھر گئے جو قریب ہی ایک شہر میں تھا۔اس عورت نے اپنے میاں اور بچوں سے ملایا اور پھر اپنا گھر دکھانے لگی۔

''یہ ہمارا ڈرائنگ روم ہے،اور یہ ساتھ ادھر بیڈ رومز ہیں،یہ سٹور ہے اور یہ کچن دیکھیں کتنا کھلا ہے۔''

اہلیہ نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو اس نے کھول کر دکھایا کہ یہ ٹائلٹ ہے۔اہلیہ نے پوچھا ''باتھ روم کہاں ہے؟''

وہ بولی ''پہلے گھروں میں باتھ روم نہیں ہوتے تھے۔''

اہلیہ نے پوچھا تو پھر نہاتے کہاں تھے؟

وہ بولی ''کچن میں بڑا سا ٹب رکھ کر اُسی میں نہا لیتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ جنگ عظیم سے پہلے اکثر گھروں میں باتھ روم الگ نہ ہوتے تھے۔یہ تو جنگ کے بعد نئے شہر آباد ہوئے تو ماڈرن گھر تعمیر ہوئے اور پھر پرانے گھروں میں بھی تبدیلی کر کے بنائے جانے لگے۔اب بھی اس علاقے میں ایسے گھر موجود تھے جن میں باتھ روم نہ تھے۔وہ علاقے جنگ میں محفوظ رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کا ''ایکشن ری پلے (Action Replay)''

گھر کی تلاش کے سلسلے میں اُدھر ہا لٹرن میں بیٹی سے بھی کہہ رکھا تھا۔ اِدھر میں بھی دیکھ رہا تھا لیکن کوئی کامیابی نہ ہو رہی تھی۔ جوں جوں میرا فائنل امتحان قریب آ رہا تھا میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ سوچتا تھا کہ یہاں سے کہاں جاؤں گا۔ تلاش سے ہٹ کر اب دعاؤں کی طرف توجہ زیادہ دے رہا تھا۔ ایک دن گھبراہٹ اور اضطراب سے دعا کرتے ہوئے میرا ذہن نائیجیریا کے ایسے ہی رہائشی پریشان کن مسائل کی طرف چلا گیا اور خیال آیا کہ کس طرح اعجازی رنگ میں اللہ تعالیٰ نے وہ پریشانیاں دُور کی تھیں۔ اور پھر خیال میں ہی کہا ''اے خدا کیا تیری وہ عنایات افریقہ تک ہی محدود تھیں، کیا جرمنی میں ان کا ایکشن ری پلے نہیں ہوسکتا۔ میں پھر پردیس میں پریشان حال ہوں۔'' اس خیال کے آتے ہی صبر وضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور مجھے احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس مشکل سے نجات عطا فرمائے گا۔

ستمبر ۱۹۹۱ء کے آخر میں میرا زبان کا کورس ختم ہوا۔ اور جیسا کہ میں پہلے اُوپر لکھ چکا ہوں، کورس ختم ہوتے ہی مجھے پتّے کی تکلیف ہوئی اور ہسپتال میں اپریشن ہوا۔ تقریباً تین ہفتے بعد میں ہسپتال سے گھر واپس آیا۔

جس روز میں ہسپتال سے واپس آیا۔ میری بیٹی اور داماد بھی پہنچ گئے۔ میرے بستر پر بیٹھ کر انہوں نے میری خیریت پوچھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ میری خیر خبر پوچھنے آئے ہیں۔ لیکن وہ خبر پوچھنے کے ساتھ ایک خبر دینے بھی آئے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ہالٹرن میں اپنے مالک مکان ڈاکٹر ایلمر (Dr. Illmer) سے بات کی تھی کہ ہمارے والدین کو مکان کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں وہ ہماری کوئی مدد کرے۔

ڈاکٹر ایلمر انجینئر تھا۔ شروع میں جب میں نے ہالٹرن میں ایک ڈیڑھ ماہ قیام کیا تھا۔ تو اس سے ملاقات ہوتی رہی تھی۔ اچھا ملنسار، جہاندیدہ انسان تھا۔ انڈیا، نیپال گھوما تھا۔ میں نے اسے اپنی وہ کتاب بھی دی تھی جو جرمن زبان میں ترجمہ شدہ تھی۔ جب بیٹی نے اس سے کہا کہ اس کے والدین کو مکان کی ضرورت ہے تو اس نے بیٹی سے کہا کہ ریکلنگ ہاؤسن (Rekling Hausen) میں اس کے سات فلیٹ ہیں۔ یوں تو سبھی کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں لیکن ایک فلیٹ اس نے اپنے لیے رکھا ہوا ہے جس کو وہ بطور دفتر کے استعمال کرتا ہے۔ اس نے پیشکش کی وہ اُس کے دفتری کاغذات وغیرہ وہاں سٹور میں بند کر دیں اور اپنے والدین کو وہاں لے آئیں۔ اس نے مزید کہا کہ یہ فلیٹ ہے تو چھوٹا لیکن اس میں چند ماہ گزارہ کرلیں۔ چھ ماہ بعد ساتھ والا فلیٹ خالی ہو جائے گا۔ پھر اس میں شفٹ ہو جائیں۔ فلیٹ کی چابی اس نے بیٹی کے حوالے کر دی۔

بیٹی نے بتایا کہ وہ فلیٹ اور علاقہ بہت اچھا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور جا کر دیکھ لیں اور کرایہ نامہ وغیرہ پر دستخط کر کے اپنے نام کروالیں کیونکہ ڈاکٹر ایلمر کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر دوسرے جرمن کرایہ داروں کو علم ہو گیا تو وہ احتجاج بھی کریں گے اور روڑے بھی اٹکائیں گے۔ بہتر ہے جلدی سے اور خاموشی سے یہ کارروائی مکمل کرلیں۔ ریکلنگ ہاؤسن ہالٹرن سے بیس کلومیٹر

کے فاصلے پر ضلعی صدر مقام ہے، اچھا بڑا شہر ہے۔

میں ہسپتال سے آیا تھا۔ کمزوری بہت تھی لیکن گاڑی ان کی اچھی کھلی سٹیشن ویگن تھی۔ انہوں نے پیچھے گدّا ڈال کر مجھے اس پر لٹا لیا اور لے کر ۵۰۰ کلومیٹر دُور ہالٹرن روانہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو وہ فلیٹ نئے تعمیر شدہ تھے۔ صاف ستھرے اور ماڈرن۔ میں نے کرایہ نامہ وغیرہ مکمل کیا اور واپس آ گیا۔ دو ہفتہ تک میں نے مزید آرام کیا اور پھر سامان اپنی گاڑی میں لاد، کچھ چھت پر باندھ، میں اس صحت افزا مقام سے روانہ ہو گیا۔ کنڈر گارٹن کے ٹیچرز، گجرات کی اس فیملی اور مسٹر (Hoppe) ہوپے نے ہمیں وہاں سے رخصت کیا۔ ''اوبر کال باخ'' میں ہم نے تقریباً چودہ ماہ قیام کیا تھا۔ اس دوران میں نے اور بیٹے نے کلاس دس ماہ تک اٹینڈ کی۔ ہم سب کا میڈیکل چیک اَپ ہوا۔ میرا اپریشن ہوا۔ تقریر، تحریر اور تبلیغ کے میدان میں مجھے کچھ خدمتِ دین کا موقع ملا۔ اس لحاظ سے اوبر کال باخ میرے لیے ایک تربیتی، تعلیمی اور طبّی سنٹر ثابت ہوا۔

ریکلنگ ہاؤسن میں چھ ماہ بعد مَیں ساتھ والے بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گیا جو کشادہ بھی تھا اور دھوپ روشنی کے لحاظ سے دوسرے فلیٹوں سے بہتر بھی۔ جرمن کورس کے دوران ایک اچھے فلیٹ کے جتنے بھی مثبت پہلو پڑھائے گئے تھے وہ سب اس میں موجود ہیں۔ تعمیر کے لحاظ سے نیا، علاقے کے لحاظ سے بارونق، برلبِ سڑک اور شہر کے مرکز کے قریب۔ سامنے بس سٹاپ، شاپنگ سنٹر، پوسٹ آفس اور ریلوے سٹیشن قریب۔ اللہ تعالیٰ نے اعجازی رنگ میں پھر ایک دفعہ اپنے بے پایاں فضل سے نواز دیا تھا۔ ہم بیٹی کے بھی قریب آ گئے تھے اور اب تو وہ اسی شہر میں ہمارے قریب آ بسی ہے۔

باب دہم

ریکلنگ ہاؤسن میں قیام

اس برفانی پہاڑی بستی سے یہاں میدانی علاقے میں آنا بہت باعثِ سکون تھا۔سب سے بڑھ کرخوشی تو رہائش کی تھی جو غیر متوقع طور پر بہت اچھی مل گئی تھی۔البتہ ایک پرابلم تھا، پڑوسی ہمارے خوش نہ تھے۔ڈاکٹر ایلمر نے مجھے بتایا کہ بلڈنگ کے دوسرے باسیوں نے تشویش کا اظہار کیا تھا اور پیشکش کی تھی کہ وہ جرمن کرایہ دار لا دیتے ہیں۔اِن غیر ملکیوں کو یہاں نہ رکھو لیکن میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں اس فیملی کو جانتا ہوں۔کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

تاہم ڈاکٹر ایلمر نے کہا کہ میں ذرا احتیاط رہوں۔عرصہ تک دوسرے باسی کچھ کھچے کھچے سے رہے۔ہم خاموشی سے آتے جاتے رہے۔سیڑھیوں میں اگر آمنا سامنا ہو جاتا تو ہم ''گٹن ٹاگ (Gutten Tag)'' کہہ دیتے لیکن وہ جواب میں خاموش رہتے۔سال بھر ایسے ہی گزر گیا۔پھر نئے سال کی آمد پر بالکونی میں کھڑے آتشبازی دیکھتے ہوئے ہم نے نئے سال کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تو اُن میں سے بھی دو تین نے جواباً ہمیں نئے سال کی مبارکباد دی۔اس طرح آہستہ آہستہ پڑوسیوں کی سردمہری میں گرمی پیدا ہوئی۔بعد میں تو ایک عمر رسیدہ جوڑے کے ساتھ اچھی خاصی شناسائی ہوگئی اور ایک دوسرے کو چائے پر بلانے لگے۔

جماعتِ احمدیہ ڈاٹلن

مقامی جماعت تین چار شہروں پر پھیلی ہوئی تھی۔ڈاٹلن شہر میں چند گھرانے اچھے مستعد تھے لہٰذا جماعت کا نام ڈاٹلن جماعت تھا.اور اب تک یہی نام ہے حالانکہ اب اس شہر میں کوئی احمدی گھرانہ نہیں رہا۔ہمارے یہاں آنے کے چند دن بعد ہی جماعت کا ماہانہ اجلاس محمد عادل صاحب کے گھر پر ہوا جو ریکلنگ ہاؤسن میں ہی رہتے تھے۔اجلاس میں احبابِ جماعت سے ملاقات ہوئی۔میں نے پوچھا کہ جمعہ کہاں ہوتا ہے تو بتایا گیا کہ اکثر دوست کام پر ہوتے ہیں لہٰذا جمعہ کا کوئی انتظام نہیں۔میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم جمعہ نہ پڑھیں۔اگر سارے دوست نہیں آسکتے تو جو آسکیں وہ شامل ہو جائیں اور پھر لڑکے اور لجنات ہیں، جمعہ تو بہر حال ہونا چاہیے۔

اس پر صدر جماعت مکرم رفیق احمد صاحب نے دوستوں سے مشورہ کے بعد اعلان کیا کہ مکرم بشارت احمد بھٹی کے ہاں جمعہ ہوگا۔بشارت احمد صاحب کے دو بھائی منظور احمد صاحب بھٹی اور افضال احمد بھٹی قریب ہی رہتے تھے۔کئی سال تک اُن کے ہاں جمعہ ہوتا رہا۔پھر بعد میں صدر صاحب کے ہاں پڑھا جاتا رہا۔جمعہ تو میں نے شروع کرا دیا لیکن خود ایک بوجھ تلے بھی آ

گیا۔صدر صاحب نے حکم دیا کہ جمعہ میں ہی پڑھاؤں۔ میں نے بہت معذرت کی اور سمجھایا کہ آپ صدر ہیں آپ کو پڑھانا چاہیے لیکن حکم کی تعمیل کرتے ہی بنی۔ پھر رمضان آیا تو تراویح کے لیے بھی مجھے ہی آگے کیا جاتا رہا۔اور یہ بوجھ میں گزشتہ بیس سال سے اُٹھائے ہوئے ہوں۔نومبر ۲۰۰۹ء میں اہلیہ کی وفات کے بعد جمعہ اور تراویح اب میرے ہاں ہونے لگی ہیں۔ دو سال بعد جماعتی انتخاب ہوئے تو مجھے صدر جماعت چن لیا گیا۔اگلے انتخابات میں مجھے سیکرٹری تبلیغ چُن لیا گیا اور پھر اگلی دفعہ سیکرٹری تربیت۔

متبادل مقرر برائے جلسہ سالانہ جرمنی ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۴ء

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۹۱ء کے جلسہ سالانہ میں مجھے متبادل مقرر کے طور پر چنا گیا تھا۔ یہاں ریکلنگ ہاؤسن آکر بھی اللہ تعالیٰ نے میری تعلیم وتربیت کے لیے دباؤ جاری رکھا۔ مجھے ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۴ء کے جلسہ ہائے سالانہ کے لیے بطور متبادل مقرر چنا جاتا رہا۔ جن عناوین پر تقریر تیار کرنے کے لیے کہا گیا تھا وہ درج ذیل تھے:۔

۱۔ ۱۹۹۱ء میں ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ تبلیغ''

۲۔ ۱۹۹۲ء میں ''مسیح کی آمدِ ثانی''

۳۔ ۱۹۹۳ء میں ''اسلام میں عائلی زندگی کا تصوّر اور اس کا مغرب سے موازنہ''

۴۔ ۱۹۹۴ء میں ''کسوف وخسوف کا عظیم آسمانی نشان''

ان تقاریر کی تیاری کے لیے بہت مطالعہ اور محنت درکار تھی اور یہاں مجھے کوئی جماعتی لٹریچر دستیاب نہ تھا۔ میری رسائی کولون مشن تک تھی۔ خاصی بھاگ دوڑ کر کے یہ تقاریر تیار کیں۔ جرمنی آتے ہی مسلسل چار سال تک تقاریر کا تیار کرنا میرے لیے بہت مشکل اور محنت طلب کام تھا۔ تقریر کی نوبت تو نہ آئی تھی لیکن ان عناوین پر کچھ مطالعہ ہو گیا اور تیار کردہ مضامین ریجن کے بعض جلسوں میں کسی نہ کسی رنگ میں کام آجاتے رہے۔

لندن کے انٹرنیشنل تبلیغ سیمینار میں تقریر۔ جلسہ سالانہ میں شرکت

یہاں جرمنی آکر صرف اردو تقریر وتحریر کے جمود کو ہی نہیں خدا نے دُور کیا، انگریزی تقریر میں بھی رواں کیا اور اچھی خاصی مشقت میں ڈال کر کیا۔لندن میں جماعت کے جلسہ سالانہ ۱۹۹۳ء سے ایک روز پہلے وہاں شعبہ تبلیغ نے ایک انٹرنیشنل تبلیغ سیمینار مقرر کیا۔لندن کے سیکرٹری صاحب تبلیغ نے مجھے خط لکھا جس میں مجھے تقریر کی دعوت دی گئی۔عنوان تھا ''تبلیغ کے میدان میں میرے تجربات''۔

یہ خط ہالٹرن سے ہوتا ہوا سیمینار کی تاریخ سے صرف ایک ہفتہ پہلے ملا۔ خط میں معذرت درج تھی کہ بروقت اطلاع نہیں

دے سکے کیونکہ ٹیلیفون نمبر جس پر وہ کوشش کرتے رہے ہیں، غلط نکلا۔ بہر حال میرا تو جلسہ سالانہ جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ ان چند دنوں میں جانے کی تیاری کرتا یا تقریر کی۔ جانے کی تیاری کے ساتھ ساتھ تقریر لکھنا بہت مشکل تھا کہ اس طرح خیالات منتشر ہوتے ہیں اور وہ ذہنی سکون میسر نہیں آتا جو ایسی تقریر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر میں تو ٹائپ بھی ایک انگلی سے کرتا ہوں اور ایک لائن میں کئی کئی غلطیاں کرتا ہوں۔ اس خط نے مجھے حیران اور پریشان کر دیا تھا اور شکریہ کے ساتھ معذرت کی فیکس کرنا ہی ایک راستہ نظر آتا تھا۔ تاہم میں نے اس کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے میں دو تین گھنٹہ لکھتا اور پھر سفر کی تیاری کے لیے بھاگ دَوڑ کرتا۔ بیٹی اور ظفر کا جلسہ پر جانے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے حوصلہ دِلایا اور تیاری میں مدد کی۔ میں نے گاڑی اُن کی گاڑی کے پیچھے لگائی اور لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں نائیجیریا کے پرانے دوست ملے۔ خصوصاً مظفر احمد منصور صاحب اور شکیل احمد صاحب منیر سے ملاقات بہت خوشی کا باعث بنی اور اُن سے مل کر مجھے یہ بھی سمجھ آ گئی کہ میرا نام سیمینار میں تقریر کے لیے کس نے دیا ہوگا۔

اس سیمینار میں تقریر میرے لیے باعثِ مسرت اور اعزاز تھی لیکن اس کے ساتھ جو امر میرے لیے بہت برکت اور سکینت کا موجب بنا وہ لندن کے جلسہ کے تین دن اور پہلی عالمی بیعت میں شمولیت تھی۔

اس جلسے میں ڈاکٹر نسیم احمد صاحب اور ڈاکٹر لطیف احمد قریشی صاحب سے بھی ملا۔ نسیم احمد کا ذکر تو میں نے احمد وال کے واقعات میں بھی کئی بار کیا ہے۔ کالج میں میرے کلاس فیلو بھی رہے۔ اس وقت یہ میجر جنرل تھے اور پاکستان کے نامور آنکھوں کے ماہر سرجن تھے۔ افسوس ہے کہ یہ ان سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد سنا تھا کہ وہ ہارٹ اٹیک سے فوت ہو گئے ہیں۔ بعد میں جب میں پاکستان گیا تو بہشتی مقبرہ میں اُن کے مزار پر گیا اور دعا کی۔

ڈاکٹر لطیف احمد قریشی صاحب سے میری واقفیت تعلیم الاسلام کالج کے زمانہ سے ہے۔ یہ لاہور شہر میں رہتے تھے اور میں ہوسٹل میں۔ یہ کبھی کالج آتے تو ملاقات ہوتی، یا پھر جمعہ یا کسی جلسے میں مل جاتے، بڑی عزت و مروّت سے پیش آتے۔ میں اُن کے اَخلاق اور شُستہ اردو سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ اُن کی گفتگو سے اس وقت بھی خدمتِ دین کا جذبہ جھلکتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے لاہور میں اپنے والدِ محترم سے ان کی دکان پر میرا تعارف کرایا تھا۔ بعد میں بھی جب یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، ملاقات ہوتی رہی اور پھر جب وہ فضل عمر ہسپتال میں میڈیکل سپیشلسٹ کے طور پر کام کرنے لگے تب بھی ملتا رہا۔ اب لندن کے جلسہ پر مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ نسیم احمد بھی جلسہ پر آیا ہوا ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کو کرسیوں پر کہاں دیکھنا ہے اور کیسے پہچاننا ہے۔ مجھے تو ملے پچیس سال ہو گئے تھے۔

ریجن کی تربیتی کلاسز

جب میں یہاں آیا تو ریجن کا مرکز کولون مشن ہاؤس تھا۔ وہاں ہر سال کرسمس کی چھٹیوں میں خدام کی تربیتی کلاسز ہوتی

تھیں۔ چودھری سعید الدین صاحب ریجنل امیر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نائیجیریا میں مدت تک رہا ہوں اور یہ کہ مجھے بائیبل اور عیسائیت کے بارے میں کچھ شُد بُد ہے۔ انہوں نے کولون میں ایک جنرل اجلاس میں بائیبل کے تعارف پر تقریر کرنے کا ارشاد فرمایا۔ اور اس کے بعد ہر سال خدّام کی تربیتی کلاس میں مجھے موازنہ مذاہب پڑھانے پر مقرر کیا جاتا رہا۔ بعد میں جب ویسٹ فالن (Westfalen) الگ ریجن بن گیا تو اوسنا برک (Osnabruck) اور میونسٹر (Munster) میں تربیتی کلاسز ہونے لگیں۔ اب وہاں میں یہی موازنہ مذاہب پڑھانے لگا۔ بعض اوقات دوسرے مضامین فقہ، تاریخ اسلام واحمدیت وغیرہ بھی پڑھانے کا موقع ملا۔ اس طرح اندازاً اٹھارہ سال تک مجھے یہ خدمت کا موقع ملتا رہا ہے۔

خدّام کے اجلاسات اور ان کلاسز میں جو خدّام یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انگریزی پڑھ سکتے تھے۔ اُن سے پتے میں لے لیتا اور بذریعہ ڈاک اُن کو اپنے کتابچوں کی نقول ارسال کرتا رہا۔ جن میں عیسائیت کے مختلف عقائد کا ردّ کیا گیا ہے اور جو افریقہ سے میں ساتھ لایا تھا۔ شروع میں تو یہ کتابچے ہی تقسیم کرتا رہا لیکن جب ختم ہونے پر آئے تو فوٹو سٹیٹ کرا کر دیتا ہوں۔ اس طرح بائیبل کے بہت سے حوالوں کی فوٹو سٹیٹ بھی دیتا رہا اور ساتھ ہی اُن حوالوں سے استدلال بھی سمجھاتا رہا۔

قرآن کلاس بذریعہ ٹیلیفون

چند سال پہلے خدام الاحمدیہ نیشنل سیکرٹری تعلیم کی طرف سے پیغام ملا کہ انہوں نے ٹیلیفون پر خدّام کو قرآن پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ بعض خدّام جو ناظرہ پڑھ چکے ہیں وہ حُفّاظ سے ترتیل سیکھ رہے ہیں۔ مجھے کہا گیا کہ میں آٹھ خُدّام کو ترجمہ پڑھا دیا کروں۔ اُن کے نام پتے اور ٹیلیفون نمبر مجھے مہیا کر دیئے گئے اور وقت مقرر کر کے میں اُن کو ترجمہ پڑھانے لگا۔ اور خدا کے فضل سے یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ ایک دو تو کچھ عرصہ بعد چھوڑ گئے۔ کچھ جامعہ میں داخل ہو گئے۔ اب تین چار ہی رہ گئے ہیں۔ دو لڑکوں کی ماؤں کے کہنے پر اُن کی بہنوں کو بھی شامل کرنا پڑا۔

یہ کلاس اکثر لمبی بھی ہو جاتی اور دلچسپ بھی۔ لڑکے سوال کرتے تو بات ترجمے سے تفسیر تک پہنچ جاتی۔ بعض آیات کے ترجمے کے ساتھ احمدی اور غیر احمدی نقطۂ نظر کو بھی واضح کرنا پڑتا ہے۔ پھر اُن کو یہ بھی اجازت تھی کہ وہ کوئی بھی سوال پوچھ سکتے ہیں۔ چنانچہ کلاس کے بعد اُن کے سکول، یونیورسٹی اور میڈیا کے حوالے سے اُٹھنے والے سوالات کا جواب دیتا ہوں۔ بعض دفعہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کو خدّام یا لجنہ کے اجلاس میں کسی خاص موضوع پر تقریر کرنی ہے لہٰذا اس کی تیاری کے لیے نکات بیان کرتا ہوں اور ضروری حوالوں کی نقول بذریعہ پوسٹ ارسال کر دیتا ہوں۔

یہ سب طلباء دوسرے ریجن سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کلومیٹر دُور رہتے ہیں۔ سوائے ایک طالب علم کے کسی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دو تو ماشاءاللہ اچھے ہوشیار ہیں اور نیشنل سطح پر قرانی مقابلہ جات میں اوّل دوم پوزیشن حاصل کرتے رہے ہیں اور ایک جرمنی کے جامعہ میں داخل ہے اور ایک لندن کے۔

تعلیم القرآن کا ذکر چھوڑنے سے پہلے اپنے ایک جرمن شاگرد کا ذکر کرنا ضروری محسوس کرتا ہوں۔ دانیال نام ہے، اس کو بیعت کئے ہوئے چھ ماہ ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ہے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ کا ماہر ہے، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ ہی جماعت سے متعارف ہوا اور خود میونسٹر جا کر مربی سلسلہ مکرم نسیم احمد ساجد صاحب سے ملا، کچھ معلومات اور لٹریچر حاصل کیا اور پھر انٹرنیٹ پر جماعت کی کتب وغیرہ پڑھیں۔ یہ پہلے یہوواوٹنس گروپ میں شامل تھا۔ اب مجھ سے یہ قاعدہ یسّرنا القرآن پڑھ رہا ہے۔ اور ماشاء اللہ خوب پڑھ رہا ہے تادمِ تحریر وہ قاعدہ تقریباً ختم کر چکا ہے۔ اسی طرح نماز اور قرآن کریم کی آخری دو سورتیں یاد کر چکا ہے۔ گزشتہ جمعہ میں نماز کی تکبیر بھی اس نے ہی کہی اور درست کہی ورنہ اپنے خدّام کی درستی کراتے کراتے تو برسوں گزر گئے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں غلطی کر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ثباتِ قدم عطا فرمائے اور اخلاص میں ترقی بخشے۔ پات تو اچھے چکنے ہیں خدا کرے بروا ہونہار نکلے۔ دینی امور اور اختلافی مسائل پر بھی بات ہوتی رہتی ہے۔

مجھے انصار اللہ کے ریجنل اجتماعات میں بھی تقریر کے لیے کہا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً صحت جسمانی کے حوالے سے تو ضرور کچھ نہ کچھ کہنے کا موقع ملتا رہا۔ خدّام الاحمدیہ اور انصار اللہ کے تعلیمی مقابلہ جات میں بطور جج بھی خدمت کا موقع ملتا رہا ہے۔ ریجن میں مجالس سوال و جواب میں دیگر بزرگوں اور مربّیان صاحبان کے ساتھ مجھے بھی جواب دینے کی توفیق ملتی رہی ہے۔

انفرادی تبلیغی ملاقاتیں

تبلیغ ہر احمدی کا فریضہ ہے۔ میرا تو یہ پرانا شوق بھی ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میل ملاقات کے دوران گفتگو کا رُخ آہستہ آہستہ تبلیغ کی طرف پھیر دینا میری عادت رہی ہے۔ اسی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے پھر گھر پر دعوت دے دیتا ہوں، زبان کی مشکل کے باوجود اچھی بامقصد بات ہو جاتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جہاں شوق اور جوش ہو وہاں زبان بھی چل نکلتی ہے۔ بعض دفعہ تو شریکِ گفتگو نے یہ کہہ کر حیران بھی کیا کہ ''اچھی جرمن بول لیتے ہو۔''

کبھی کبھی انگریزی بولنے والے جرمن بھی ملے جن سے اچھی لمبی بحث چلی۔ کئی نشستیں ہوئیں۔ بعض کو تو اردگرد کے بڑے شہروں سے صرف میرے توڑ کے لیے ہی بلایا گیا تھا۔ اُن میں یہوواوٹنس کے علاوہ کیتھولک اور مورمن فرقہ کے لوگ بھی تھے۔ یہاں آتے ہی میں نے نیچے کیلر (تہہ خانہ) میں ایک چھوٹا سا دفتر بنا لیا تھا، جہاں میں لکھائی پڑھائی کر لیتا تھا۔ چھوٹی موٹی تبلیغی گفتگو تو وہیں ہو جاتی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ سے زیادہ تو یہ لوگ وقت نہیں دیتے۔ جہاں دیکھا کہ دال نہیں گل رہی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں البتہ بڑی اور مفصّل گفتگو اُوپر ڈرائینگ روم میں ہوتی۔ جہاں مہمان نوازی بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ حال ہی میں دو نوجوانوں نے فون کر کے مجھ سے وقت لیا۔ ایک جرمن تھا اور دوسرا افریقی نژاد جرمن۔ دونوں یہوواوٹنس کے اچھے سرگرم رکن ہیں اور مارل (Marl) شہر کے رہنے والے ہیں۔

پہلی ملاقات میں ہی تین گھنٹہ تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا کہ بائیبل کے حوالے سے جو آپ کے عقائد ہیں وہ میں جانتا ہوں لیکن اسی حوالے سے جو ہمارے عقائد ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔حقیقت کو پانے کے لیے دونوں اطراف کے دلائل سننا ضروری ہوتا ہے۔آپ اپنے موٹے موٹے عقائد بیان کریں اور پھر میں آپ کو بائیبل کی ہی روشنی میں تصویر کا دوسرا رخ دکھاؤں گا۔انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور بات آدم،اس کے گناہ اور گناہ کی سزا سے شروع ہوئی اور میں نے اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا اور بائیبل کی ہی روشنی میں پیش کیا۔وہ بہت حیران بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ میں نے کہا اب آپ دیکھ لیں کون سا نقطۂ نظر زیادہ معقول اور قابلِ قبول ہے۔اور یہ بھی کہ آپ بائیبل کو بہتر جانتے ہیں یا ہم۔

اس کے بعد وہ ہر دو ہفتہ کے بعد آتے رہے۔ وقت پہلے ہی مقرر کر کے جاتے تھے۔تقریباً سب اہم عقائد کا تجزیہ ہوا۔ تین ماہ تک آتے رہے۔ پھر وہ چھٹّیوں پر جانے کا کہہ کر گئے اور بعد میں رابطہ نہیں کیا۔ وہ واضح اقرار کرتے تھے کہ ہمیں اسلام کے بارے میں بہت سی معلومات نئی ملی ہیں۔غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔ یہ بات اُن کے لیے خوشی کا باعث بنی کہ بائیبل کی کتابوں اور نبیوں کی اہمیت اسلام میں ایسی گہری ہے اور قرآن میں ان کا ذکر اس کثرت سے ہے۔

مربی صاحبان اور تبلیغی نشستیں

دین کی خدمت کرنے والے احباب کی عزت واحترام شروع سے ہی میرے دل میں ہے۔ نائیجیریا میں تو مجھے اُن کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا خوب موقع ملا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔اُن کے پاس بیٹھ کر مجھے سکون بھی ملتا اور سبق بھی۔ایک دفعہ اجی بواوڈے مشن ہاؤس میں تین مربّیان چند روز کے لیے ٹھہرے تھے۔ میں اُن سے فارغ اوقات میں جاملتا اور اچھی گفتگو ہوتی۔

ایک روز ایک نائیجیرین دوست نے مجھ سے کہا ''تم ڈاکٹر ہو اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ تمہارا اُٹھنا بیٹھنا شہر کے ڈاکٹروں کے ساتھ ہوگا لیکن تمہاری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تم مربّیان کے ساتھ رہو۔''

میں نے سنا تو خاموش ہو رہا۔ دل میں مَیں نے کہا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن بات میری کوشش کی نہیں اُن کی کشش کی ہے۔کوشش تو مجھے اُن سے جدا ہونے کے لیے کرنی پڑتی ہے۔

نائیجیریا کے حالات میں مَیں لکھ آیا ہوں کہ وہاں تقریر،تحریر یا تبلیغی میدان میں جو کچھ حقیر کاوش کر سکا اس میں اُن مربّیان صاحبان کی تائید وتحریک کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اکثر تبلیغ کے مواقع پیدا کرتے رہے اور میں اپنے شوق کی تسکین کرتا رہا۔ وہ حوصلہ افزائی کرتے تو آتشِ شوق اور بھڑکتی۔ اس طرح ہوتے ہوتے یار لوگ مجھے انہی کا حلقہ بگوش سمجھنے لگے تھے۔ایک دفعہ کانو میں ایک ڈاکٹر نے جو احمدی پاکستانی تھا شکایت کی کہ کچھ لوگ ہم ڈاکٹروں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے پھر میرے قریب ہو کر کہنے لگا:

''آپ کے بارے میں تو وہ یہاں تک کہتے تھے کہ یہ ڈاکٹر کم اور مبلّغ زیادہ ہے۔''

میں نے سنا تو ہنس کر کہا:

''تم شکایت کر رہے ہو، میں تو اس کو خراجِ تحسین سمجھتا ہوں۔''

یہاں جرمنی آ کر بھی مجھے مربی صاحبان کا تعاون حاصل رہا اور ان کی ترغیب اور توسّط سے کئی بار تبلیغی مواقع میسّر آئے۔ سٹٹ گارٹ میں محترم ڈاکٹر عبدالغفار صاحب کے ارشاد پر جو امریکن اور کوریّن منّادوں سے مناظرہ ہوا اس کا ذکر تو پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں ریکلنگ ہاؤسن (Recklinghausen) آ کر بھی ایسے مواقع ملتے رہے۔

ایک تبلیغی نشست - ایک افسوناک واقعہ

مجھے یہاں آئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مکرم لئیق احمد منیر صاحب کولون میں مربی سلسلہ متعین تھے۔ ایک صبح مجھے اُن کا فون آیا کہ جلدی آ جاؤ۔ تبلیغی نوعیت کی ایک ایمر جنسی آن پڑی ہے۔ تفصیل آنے پر بتاؤں گا۔

میں ڈیڑھ گھنٹہ میں اُن کے پاس پہنچا۔ اپنی گاڑی کولون مشن ہاؤس میں کھڑی کی اور ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ ایک ایسے قصبہ کی طرف چل پڑے جو تقریباً دو گھنٹہ کی مسافت پر واقع تھا۔ راستے میں انہوں نے واقعہ بیان کیا جو افسوناک بھی تھا اور عبرتناک بھی۔

اس قصبہ میں ایک بنگالی مسلمان غیر احمدی فیملی رہتی تھی۔ ان کی دو لڑکیاں سکول میں پڑھتی تھیں۔ وہاں ایک دو لڑکے جو یہوواوٹنس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کو تبلیغ کرتے تھے۔ وہ قرآن کے حوالے سے بھی اپنے موٴقف کی تائید پیش کرتے۔ لڑکیاں پریشان ہو کر جواب تلاش کرتیں، قرآن دیکھتیں۔ ان کو کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ متاثر ہوتی گئیں خصوصاً بڑی لڑکی جو تقریباً اٹھارہ سال کی تھی۔

اس پسِ منظر کا افسوناک پہلو یہ تھا کہ باپ اسلام کا بڑا عالم تھا۔ اس کے کمرے میں کتابیں الماریوں میں سجی تھیں۔ ہر وقت اپنے کمرے میں وہ محوِ مطالعہ رہتا، تندمزاج اور سخت گیر تھا۔ بیٹیوں یا اُن کی ماں کو کمرے میں جانے یا اس سے کسی موضوع پر بات کرنے کی جراُت نہ تھی۔ بقول ماں کے وہ سکول سے آ کر اِدھر اُدھر پریشان گھومتی، سوچتی رہتیں۔ کوئی کتاب، قرآن مل جاتا تو اس کی ورق گردانی کرتیں لیکن کسی کو علم نہ ہو سکا کہ اُن کی پریشانی کیا ہے۔ گھر کی اس گھٹن میں وہ اپنی اُلجھن کہہ نہ پائیں۔ ماں ایک سادہ خاتون تھی۔ باپ سے بات کرتے ڈرتیں کہ گھر میں قیامت آ جائے گی اور اُن کی شامت۔

ماں باپ پر بجلی اس وقت گری جب ایک روز لڑکیاں گھر نہ آئیں۔ وہ پریشان بیٹھے تھے کہ فون آیا۔ بڑی لڑکی بول رہی تھی کہ

''ہمیں سچائی مل گئی ہے، جنت کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ ہم گھر نہیں آئیں گی۔''

لڑکی نے بڑی عزت اور محبت سے ماں باپ سے بات کی اور آخر میں درخواست کی کہ آپ بھی اسی سچائی کے راستے پر آ جائیں۔ بعد میں بھی فون پر ماں باپ کو اسی روشنی کی طرف دعوت دیتی رہی اور خط بھی لکھے۔ باپ نے بار بار اس سے کہا کہ وہ ایک دفعہ اس کو بات سمجھانے کا موقع دیں اور گھر آئیں لیکن لڑکی گھر آنے سے انکار کرتی رہی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بڑی کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اس نے اسی لڑکے سے شادی کر لی۔

جب باپ نے بار بار کہا کہ ایک دفعہ وہ اس کو موقع دیں تو بالآخر لڑکی مان گئی۔ شرط یہ تھی کہ وہ چھوٹی بہن کو ساتھ نہیں لائے گی۔ کسی تر کی کو بات کرنے کے لیے نہیں بلایا جائے گا۔ اور دو آدمیوں کے سوا وہاں کوئی آدمی نہ ہوگا۔ باپ بھی نہ ہوگا۔ اب باپ سوچ میں پڑ گیا۔

اس مقام پر اس بنگالی آدمی نے ہمارے کولون مشن میں فون کیا اور مربی صاحب کو ساری کہانی سنا کر درخواست کی کہ وہ آئیں اور بات کریں۔ اور اب ہم دونوں وہاں جا رہے تھے۔

یہ سب کچھ سُن کر سخت صدمہ ہوا۔ میں نے مربی صاحب سے کہا کہ اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ بازی تو ہم ہار ہی چکے ہیں۔ انہوں نے لڑکیوں کو خوب ورغلایا ہے اور اب تو شادی بھی ہو چکی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی ایک ہی نشست ہوگی۔ اور اس وقت کو کسی بھی موضوع کو طول دے کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ ایک نشست میں تو یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسا موضوع چھیڑا جائے جس پر ہماری گرفت ایسی سخت ہو اور ضرب ایسی کاری ہو کہ لڑکی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جو کچھ اس کو بتایا گیا ہے وہ سارا سچ نہیں اور یہ کہ اس کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح شاید مزید گفتگو کی گنجائش نکل آئے۔ اور وہ ہمیں مزید وقت دے دیں۔

ہم وقت پر پہنچ گئے۔ لڑکی کے ایک نوجوان کزن نے ہمیں ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ لڑکی کا باپ ملا۔ کچھ گفتگو ہوئی اور پھر ہم نے سمجھایا کہ بہتر ہے وہ نظر نہ ہی آئے ورنہ بات بگڑ سکتی ہے۔

کچھ دیر بعد لڑکی ایک نوجوان جرمن کے ساتھ آئی۔ ہم نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ پھر میں نے اس جرمن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں، افریقہ میں برسوں رہا ہوں اور پھر میں نے بتایا کہ وہاں بھی مجھے یہوواوٹنس سے ملنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ میں نے اُن کے عقائد کی تعریف کی اور کہا کہ سنتے ہیں آپ کرسمس اور ایسٹر نہیں مناتے۔

اس نے جواباً وضاحت کی کہ یہ کرسمس اور ایسٹر کے تہوار بُت پرستوں سے لیے گئے ہیں۔ ہم اُن کو نہیں مناتے۔ میں نے اس کی بات کو سراہا اور کچھ دیر باتیں کرتے ہوئے تعریف کی کہ آپ لوگ اچھی گہرائی میں جا کر بائبل کا مطالعہ کرتے ہیں اور عیسائیت کے بہت سے مروّجہ عقائد کی اصلاح کی ہے۔ ایسے ہی تعریف کرتے ہوئے میں نے کہا ''سنا ہے آپ تثلیث کو بھی نہیں مانتے'' اس نے فوراً کہا ''نہیں، ہم نہیں مانتے، یہ بھی بُت پرستوں سے آئی ہے۔ بائبل ایک خدا کی تعلیم دیتی ہے۔''

میں نے کہا:

''لیکن بائیبل میں تو یوحنا کے پہلے خط کے پانچویں باب میں باپ، بیٹے اور روح القدس کا ذکر ہے۔''

اس پر اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''وہ الفاظ کسی نے بعد میں ڈال دیئے تھے، ان کو نکال کر اصل الفاظ آیت میں اب لکھ دیئے گئے ہیں۔''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''اچھا! تو یہ الفاظ کسی نے بعد میں ڈال دیئے تھے بائیبل میں۔اور اب آپ نے اس کی اصلاح کر دی ہے۔''

اس نے پھر تصدیق کی کہ ہاں کسی نے بعد میں ڈال دیئے تھے بائیبل میں۔

اب میں نے گرفت کرتے ہوئے کہا'' بائیبل کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی۔اور تین خداؤں کو ماننا سب سے بڑا گناہ ہے۔کروڑہا لوگ سینکڑوں سال تک اس بدلی ہوئی آیت کو خدا کا کلام سمجھ کر تین خدا مانتے رہے، پوجتے رہے اور اس طرح اس گناہ کی پاداش میں جہنم میں گئے۔اب اس قدر وسیع اور عظیم تباہی کا ذمہ دار کون ہے؟''

اب وہ نوجوان لگا اِدھر اُدھر کی مارنے۔میں نے پھر وہی اُوپر والا مطالبہ دہرایا اور پوچھا کہ اس روحانی تباہی کا ذمہ دار کون ہے۔ساتھ ہی میں نے مربی صاحب سے کہا کہ میری جرمن تو ختم ہو رہی ہے۔اب آپ اس کو اس نکتہ سے ہلنے نہ دیں۔ چنانچہ مربی صاحب نے اس کو اسی بات پر رگڑا۔وہ بائیبل کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔اور ہم اس سے یہی کہلوانا چاہتے تھے۔جب وہ کج بحثی کرنے لگا تو میں نے مثال دی۔

اگر ہم دس ہزار وٹامن کی گولیوں کا ڈبہ خریدیں۔اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں ایک گولی زہریلی ہے تو ہم وہ ڈبہ پورے کا پورا ہی پھینک دیں گے، بلکہ اس فرم کے سارے ڈبّے تمام دکانوں سے اُٹھا لیے جائیں گے۔اگر جسمانی موت سے ڈر کر ہم اتنی احتیاط کرتے ہیں تو روحانی موت سے بچنے کے لیے ہمیں کتنی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔جس بائیبل کی ایک آیت نے اتنی بڑی تباہی مچائی اور کروڑہا لوگوں کو جہنم تک پہنچایا اس کو کون عقلمند ہاتھ بھی لگائے گا۔ایسی خطرناک صورت حال میں اس کتاب کو پڑھتے وقت ہمیں اپنی آنکھیں تو کم از کم کھلی رکھنی چاہییں، چھان پھٹک تو کرنی چاہیے۔میں نے اس بات کو بھی اُٹھایا کہ اس تباہی کے وقت روح القدس کہاں تھی۔خدا نے کیوں اپنے کلام کی اصلاح نہ کی۔

اس مقام پر لڑکی بول اُٹھی:

''مان لیا بائیبل میں تبدیلی ہوئی ہے لیکن کیا ثبوت ہے کہ قرآن میں نہیں ہوئی۔''

ہم بات تو اس لڑکے سے کر رہے تھے لیکن روئے سخن تو لڑکی کی طرف ہی تھا۔جب وہ بولی تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔میں نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا'' یہ بات بہت معقول ہے آپ کی۔یقیناً ہمیں قرآن کو بھی دیکھنا چاہیے۔ہم مسلمان تو قرآن کی

تعریف کریں گے ہی، آیئے دیکھتے ہیں کہ عیسائی محققین قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر اس نقطۂ نظر سے بہت تحقیق کی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے بیگ سے دیباچہ تفسیر القرآن میں دیئے گئے ولیم میور اور انسائیکلو پیڈیا کے حوالوں کی نقول نکالیں اور ان دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک تھما دی۔ انہوں نے پڑھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لڑکا گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے کہا یہ نقول آپ لے جائیں اور غور کریں۔ فیصلہ کرنے میں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ مل بیٹھ کر حقیقت کو پانے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔

مربی صاحب نے تجویز پیش کی کہ ہمیں پھر اسی طرح ملنا چاہیے۔ اس پر لڑکے نے کہا کہ ہم یہاں دوبارہ نہیں آسکتے۔ اس پر مربی صاحب نے پیشکش کی کہ یہاں نہ سہی، کولون میں ہمارے مشن ہاؤس میں آجائیں۔ ان کو کولون کا ایڈریس فون نمبر دیا۔ انہوں نے بے دلی سے لے تو لیا لیکن ہمیں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ لڑکا اپنی بیوی کو دوبارہ ہم سے ملنے نہ دے گا۔ اور پھر وہ دوبارہ آئے نہ رابطہ کیا۔

ایک تُند خو، تیز مزاج انسان نے تکبر اور تغافل کے سمندر میں اپنے ہاتھوں سے اپنی "بیڑیوں" کو ڈبو دیا تھا اور ہمیں دکھ تھا کہ ہم اس کی بیٹیوں کو بچا نہ سکے۔ ہماری دعا تھی اور امید بھی کہ دو، چار، دس سال بعد جب یہ ابتدائی طلسم ٹوٹے گا اور حالات بدلیں گے تو شاید ان لڑکیوں کو ہوش آئے اور وہ محسوس کریں کہ اُن کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ ہم والدین کے لیے بھی یہ واقعہ کئی پہلو سے عبرت اور نصیحت کا سامان رکھتا ہے۔

محترم ڈاکٹر محمد جلال شمس صاحب کے ساتھ ایک تبلیغی نشست میں شرکت

جب ڈاکٹر محمد جلال شمس صاحب میونسٹر میں مربی سلسلہ متعین تھے تو انہوں نے ایک روز فون پر کہا کہ ڈوزل ڈرف (Dusseldorf) کے قریب ایک شہر میں یہووا وٹنس ہماری جماعت کے دوستوں سے ملتے ہیں، گفتگو ہوتی ہے۔ اب یہ فیصلہ ہوا ہے کہ دونوں طرف سے انگریزی بولنے والے بلا کر بات کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ میں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں۔

میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب نے ریلوے سٹیشن سے مجھے لیا اور اس گھر لے گئے جہاں نشست ہونی تھی۔ دوسری پارٹی چار پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ اس گفتگو میں بھی میں نے وہی گفتگو کا انداز اپنایا تھا جو مذکورہ بالا بنگالی کے گھر اپنایا تھا۔ ہلکی پھلکی تعارفی باتوں کے بعد کرسمس، ایسٹر اور تثلیث کے بارے میں اُن کے عقائد کا پوچھا۔ کچھ تعریف کی اور پھر یوحنا کے پہلے خط کے حوالے سے تحریف بائیبل کا اقرار کروایا۔ اور پھر پوچھا کہ اتنی بڑی روحانی تباہی کا ذمہ دار کون ہے۔ اور اسی طرح پھر میں نے بائیبل کو خطرناک ثابت کیا، وٹامن کی گولیوں کی مثال دے کر۔ وہ بالکل جواب نہ دے سکے تھے اور آدھ گھنٹے میں ہی اُٹھ کر چلے گئے تھے

اور پھر وہ کبھی ہمارے دوستوں کے پاس نہیں آئے۔

چونکہ گفتگو جلد ختم ہوگئی تھی اور کھانے میں دیر تھی، ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آؤ سیر کر آئیں۔ ہم گھنٹہ بھر سیر کے دوران گفتگو پر تبصرہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے انداز کو بہت سراہا تھا کہ تم نے خوب پکڑا ان کو، ورنہ یہ بہت ضدی اور کج بحث ہوتے ہیں۔ ہارنے کے باوجود ہار نہیں مانتے اور غیر معقول توجیہات پیش کرنے لگتے ہیں۔ میں نے کہا ان کو ٹریننگ دی جاتی ہے کہ کسی کی بات خواہ کیسی ہی درست ہو ہرگز نہیں ماننی اور نہ ہی کسی سے کوئی لٹریچر لینا ہے۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ گفتگو کے بعد اگر میں نے موضوع زیر بحث کے متعلق کوئی پمفلٹ پیش کیا تو اوّل تو وہ لینے سے معذرت کی اور اگر مروّت میں لے لیا تو باہر جاتے ہوئے سیڑھیوں میں رکھ گئے۔

یہوواوٹنس کی نامعقول توجیہات

اس فرقہ کی تحریرات سے بعض اوقات اچھی معلومات مل جاتی ہیں اور انہی سے اکثر ایسے نکات بھی مل جاتے ہیں جو ہم ان کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ یوحنا کے پہلے خط کے پانچویں باب آیت سات کی اصلاح کو میں نے ان کو پکڑنے کے لیے استعمال کیا۔ لیکن بعض اوقات تو کج بحثی میں انتہاء کر جاتے ہیں اور ایسی نامعقول توجیہات پیش کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ان کی شائع کردہ ایک ڈکشنری نما کمنٹری سے ایک نمونہ پیش کرتا ہوں۔ نام ہے اس کا ''ایڈ ٹو بائبل انڈرسٹینڈنگ (Aid to Bible understanding)''

بائبل میں ہے کہ جب اسماعیل پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ سال تھی اور جب اسحاق پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ سو سال کے تھے۔ اس طرح اسماعیل کی عمر اسحاق کی پیدائش کے وقت چودہ سال بنتی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ جب اسحاقؑ کی دودھ چھڑائی کی دعوت ہوئی تو اس وقت اسحاقؑ کی والدہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اسماعیل اور اس کی والدہ کو گھر سے نکال دو۔ اب اگر اسحاق کا دودھ تین چار سال کی عمر میں چھڑایا گیا تو گھر سے نکالے جانے کے وقت اسماعیل کی عمر کم از کم سترہ، اٹھارہ سال بنتی ہے۔ اسی کمنٹری نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اسماعیلؑ کی عمر اُنیس سال تھی۔

اب اگر پیدائش کے باب اکیس میں حضرت ہاجرہ کو بیٹے کے ساتھ نکالنے کی تفصیل پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل ایک دودھ پیتے بچے تھے نہ کہ انیس سال کے نوجوان۔ خود یہی کمنٹری تسلیم کرتی ہے کہ بعض بائبلوں سے ایسا ہی تاثر ملتا ہے کہ وہ ننھے بچے تھے۔ اس تضاد کو اور تفسیروں نے بھی نوٹ کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ اس تضاد کو دور کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن یہوواوٹنس کی اس تفسیر میں اس تضاد کو دُور کرنے کی کوشش اس طرح کی ہے۔

(a) RSV میں ہے کہ ''ابراہیم صبح سویرے اُٹھا اور روٹی اور پانی کا مشکیزہ لیا اور ہاجرہ کو دیا اور اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بچے کے ساتھ اور اُسے چلتا کیا۔''

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشکیزہ اگر کندھے سے لٹکا لیا تو بچے کو کندھے سے لگا لیا۔ اب اُنیس سال کے لڑکے کو تو کندھے سے لگایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اس کمنٹری نے کیل کی کمنٹری سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قومہ اور الفاظ کے اضافہ کے ساتھ آیت اس طرح سے ہے کہ

''مشکیزہ تو کندھے پر رکھ دیا اور بچے کو اس کے حوالے کر دیا۔''

اردو بائیبل میں بھی ایسے ہی کر دیا گیا ہے۔ اب اگر الفاظ کے اضافے کے ساتھ آیت میں حسبِ منشاء تبدیلی کرنی ہے تو پھر تثلیث ڈالنے والوں نے کیا برا کیا۔ اس کی اب اصلاح کر رہے ہیں اور خود آیات کو بدل رہے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔

(b) آگے لکھا ہے ''جب مشکیزہ کا پانی ختم ہوا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔''

اب یہاں ماں لڑکے کو جھاڑی کے نیچے ڈال رہی ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ لڑکا ننھا بچہ ہے۔ اس کی توجیح یہ کی ہے کہ ''اسماعیل زیادہ صحت مند نہ تھا، ماں کے ساتھ جنگل میں گھومتے نڈھال ہو گیا۔ ماں سہارا دیتی لیے چلتی رہی۔ لیکن جب ماں بھی تھک گئی تو ایک جھاڑی کے پاس جا کر ماں نے اپنا سہارا ہٹا لیا جلدی سے اور لڑکا جھاڑی کے نیچے گر پڑا۔'' کیا دور کی کوڑی لائے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ''۔

اگر وہ لڑکا اُنیس سال کا تھا تو وہ تو خود ماں کو سہارا دے سکتا تھا بلکہ اُٹھا بھی سکتا تھا۔ پھر لکھا ہے کہ عبرانی زبان میں لڑکے کے لیے ''یلید'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جوان لڑکے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے یوسف کے بھائیوں نے استعمال کیا جب وہ یوسف کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ اسی طرح دلیل دی ہے کہ

''لمک نے بیویوں سے کہا کہ میں نے اس جوان آدمی کو قتل کر دیا جس نے مجھے زخمی کیا۔'' (پیدائش باب ۴:۲۳)

یہاں لڑکے (یلید) کا لفظ جوان آدمی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

آخر سیاق وسباق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر بھائی یوسف کو باہر کھیل کود کے لیے لے کر گئے تو ظاہر ہے وہ چھوٹا بچہ تو نہ تھا۔ اسی طرح اگر لڑکے نے لڑائی کی، زخمی کیا اور قتل ہوا تو ظاہر ہے وہ جوان لڑکا تھا۔ اس سے یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ اگر ماں لڑکے کو کندھے پر اُٹھاتی ہے یا ماں لڑکے کو جھاڑی کے نیچے رکھتی ہے تو وہ لڑکا بھی جوان ہی ہونا چاہیے۔ ایسی منطق یہوواوٹنس ہی کر سکتے ہیں۔ خود بائیبل میں لمک والے حوالے میں ترجمہ ''مرد، جوان آدمی'' کیا گیا ہے اور اسماعیل کے لیے Child بچہ کیا گیا ہے حالانکہ لفظ دونوں جگہ لڑکا (یلید) ہی ہے۔

آگے بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے، لکھا ہے:

''جبکہ وہ بچے کے بالمقابل بیٹھی تھی، بچے نے آواز بلند کی اور رویا۔ خدا نے بچے کی آواز سنی..........فرشتہ نے آسمان

سے ہاجرہ سے کہا............خدا نے لڑکے کی آواز سن لی ہے۔ اُٹھ، لڑکے کو اُٹھا اور اپنے ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑ۔''

(پیدائش باب ۲۱:۱۶-RSV۱۸)

یہاں بچے کے رونے اور فرشتہ کے ماں سے یہ کہنے سے کہ اُٹھ، بچے کو سنبھال، یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ لڑکا ایک ننھا بچہ ہے۔ سارے بیان سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے اور کوئی قرینہ ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہاں لڑکا ایک جوان مرد ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ اور بیٹے کو برداشت نہیں کیا۔ جب تک دونوں بے اولاد تھیں کوئی مسئلہ نہ پیدا ہوا۔ جونہی ہاجرہ حاملہ ہوئیں سارہ پریشان ہوگئیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حمل کے دوران بھی وہ ہاجرہ پر سختی کرتی رہیں یہاں تک کہ ہاجرہ کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور فرشتہ نے روک کر واپس جانے کو کہا۔ (پیدائش باب ۱۶:۶)

اور جب بچہ پیدا ہو گیا اور وہ بھی بیٹا، تو سارہ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابل برداشت ہوگئی اور پھر وہ ہوا جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔

سینکڑوں سال بعد جب اس کہانی کو یہود علماء نے لکھا تو سارہ کے اس سخت اقدام کو جواز دینے کے لیے انہوں نے اسحاق کے دودھ چھڑانے کی دعوت اور اس موقع پر اسماعیل کے اسحاق کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کی کہانی گھڑی۔ لیکن جھوٹ پکڑا گیا۔ تضاد پیدا ہو گیا تھا اور نہایت احمقانہ وضاحتیں اب پیش کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو تو اسحاقؑ کی پیدائش سے آٹھ دس سال پہلے ہی نکال دیا گیا تھا۔ مکہ کی وادی میں کئی سال قیام کے بعد حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا واقعہ ہوا۔ جس پر خوش ہو کر خدا نے ابراہیمؑ سے کہا ''تو نے اپنے اکلوتے بیٹے کو میری رضا کی خاطر قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا، دیکھ میں تجھے بڑھاؤں گا۔ یہاں تک زمین کی قومیں تیری ذریت سے برکت پائیں گی۔'' (پیدائش باب ۲۲:۱۶-۱۸)

اور پھر اپنے وعدے کو فوری طور پر پورا کرتے ہوئے خدا نے بشارت دی کہ سارہ سے بھی تجھے بیٹا دوں گا۔ اور پھر ایک سال بعد ہی اسحاق پیدا ہو گئے۔ اسحاق کی پیدائش انعام تھی اس قربانی کا جس میں ابراہیم، اسماعیل اور ہاجرہ نے حصہ لیا۔

ظاہر ہے کہ یہ نسلِ اسحاق، جو بنی اسرائیل کہلائے، اس دنیا میں اپنے جسمانی وجود کے لیے مصری شہزادی، ہاجرہ اور اس کے بیٹے اسماعیل کی قربانیوں کے مرہونِ منت ہے؛ اور میں اسحاق کے ان مغرور بیٹوں کو یاد دِلا دوں کہ وہ اپنے روحانی وجود کے لیے بھی ایک مصری شہزادی کے زیرِ احسان ہیں جس نے ننھے موسیٰ کو دریائے نیل سے بچایا تھا۔ شکر ہے کہ اس دوسری شہزادی کا اسماعیل سے کوئی رشتہ نہ تھا ورنہ یہ ناشکرے علماء یہود اس کو بھی فرعون کی لونڈی ہی گردانتے۔

؎ ''شرم ان کو مگر نہیں آتی''

(تفصیلی بحث اس موضوع پر میرے کتابچے میں ہے جس کا عنوان ہے Abrahama's Son of Promise, Isaac or Ishmael?)

مکرم مولانا حیدر علی صاحب ظفر کے ساتھ ایک عیسائی سے گفتگو

کولون میں ہمارے مشن ہاؤس کے قریب ایک بلڈنگ میں احمدی دوست رہتے تھے۔ ایک عیسائی شخص سے اُن کی گفتگو ہوتی۔ وہ شخص کٹر بھی تھا اور اُکھڑ بھی۔ وہ حضرت مسیح کی بے گناہی کو اس طرح اچھالتا جس سے دوسرے انبیاء کی توہین لازم آتی۔ مولانا حیدر علی صاحب ظفر ان دنوں کولون مشن میں متعین تھے۔ جماعت کے ایک سرگرم دوست مکرم رانا محمد خان صاحب نے ان سے اس شخص کا ذکر کیا۔ ایک روز میں کولون گیا تو مولانا نے مجھ سے کہا کہ اس سے بات کرنی چاہیے۔ رانا محمد خان صاحب کے ذریعہ وقت مقرر ہوا اور ہم اس سے ملنے گئے۔

چند منٹ تو عمومی باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے اسی بات کو دہرانا شروع کیا کہ صرف مسیح ہی گناہ سے پاک تھا۔ اور کوئی انسان بے گناہ نہیں، انبیاء بھی نہیں۔ میں نے وضاحت کی کہ دیکھو ہم بھی مانتے ہیں کہ مسیح بے گناہ تھے لیکن اس بات کو اس طرح نہ اُچھالو کہ دوسرے انبیاء کی توہین کا پہلو نکلے۔ لیکن وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُس بات کو ہی بار بار دہراتا رہا۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ جس طرح تم مسیح کو گناہ سے پاک ظاہر کر رہے ہو تو بائیبل سے تو اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس پر وہ جوش سے بولا کہ کیوں نہیں ہوتی۔ کیا کہتی ہے بائیبل اس بارے میں۔ میں نے کہا دیکھو لکھا ہے ''یوحنا آیا اور بیابان میں بپتسمہ دیتا۔ اور گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرتا۔ اور یہودیہ کے سب لوگ......اس کے پاس گئے اور گناہوں کا اقرار کر کے بپتسمہ لیا۔'' (مرقس باب ۱: ۴، ۵)

آگے لکھا ہے ''یسوع نے ناصرہ سے آ کر یردن میں یوحنا سے بپتسمہ لیا۔'' (آیت نمبر ۹)

اب یوحنا جو بپتسمہ دیتا تھا وہ گناہوں کی معافی کے لیے تھا۔ اور اس معافی کے لیے گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کرنی ضروری تھی۔ اب اگر مسیح نے یہ بپتسمہ لیا تو بے گناہی کہاں رہ گئی۔ کیا ضرورت تھی مسیح کو یوحنا کے پاس جانے کی اگر وہ ''بے گناہ'' تھے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ ان آیات کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ مطلب نہیں، وہ بپتسمہ کسی اور مقصد کے لیے تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے خود ان کو ضرورت نہ تھی۔

میں نے اپنی دلیل کو پھر بیان کیا کہ وہ بپتسمہ گناہ گاروں کے لیے تھا۔ اس بات کی منادی تھی کہ آؤ گناہوں کا اقرار کرو، توبہ کرو اور معافی لو۔ مسیح کا جانا اور بپتسمہ کے لیے اصرار کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس بپتسمہ کی ضرورت سمجھتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی بپتسمہ کیوں لیا اگر وہ ایسے بے گناہ تھے جیسے تم بار بار کہتے ہو کہ ان جیسا کوئی نبی بے گناہ نہ تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ یوحنا نے کہا تھا کہ تم کو بپتسمہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ میں خود تجھ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں۔

میں نے کہا کہ یوحنا کو کیا معلوم کہ کس کو ضرورت ہے، مسیح جانتا تھا کہ مجھے ضرورت ہے، تبھی تو مسیح نے جواب دیا تھا:

''اب تو ہونے ہی دے کیونکہ ہمیں اس طرح ساری راستبازی پوری کرنا مناسب ہے۔اور پھر یوحنا نے ہونے دیا۔''

پھر آگے لکھا ہے کہ جونہی بپتسمہ لیا:

''آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اُترتے دیکھا۔''

گویا بپتسمہ سے پہلے مسیح کامل راستباز نہ تھا۔ جونہی بپتسمہ لیا، کامل راستباز ہوا تو خدا کی روح نازل ہوئی۔ مسیح کی بپتسمہ سے پہلے اور بعد کی زندگی میں جو فرق آیا وہ واضح ہے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسیح کا بپتسمہ لینا دوسروں کے لیے محض نمونہ پیش کرنا نہ تھا، ان کی اپنی ضرورت تھی۔

وہ پھر بھی کج بحثی کرتا رہا۔ تو میں نے مثال دی کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ مکمل طور پر صحت مند ہے۔ اُسے کوئی تکلیف یا بیماری نہیں، نہ ہی کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ تو اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور ڈاکٹر سے مل کر علاج کروایا تو اس کا دعویٰ غلط ہوگا۔اب بپتسمہ میں گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کرنی ضروری ہے اور مسیح نے یہ سب کچھ کیا اور پھر جونہی وہ دریا میں نہا کر پاک صاف ہوئے تو روح القدس اُتر آئی۔اب بپتسمہ کے بعد تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے گناہ تھے، لیکن بپتسمہ سے پہلے وہ بے گناہ ثابت نہیں ہوتے بائیبل کے مطابق۔

اب وہ جواب تو کوئی دے نہ سکا، طنزیہ طور پر بار بار یہی کہتا رہا کہ آپ لفظوں سے کھیل رہے ہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ اس پر حیدر علی صاحب ظفر نے اس کو ڈانٹا کہ تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں، الفاظ کے استعمال میں احتیاط کرو۔ پھر اس نے قرآن کریم کے پرانے کوفی رسم الخط کی فوٹو سٹیٹ دکھا کر کہا کہ ان پر اعراب نہیں۔ اعراب کے ردّ و بدل سے مفہوم بدل سکتا ہے۔لہٰذا قرآن کریم محفوظ نہیں جیسا آپ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ جواباً مولانا حیدر علی صاحب ظفر نے سمجھایا کہ یہ تمہاری کم علمی ہے۔ عربوں کو اعراب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو غیر عربوں کے لیے لگائے گئے تھے۔ آج بھی عرب اخباروں اور کتابوں میں اعراب نہیں ہوتے۔لیکن سب پڑھنے والے عبارت کو ٹھیک پڑھتے ہیں اور ٹھیک سمجھتے ہیں۔ پھر مولانا نے بتایا کہ قرآن کریم کی اصل حفاظت تو ان سینکڑوں، ہزاروں حفاظ سے ہوئی جن کے سینے میں قرآن محفوظ تھا۔اور جو قرآن کی تلاوت کے لیے کسی تحریری قرآن کے محتاج نہ تھے۔ اور تحریر میں اگر کوئی کتابی غلطی ہوتی تو وہ اس کی اصلاح کر سکتے تھے۔اور اب تو اِن حفاظ کی تعداد لاکھوں میں ہے اور ساری دنیا میں موجود ہیں۔

اس کو مزید بتایا کہ خود عیسائی محققین نے تسلیم کیا ہے کہ آج کا قرآن وہی ہے جو بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دیا اور عیسائی علماء کی تمام کوششیں قرآن میں کسی تبدیلی کو ثابت کرنے کے لیے ناکام ہوئی ہیں۔اس کے برعکس خود عیسائی علماء مانتے ہیں کہ اصل بائیبل محفوظ نہیں۔صرف تراجم ہیں اور ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی تو بائیبل ہی الگ الگ ہے۔پس بائیبل کا قرآن سے تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔

یہی دو موٹے موضوعات تھے جن پر وہ دوستوں سے بات کرتا تھا اور اس روز اُن پر کھل کر بات ہوگئی تھی اور کافی حد تک اس کی تسلی کرادی تھی۔ ویسے وہ غیر سنجیدہ اور ضدی قسم کا انسان تھا۔

کوبلنز میں تبلیغی نشست

کوبلنز میں بھی جماعت کے دوستوں سے عیسائیوں کی بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ جب کچھ گرما گرمی ہوئی تو طے پایا کہ دونوں طرف سے انگریزی بولنے والے مناظر بلا کر بحث کرائی جائے۔ ان دنوں کولون میں مکرم چودھری سعید الدین صاحب ریجنل امیر تھے۔ دوستوں نے ان سے کہا اور انہوں نے مجھے مقرر کر دیا کہ میں وہاں جا کر بات کروں۔ چنانچہ میں ٹرین کے ذریعہ وہاں پہنچا اور دوستوں نے سٹیشن سے لے کر مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں گفتگو ہونی تھی۔

دوسری طرف دو درمیانی عمر کے اچھے سلجھے آدمی تھے، تھے تو وہ جرمن لیکن انگلش اچھی بولتے تھے۔ سٹٹ گارٹ کی طرح یہاں بھی اڑھائی گھنٹہ کی گفتگو کے دوران عیسائیت کے مختلف عقائد پر بات ہوئی اور اچھے دوستانہ انداز میں ہوئی۔ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ مقصد حقیقت کو سمجھنا ہے نہ کہ ہار جیت۔ تقریباً سبھی اہم عقائد زیر بحث آئے۔ میں سوال کرتا اور وہ وضاحت کرتے رہے۔ میں بائیبل سے توڑ پیش کرتا اور وہ دفاع کرتے۔ دورانِ گفتگو میں گاہے گاہے یاد دِلاتا رہا کہ اگر اندھا اعتقاد رکھنا ہے تو خوشی سے رکھیں لیکن دوسروں کی تسلی کے لیے تو آپ کو عقلی اور نقلی دلائل سے کام لینا ہوگا۔ اچھی پرلطف گفتگو رہی تھی، آخر میں انہوں نے میرے اندازِ گفتگو کو سراہا تھا، اور جاتے ہوئے جب میں نے ہاتھ ملایا تو بڑے مناظر نے میرے ہاتھ کو دبا کر کہا ''مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تم ہم سے زیادہ بائیبل جانتے ہو،'' میں نے شکریہ ادا کیا اس کی حوصلہ افزائی کا۔

بیٹوں کی شادی

یہاں ریکلنگ ہاؤسن آتے ہی جس امر نے ہمیں فکر مند کیا وہ لڑکوں کی شادیاں تھیں۔ خصوصاً بڑے لڑکے عبدالشکور کی شادی میں تاخیر مناسب نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے رشتے تلاش کرنے شروع کیے۔ شعبہ رشتہ ناطہ جرمنی کی وساطت سے ہمیں خدا کے فضل سے اچھا رشتہ مل گیا اور ہم نے عبدالشکور کی شادی ۱۹۹۳ء میں کر دی۔

دوسرے لڑکے عبدالسبوح کے لیے ہمیں انگلینڈ میں اچھا رشتہ مل گیا اور ۱۹۹۷ء میں ہم برطانیہ گئے اور وہاں شادی کے بعد رخصتانہ بھی ایک ہوٹل میں کر دیا اور پھر وہیں ولیمہ کر کے واپس لوٹے۔

یہ دونوں وہیں آسٹریا کے بارڈر کے پاس ایمن سٹیڈ میں ہی رہتے تھے۔ وہیں انہوں نے ملازمت تلاش کر لی تھی اور پھر شادی کے بعد وہیں رہنے لگے۔ اب تو دونوں کے تین تین بچے ہیں۔

لڑکوں کی سیاسی پناہ کی درخواست ۔ ردّ ہونے کے بعد اپیل

یہ دونوں بڑے لڑکے ۱۹۸۹ء میں جرمنی آئے تھے۔ سیاسی پناہ کی درخواست ان کی چند ماہ بعد ہی ردّ کر دی گئی تھی۔ وکیل نے اپیل کی اور یہ اپیل برسوں چلتی رہی۔ اسی اثناء میں بڑے کی شادی ہوگئی اور چھوٹے نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں کچھ مہارت حاصل کر لی۔ نائیجیریا کے اُنیس سالہ قیام کے دوران بڑے نے الیکٹریکل ڈپلومہ حاصل کیا تھا اور دوسرے نے الیکٹرانکس میں۔ میں اُن سے ایک سال بعد جرمنی آیا اور میری درخواست منظور ہو چکی تھی اور مجھے نیلا پاسپورٹ بھی مل چکا تھا جبکہ ان لڑکوں کی قسمت کا فیصلہ ابھی تک نہ ہوا تھا۔ یہ صورتحال میرے لیے بہت پریشان کن تھی۔ اگر ان کی درخواست حتمی طور پر ردّ ہوتی تو یہ پورے خاندان کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہوتا۔ اگر یہ پاکستان میں بڑھے، پڑھے ہوتے تو واپس جا کر کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ تو نائیجیریا سے آئے تھے اور پاکستان اُن کے لیے ایک غیر ملک تھا۔ اب اگر یہ پاکستان جانے پر مجبور ہوتے تو اس پریشان کن صورتحال کی ساری ذمہ داری مجھ پر آتی تھی۔ اپنے بیگانے سب یہ کہتے کہ ۱۹۷۱ء میں تم نے وقف کر کے غلطی کی تھی اور وہ بات درست ثابت ہوتی کہ میں نے ۱۹۷۱ء میں نوکری چھوڑ کر

''اپنے ساتھ اپنے بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔''

میں سوچتا اگر ان لڑکوں کو واپس بھیج دیا گیا تو خود میرا یہاں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ وہاں ہمارا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ عجب گھمبیر صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ نائیجیریا میں بھی ایسے نازک حالات سے کئی بار گزرنا پڑا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہی دستگیری فرمائی تھی۔ اب بھی دعائیں ہی میرا سہارا تھیں۔

عدالت عالیہ انس باخ (Ansbach) میں پیشی ۔ ''ایک زندہ خدا موجود ہے''

بالآخر پانچ سال بعد لڑکوں کو انس باخ کی عدالت کی طرف سے حاضر ہونے کا خط ملا۔ انس باخ کی عدالت کے بارے میں سنا تھا کہ بہت سخت ہے۔ غیر ملکیوں خصوصاً پاکستانیوں کا کیس تو شاید ہی کبھی وہاں منظور ہوا ہو۔ یہ اطلاع ہمارے لیے بہت تشویش ناک تھی۔ لڑکوں کا وکیل یہاں ہاٹرن کا ہی تھا۔ میرا بھی وہی تھی۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ اچھی تیاری کر کے عدالت میں جائے لیکن اس نے کچھ بجھے سے انداز سے کہا:

''دیکھو! تمہارے کیس میں جان تھی۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا اور میرا خیال درست نکلا۔ لیکن تمہارے لڑکوں کے کیس میں جان نہیں۔ میں نے اپیل میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر دی ہے لیکن دوسری طرف کے دلائل بہت قوی ہیں۔ مجھے کامیابی کی امید نہیں۔ عدالت بھی سخت ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ خود ہی وہاں تاریخ بھگت لیں، مجھے نہ بلائیں، خواہ مخواہ خرچہ پڑے گا۔''

اس کے اس قدر مایوسی کے اظہار پر مجھے قدرتی طور پر حیرانی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔ میرے لیے یہ کیس زندگی موت

کا مسئلہ تھا۔ کچھ دیر میں گردن جھکا کر سوچتا رہا۔ پھر میں نے اس سے کہا ''تمہیں یہی فکر ہے ناں کہ اگر ہم ہار گئے تو خرچہ ہمیں دینا پڑے گا، فکر نہ کرو۔ لڑکے کام کرتے ہیں، دے لیں گے خرچہ جتنا بھی ہوگا۔''

پھر میں نے کہا ''جہاں تک عدالت اور اس کی سختی کا تعلق ہے تو ہم خدا پر توکل کرتے ہیں Es gibt einen lebendigen Got (ایک زندہ خدا موجود ہے) تم تیاری کرو اور چلو۔''

وکیل کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا ٹھیک ہے ہم انس باخ میں ملیں گے۔

عدالت میں پیشی کو آٹھ دس دن باقی تھے۔ یہ دن میں نے دعاؤں اور سوچوں میں گزارے۔ چلتے پھرتے خدا سے باتیں کرتا رہتا۔ اے خدا! پچیس سال پہلے میں ان بچوں کو لے کر وطن سے نکلا تھا اور تیرے نام پر نکلا تھا۔ پھر بیس سال تک افریقہ کے جنگلوں میں گھومتا رہا۔ قدم قدم پر تو نے اپنی حفظ و امان میں رکھا۔ فضل و کرم سے نوازا۔ اب بھی اپنا کرم فرما اور کوئی کرشمہ دکھا۔ اب اگر میں کسی ابتلا میں پڑ گیا تو تو جانتا ہے کہ میرا حشر کیا ہوگا۔ کیا کیا باتیں، طعنے سننے پڑیں گے۔

''طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں۔''

ان میں تیرا اور تیری جماعت کا نام بھی آئے گا۔ تو اپنی جماعت کے نام کے صدقے ہمیں معاف فرما اور پردہ پوشی کر۔ وکیل کہتا ہے کوئی امید نہیں لیکن تو ہی ہمارا نعم الوکیل ہے اور نعم المولیٰ بھی۔

عدالت میں حاضری اور تائید الٰہی

میرا خیال تھا کہ تاریخ سے ایک دن پہلے لڑکوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اسی پروگرام کے مطابق میں نے تیاری کر لی اور لڑکوں کو اطلاع دے دی۔ روانگی سے تین چار دن پہلے اہلیہ نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے کہا کہ ایک دن پہلے جا کر آپ کیا کریں گے۔ دو تین دن پہلے جائیں تا کہ ان کو کچھ کیس کی تیاری کرا سکیں۔ کچھ سمجھا سکیں۔ اس طرح سیدھے عدالت میں جانے سے کیا فائدہ۔ اہلیہ کے مشورہ میں بہت وزن تھا اور میں نے فوری طور پر تیاری کی اور روانہ ہو گیا۔ راستے میں نکات نوٹ کرتا رہا۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں آیا کہ میں زندگی کے ایک بہت اہم سفر پر جا رہا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ مسافر کی دعا کو خاص قبولیت حاصل ہوتی ہے اور باپ کی دعا کو بھی جو بیٹے کے لیے ہو۔ اور میں یہ سفر بیٹوں کے لیے کر رہا ہوں اور حالات کے ہاتھوں مجبور اور مظلوم بھی ہوں۔

انٹرسٹی کا ڈبہ تقریباً خالی تھا۔ میں اُٹھا اور پیچھے جا کر تنہائی میں ایک سیٹ پر بیٹھ کر ظہر و عصر کی نماز نیت لی۔ نماز شروع کرتے ہی ایسا حضور قلب میسر آیا کہ ارد گرد سے بے خبر ہو گیا۔ بڑے درد اور الحاح سے دعا کی توفیق ملی۔ مجھے اُمید ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ میرے اس سفر کو بابرکت فرما دے گا۔

ایمن سٹیڈ پہنچ کر میں نے دو دن تک لڑکوں کو تیاری کرائی۔ نکات سمجھائے اور واقعات یاد کروائے۔ ڈیڑھ سو میل کے

فاصلے پر انس باخ تھا۔ ہم روانہ ہوئے اور وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے شہر میں پہنچ گئے۔ لیکن ہم یہ بھول گئے کہ بڑے شہر میں عدالت کو ڈھونڈنا اور پارکنگ کے لیے جگہ تلاش کرنا کافی وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ شہر میں داخل ہو کر ایک بڑی سڑک کے کنارے ہم نے گاڑی روکی۔ ایک شخص آیا اور اپنی کار میں بیٹھنے لگا تو میں نے اس کو عدالت کا خط دکھا کر رہنمائی چاہی۔ اس نے خط دیکھا اور پھر گھڑی دیکھی اور کہا:

''آپ کے پاس وقت کم ہے۔ عدالت کے قریب پارکنگ بھی نہیں ملتی۔ یوں کریں آپ گاڑی میرے پیچھے لگائیں۔ میں آپ کو عدالت تک بھی لے چلوں گا اور اپنی پارکنگ بھی دوں گا۔ خود میں گاڑی کسی گلی میں پارک کر لوں گا۔''

چنانچہ ہم نے گاڑی اس کی گاڑی کے پیچھے لگائی۔ دس منٹ میں پہنچ گئے۔ پھر اس نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں پارک کر لیں۔ اس طرح ہم وقتِ مقررہ سے صرف چند منٹ پہلے پہنچ سکے۔ وہ شخص ایک فرشتہ بن کر ہماری مدد کو آیا ورنہ ہم کبھی وقت پر نہ پہنچ سکتے۔ اس تائیدالٰہی سے مجھے مزید حوصلہ ہوا لیکن عدالت کا خوف تو حاوی تھا۔ ہم پہنچے تو وکیل بڑی پریشانی سے ہمارا منتظر تھا۔ اگر وہ شخص ہماری مدد نہ کرتا تو ہم ویسے ہی کیس ہار جاتے۔ اللہ تعالیٰ کیسے کیسے اسباب سے انسانی کوتائیوں کے نقصانات سے بچاتا ہے۔

پریشان کن کارروائی - خوشکن فیصلہ

ہم کمرۂ عدالت میں بیٹھے تھے کہ تین جج داخل ہوئے۔ ہم کھڑے ہو گئے۔ وکیل نے آگے بڑھ کر کہا کہ لڑکوں کا والد بھی موجود ہے۔ جج نے اجازت نہ دی۔ میں اُٹھ کر باہر آ گیا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ میری بہو کچھ فاصلے پر بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے کئی بار کہا کہ میں بیٹھ جاؤں لیکن سکون ہوتا تو بیٹھتا۔ گھبراہٹ سے برا حال تھا۔ دعاؤں میں مصروف مسلسل ٹہلتا رہا۔ آدھ پون گھنٹہ بعد دونوں لڑکے اور وکیل پریشان حال باہر آئے اور تیزی سے میری طرف لپکے۔ سب بیک وقت بول رہے تھے۔ میں تو پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر تو ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ میں نے سنبھل کر اُن سے پوچھا کہ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔ لڑکوں کو میں نے چپ کرایا تو جلدی سے وکیل نے بتایا کہ سوالات مشکل تھے۔ لڑکے ٹھیک سے جواب نہیں دے سکے۔ جج مطمئن نظر نہیں آتے۔ بعض سوال میرے متعلق تھے۔ اب وقفہ ہوا ہے۔ وقفہ کے بعد میں بھی ساتھ اندر چلوں اور ان کے سوالوں کا جواب دوں ورنہ معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ اتنے میں جج واپس آتے دکھائی دیئے۔ ہم اندر گئے اور کھڑے ہو گئے، جج اندر آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ جج بیٹھیں گے تو ہم کچھ عرض کریں گے لیکن جج آئے اور کھڑے ہی رہے اور فیصلہ سنانا شروع کر دیا۔ ہم سر جھکائے کھڑے رہ گئے۔

مترجم نے آہستہ آہستہ ساتھ ساتھ فیصلہ کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ فیصلہ چھوٹا تھا۔ دونوں لڑکوں کی اپیل منظور کر لی گئی تھی۔ میرے نعم الوکیل زندہ خدا نے اپنا کرشمہ دکھا دیا تھا۔ ہم خوشی سے پاگل باہر نکلے، ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر مبارکباد

دینے لگے۔ وکیل بھی خوشی سے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ بغل گیر ہو کر مبارکباد دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرا تیسرا بیٹا ہو، کیوں نہ خوش ہوتا، اس کیس کا فیصلہ اس کے لیے بھی معجزہ سے کم نہ تھا۔ بقول ایک پاکستانی کے اس کمرۂ عدالت سے کبھی کسی پاکستانی کو خیر کی خبر نہ ملی تھی۔ بہو نے یہ سب کچھ دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔ ابھی چند منٹ پہلے تو یہ پریشان حال باہر آئے تھے۔ آپ اندر گئے تو دو منٹ بعد ہی خوشیاں مناتے باہر آ گئے، اندر ہوا کیا۔ میں نے کہا اندر تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم تو صرف فیصلہ سننے گئے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ تو اس کمرے میں ہوا جہاں جج وقفہ کرنے گئے تھے۔

''احمدیہ'' فیصلہ کن لفظ

گھر پہنچ کر میں نے اپنے منجھلے بیٹے سے پوچھا کہ تم لوگ سخت پریشان تھے کہ جج مطمئن نہیں۔ ہم جواب تسلی بخش نہیں دے سکے۔ وکیل بھی پریشان تھا لیکن فیصلہ تمہارے حق میں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وقفہ سے پہلے آخری وقت میں کچھ ہوا جس سے عدلیہ کی رائے بدلی۔ مجھے بتاؤ کہ آخر میں کیا ہوا تھا۔

اس نے کہا کہ آخری وقت میں مَیں نے الفضل میں چھپی وہ خبر دکھائی جس میں ذکر تھا کہ پولیس بورے والا ہمارے گھر پر آئی تھی کلمہ مٹانے کے سلسلے میں۔ جج نے مترجم سے کہا کہ وہ دیکھے کہ کیا گھر کا پتہ وغیرہ درست ہے اور خبر میں وہی کچھ لکھا ہے جو یہ کہتا ہے۔ مترجم نے تصدیق کی لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یہ اخبار ان کی اپنی جماعت کا ہے۔ اس پر میں مترجم کو ''پڑ'' گیا اور جرمن بولنی شروع کر دی اور کہا: ''Doch Das ist Eine Zeitung لیکن ہے تو یہ اخبار۔ اگر ہماری خبر ہمارے اخبار میں نہیں چھپے گی تو کیا ہمارے مخالف اخباروں میں چھپے گی۔'' جج حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر میں نے بریف کیس سے اپنی ڈگری نکالی اور ہوا میں لہراتے ہوئے جرمن زبان میں ہی عدالت سے کہا ''میں انجینئر ہوں، یہ میری ڈگری ہے، پاکستان میں مَیں باعزت، آرام دہ زندگی گزار سکتا تھا لیکن یہاں میں ہوٹل میں کام کرتا ہوں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں پیسے کمانے آیا ہوں۔ پاکستان میں اس ڈگری کی وقعت زیرو ہو گئی ہے کیونکہ اس پر میرے والد کے ایڈریس میں احمدیہ ہسپتال اجی بوا وڈے لکھا ہے۔ اس لفظ احمدیہ کی وجہ سے کوئی مجھے وہاں ملازمت نہ دے گا۔''

اس پر وکیل نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے بڑھ کر ڈگری جج کے سامنے رکھ دی۔ اس نے دیکھی اور دوسرے جج کو دے دی۔ اس نے دیکھ کر تیسرے جج کو دے دی اور پھر وہ اُٹھ کر وقفہ پر چلے گئے۔

میں نے کہا پھر تو واضح ہے کہ اس لفظ ''احمدیہ'' نے ہی ان کی رائے بدلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نکھار کر دکھا دیا ہے کہ اپنی جماعت کے نام کے صدقے ہی تم پر رحم کر رہا ہوں۔

فالحمد للّٰہ غفور الرحیم

اس کے بعد اُن کو جلد ہی نیلا پاسپورٹ مل گیا اور پھر سات سال بعد نیشنلٹی مل گئی۔ بڑا لڑکا تو ابھی تک وہیں ایمن سٹیڈ

میں ہی ہے جبکہ دوسرا پہلے یہاں ریکلنگ ہاؤس آیا پھر برطانیہ منتقل ہو گیا۔ یہاں جرمنی میں اس کو مناسب ملازمت نہ مل سکی تھی۔ اب تو اس کے پاس برطانیہ کی نیشنلٹی بھی ہے۔

ریجنل امارت-ایک اعزاز ایک ذمہ داری

مئی ۱۹۹۷ء میں محترم مولانا حیدر علی صاحب ظفر نے جو اس وقت کولون میں بطور ریجنل امیر اور مربی سلسلہ متعین تھے۔ مجھے فون پر بتایا کہ انہوں نے میرا نام ویسٹ فالن کے ریجنل امیر کے طور پر تجویز کیا ہے اور نیشنل امیر صاحب نے منظوری کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خدمت میں بھجوایا ہے۔ میں تو سنتے ہی اس ذمہ داری کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا، فکر مند ہو گیا اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مولانا نے حوصلہ دِلایا۔ میں نے کہا مجھے تو اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ فقرہ یاد آ رہا ہے کہ ''روح تو تیار ہے لیکن جسم کمزور ہے۔''

میرے لیے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے مولانا سے دعا کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت رہے گی۔ میں ڈیڑھ سال تک ہی اس خدمت کو بجالا سکا کیونکہ میرے کولہے کی ہڈی میں تکلیف ہو گئی تھی جس کا علاج بہت لمبا چلا اور دو ماہ تک تو ہسپتال میں داخل رہنا پڑا تھا۔ جتنا عرصہ بھی میں ریجنل امیر رہا محترم حیدر علی صاحب ظفر کا تعاون مجھے حاصل رہا اور میں اُن سے رہنمائی لیتا رہا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے ساتھ البانین کی محفل سوال وجواب

میرے عرصہ امارت کے دوران آہاؤس میں البانین دوستوں کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی محفل سوال وجواب منعقد ہوئی۔ اگست ۱۹۹۷ء میں ہونے والی یہ محفل شہر کے ایک وسیع ہال میں منعقد ہوئی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ حاضری بہت حوصلہ افزا تھی اور دو گھنٹہ تک چلی تھی۔

اس محفل کے انتظامات صدر جماعت آہاؤس خواجہ بشیر احمد صاحب نے مکرم حیدر علی صاحب ظفر کی نگرانی میں کئے تھے۔ جولائی ۱۹۹۷ء میں میرے بیٹے کی شادی تھی۔ پہلے شادی کے انتظامات میں مصروف رہا پھر بارات لے کر برطانیہ گیا۔ اس طرح میں خود اس تبلیغی نشست کے انتظامات میں زیادہ حصہ نہ لے سکا تھا۔ اس موقع پر نیشنل امیر صاحب نہ آ سکے تھے اور نہ ہی مبلغ انچارج مولانا کلیم صاحب موجود تھے۔ نیشنل سیکرٹری تبلیغ مکرم زبیر خلیل صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ حضور کے ساتھ سٹیج پر کوئی ہونا چاہیے۔ حضور نے کچھ کہنا یا پوچھنا ہوگا۔ اس لیے آپ حضور کے ساتھ بیٹھ جائیں۔

میں نے حیدر علی صاحب ظفر کو بتایا جو سیکرٹری صاحب تبلیغ نے کہا تھا اور کہا کہ آپ بیٹھ جائیں لیکن وہ مجھے کہتے رہے۔ بالآخر میں حضور کے ساتھ بیٹھ گیا لیکن اپنے ساتھ مولانا حیدر علی صاحب ظفر کو بھی بٹھا لیا۔ سارے انتظامات کی نگرانی انہوں نے کی تھی۔ ایک دو دفعہ آواز نہ پہنچنے کی شکایت ہوئی تو انہوں نے ہی جا کر اس کو دُور کروایا تھا۔ میں تو سارا وقت منہ پر رومال رکھے

استغفار اور دعاؤں میں مصروف رہا کہ یہ محفل بخیریت اختتام پذیر ہو جائے۔

جونہی محفل ختم ہوئی تو بعض دوستوں نے درخواست کی کہ وہ بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پروگرام میں شامل نہ تھا۔ حضور نے درخواست قبول فرمالی اور سٹیج کے سامنے ہال میں ایک چھوٹی میز اور کرسی رکھ دی گئی ہال میں تین قطاریں لگ گئیں۔ میں نے سٹیج سے چھلانگ لگائی اور ان تین آدمیوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے حضور کے ہاتھ کو پکڑا تھا۔

یہ محفل سوال و جواب میرے لیے اس لحاظ سے بہت بابرکت ثابت ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار مجھے خلیفۂ وقت کے ساتھ سٹیج پر بیٹھنے کا اعزاز ملا اور زندگی میں پہلی بار مجھے خلیفۂ وقت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی سعادت ملی تھی۔

میری نیشنلٹی کی راہ میں رکاوٹ

نیلا پاسپورٹ ملنے کے بعد ہمیں سیاست کے سوا سارے شہری حقوق مل گئے تھے لیکن اس پر ہم پاکستان نہیں جا سکتے تھے۔ پاکستانی پاسپورٹ بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب ہمیں یہاں رہتے ہوئے چند سال ہو گئے تو ہمیں پاکستان کی یاد آنے لگی۔ بہن بھائی، عزیز و اقارب کے علاوہ دوسرے مسائل بھی تھے جن کے لیے ہمارا وہاں جانا ضروری تھا۔ لیکن یہاں ہم پھنس کر رہ گئے تھے۔

جن دوستوں کو پاکستانی پاسپورٹ پر رہائشی ویزہ ملا تھا وہ ہمارے سامنے پاکستان جاتے اور آتے اور ان کو دیکھ کر ہمیں اور بھی زیادہ اپنی محرومی کا احساس ہوتا۔ بعض ہمیں مشورہ دیتے کہ یہ نیلا پاسپورٹ واپس کر کے پاکستانی پاسپورٹ پر ویزہ لے لیں۔ وہ مثالیں بھی دیتے کہ فلاں فلاں شخص نے ایسا کیا ہے۔ یہ بات میرے دل نہ لگتی تھی۔ اہلیہ تو ایسی مثالوں سے بہت متاثر ہوتی اور اکثر کہتی کہ ہم تو یہاں ہی پھنس کر رہ جائیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ لوگ کبھی پاکستان نہ جا سکیں گے۔ صرف ایک صورت ہے کہ آپ کو نیشنلٹی مل جائے، اور وہ آپ کو مل نہیں سکتی کیونکہ آپ نے یہاں ملازمت نہیں کی اور سوشل ہیلپ پر گزارہ کر رہے ہو۔ یہ بات درست تھی اور میں خود اس صورتحال پر پریشان رہنے لگا تھا۔ ایک دعاؤں پر ہی میرا تکیہ تھا۔

ایک سوشل ورکر کے کہنے میں آ کر میں نے پاکستانی پاسپورٹ پر ویزہ لینے کی کوشش بھی کی لیکن جرمنی سے ملک بدر ہونے سے بال بال بچا۔ پتہ یہ چلا کہ پہلے ایسا ہوتا تھا لیکن چند سال پہلے قانون بدل گیا تھا اور ایسی کوشش ہی اب ''سیاسی پناہ'' کو ختم کر سکتی ہے۔ خود اس سوشل ورکر کو علم نہ تھا بلکہ اس ایمیگریشن افسر کو بھی علم نہ تھا جس نے حامی بھری تھی کہ ویزہ دے دے گا۔ ان کی غلطی کی آڑ میں مَیں بچ گیا۔

نیشنلٹی کی درخواست

سنا تھا کہ نیلے پاسپورٹ کو اگر سات سال گزر جائیں تو نیشنلٹی کے لیے درخواست دی جا سکتی ہے۔ میں نے دفتر جا کر پتہ کیا تو متعلقہ افسر نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اور بھی کئی شرائط ہیں۔ تم ان کو پورا نہیں کر سکتے لہٰذا خاموشی سے بیٹھے رہو۔ ادھر

پاکستان گئے ہوئے دس سال سے زائد ہو گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر مشورے شروع کر دیئے۔ شہری انتظامیہ کا ایک ریٹائرڈ افسر ایک رفاہی تنظیم کا سربراہ تھا۔ اس سے سلام دعا ہوتی تھی۔ اس سے بات کی تو اس نے کچھ مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ سیاسی پناہ سے متعلق قانون کی کتاب بک سٹال پر دستیاب تھی۔ میں نے خرید کر پڑھی۔ اس میں مجھے کچھ استثناء نظر آئے جن سے میرا خیال تھا کہ میں فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ پھر میں محکمہ ملازمت میں جا کر اعلیٰ افسر سے ملا اور پوچھا کہ میں ہر تین ماہ بعد آپ کے ہاں حاضری لگواتا رہا ہوں۔ مجھے ملازمت ملنے کا کہاں تک امکان ہے۔ اس نے کہا کہ تم ۶۴ سال کے قریب پہنچ چکے ہو۔ اس عمر میں تو کوئی امکان نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ بات لکھ کر دے دو۔ چنانچہ اس نے ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیا۔

یہ سب معلومات لے کر میں اس ریٹائرڈ افسر کے پاس گیا اور ہم نے مل کر درخواست تیار کی۔ آخر میں مَیں نے ان استثنائی قوانین کا حوالہ دے کر لکھا کہ میرا کیس ان سے متعلق ہے اور اس پر غور ہونا چاہیے۔ میں نے یہ سوچ بچار ۱۹۹۸ء میں شروع کی تھی اور تیاری کرتے کرتے ۱۹۹۹ء آ گیا تھا۔ اسی دوران ملک میں انتخابات ہوئے اور سولہ سال سے برسراقتدار CDU پارٹی ہار گئی اور SPD کی حکومت آ گئی۔ اس تبدیلی سے ہمیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑنا چاہیے تھا لیکن مجھے کچھ خیال آیا تھا کہ پہلی حکومت کو تو ہم سولہ سال سے جانتے ہیں۔ یہ نئی حکومت کہیں غیر ملکیوں کے بارے میں سخت نہ ثابت ہو۔ پھر سنتے تھے کہ نئی پارلیمنٹ میں غیر ملکیوں سے متعلق کسی قانون پر بحث ہو رہی ہے۔ اصل نوعیت کا تو کچھ علم نہ تھا۔

قانون کی تبدیلی سے نیشنلٹی کا امکان - اندھیرے میں روشنی کی کرن

ایک ماہ بعد مجھے میری درخواست کا جواب ملا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ جو نکات تم نے اٹھائے ہیں وہ درست ہیں لیکن وہ فیڈرل گورنمنٹ کے قوانین کے مطابق ہیں۔ یہاں صوبائی حکومت نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ صوبائی منسٹر نے پابندی لگائی ہے کہ سیاسی پناہ والا کوئی شخص نیشنلٹی نہیں لے سکتا۔ اگر وہ سوشل ہیلپ لیتا ہو۔ پس سیاسی پناہ والوں کے قانون کے تحت آپ کو نیشنلٹی ہم نہیں دے سکتے۔ مشورہ دیا گیا تھا کہ کسی ملازمت یا کاروبار کے ذریعہ اپنے مالی حالات بدلوں، اور یہ میرے لیے ممکن نہ تھا۔ نائیجیریا کی طرح پھر ایک ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا تھا۔ خط کے آخر میں روشنی کی ایک کرن دکھائی گئی تھی، لکھا تھا کہ اس وقت پارلیمنٹ میں غیر ملکیوں کے عمومی قانون کی تبدیلی پر بحث ہو رہی ہے۔ اگر یہ مجوزہ تبدیلی ہو گئی تو پھر اس قانون کے تحت تمہیں نیشنلٹی مل سکتی ہے۔ لہٰذا تم ذرائع ابلاغ سے معلومات حاصل کرتے رہو۔ اگر یہ تبدیلی منظور ہو گئی تو ہم سے رابطہ کرنا۔ پہلے قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر ملکی پندرہ سال سے ملک میں رہتا ہو تو اس کو نیشنلٹی دی جا سکتی ہے۔ اور اب اس پندرہ سال کی میعاد کو کم کر کے آٹھ سال کیا جا رہا تھا۔ اور میں اس سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ جہاں تک شرائط کا تعلق ہے وہ نیشنلٹی خواہ ''سیاسی پناہ'' کے قانون کے تحت ہو یا غیر ملکیوں کے قانون کے تحت، دونوں صورتوں میں تقریباً برابر تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ''سیاسی پناہ'' والوں پر صوبائی حکومت نے پابندی لگا رکھی تھی جبکہ غیر ملکیوں سے متعلق قانون پر صوبائی پابندی نہ تھی اور پندرہ سال سے کم ہو کر آٹھ سال

کی شرط ہوتے ہی میں اس کے تحت نیشنلٹی لے سکتا تھا۔ (قبل اس کے کہ صوبائی حکومت اس پر بھی پابندی لگا پاتی۔)

میں یہ خط لے کر اپنے اس دوست کے پاس گیا۔ وہ سیاسی آدمی تھا اور پارلیمنٹ کی کاروائی سے واقف تھا۔ اس نے خط پڑھتے ہی میز پر زور سے مکہ مار کر کہا ''وہ آرہا ہے، وہ آرہا ہے۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا کہ وہ قانونی تبدیلی تقریباً منظور ہو چکی ہے۔ نئے سال کے ساتھ ہی اعلان ہو جائے گا۔ جاؤ جا کر دو تین ماہ انتظار کرو۔ یہ دو تین ماہ صبر اور صلوٰۃ سے خدا کی استعانت حاصل کرنے کے لیے میں نے استعمال کیے۔

نئے قانون کے تحت نیشنلٹی

جنوری ۲۰۰۰ء میں نئے قانون کا اعلان ہو گیا۔ میں اس ریٹائرڈ افسر سے ملا۔ اس نے کہا کہ تم اس خط کا حوالہ دے کر ان کو لکھ دو۔ پھر خود ہی اس نے مجھ سے خط لیا اور میونسٹر متعلقہ صوبائی افسر کو فون کر کے میرا کیس یاد دلایا اور کہا کہ اب تو قانون میں تبدیلی آ چکی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر سے کہو کہ دو ہفتہ بعد اپنے شہر کے دفتر سے رابطہ کر لے۔ ہم منظوری کے بعد فائل وہاں بھیج رہے ہیں۔ دو ہفتہ بعد میں دفتر گیا تو فائل موجود تھی۔ ہمیں نیشنلٹی دے دی گئی اور نیلے پاسپورٹ کی جگہ سرخ پاسپورٹ جاری کر دیئے گئے۔ اور پھر اسی سال اکتوبر میں ہم نے پندرہ سال بعد پاکستان کا چکر لگایا۔

فالحمد للّٰہ علی ذالك

۱۹۷۱ء میں جب میں نے استعفیٰ دیا تو وہ منظور نہ ہو رہا تھا۔ نائیجیریا جانے کی تیاری میری مکمل تھی لیکن یہ استعفیٰ میری روانگی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ پھر اچانک قانون بدلا۔ ون یونٹ ٹوٹا تو اس کے نتیجہ میں میرا استعفیٰ منظور ہوا اور میں پاکستان سے نکل سکا تھا۔ ۱۹۹۹ء میں مَیں پاکستان میں داخلے کے لیے تڑپ رہا تھا کوئی صورت نہ بن رہی تھی۔ پھر سولہ سالہ حکومت بدلی، قانون بدلا، تب کہیں جا کر میں پندرہ سال بعد پاکستان جا سکا۔ اور یہ محض اتفاق نہ تھا۔

اس ریٹائرڈ افسر کے ہم ہمیشہ ممنون رہے۔ اس نے ہماری بہت مدد کی۔ اس کا نام رام ہورسٹ تھا۔ کہا کرتا تھا کہ اس کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنی خوشی سے کرتا ہے۔ ہماری پریشانی دیکھ کر اس نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ایران یا انڈیا بلا لیں ہم وہاں آپ کی ملاقات کروا سکتے ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ نہیں، اس طرح بات نہیں بنتی، کس کس کو بلائیں گے۔ اور پھر وہ آئیں گے بھی نہیں اس طرح قیدیوں سے ملاقات کرنے۔ اللہ تعالیٰ بہتر رنگ میں ملائے گا۔ اور دو تین سال بعد خدا نے احسن رنگ میں ملاقات کروادی۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے۔

نئی صدی کے آغاز پر ''مسیح کی آمدِ ثانی'' پر مضمون

۱۹۹۹ء میں ربوہ میں انٹرنیشنل شوریٰ میں یہ طے کیا گیا تھا کہ سب ملکوں کی جماعتیں نئی صدی کے آغاز پر ایسا پمفلٹ تیار کریں جس میں دنیا کو یہ بتایا جائے کہ جس مسیح کی آمد کا انتظار تھا وہ آ چکا ہے۔ جرمنی میں مبلغ انچارج مولانا حیدر علی صاحب ظفر

نے مجھے لکھا کہ میں اس موضوع پر پمفلٹ لکھوں۔ شوریٰ کی قرار داد اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی ہدایات بھی مجھے مہیا کر دی گئی تھیں تا کہ ان کی روشنی میں مضمون تیار کروں۔ یورپ کے لحاظ سے میرا روئے سخن عیسائیوں کی طرف تھا۔ لہٰذا میں نے بائبل کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ آمدِ مسیح ہو چکی ہے۔

اسی اثناء میں جرمن زبان میں ہی ایک پمفلٹ فرینکفرٹ میں تیار کر لیا گیا۔ مکرم مبلغ انچارج صاحب نے میرا مضمون مجھے واپس کر دیا اور مشورہ دیا کہ چونکہ یہ انگریزی میں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس کو لندن بھیج دیا جائے۔ اب جبکہ نہ اختصار کی قید تھی نہ وقت کی حد بندی۔ میں نے اس مضمون کو ذرا تفصیل سے لکھا اور ساتھ ساتھ ان سوالات اور اعتراضات کو بھی زیرِ غور لاتا رہا جو اس سلسلہ میں عیسائی اُٹھاتے رہے ہیں۔ سارے حوالے اور دلائل بائبل سے ہی دیئے یا عیسائی علماء کی کتب سے۔ سو صفحات پر مشتمل یہ مسودہ میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ حضور نے میری کوشش کو سراہتے ہوئے تحریر فرمایا ''مجھے پتہ ہے کہ آپ نے مسیح کی آمدِ ثانی پر اچھی کتاب لکھی ہوگی......''

بعض اور بزرگوں نے دیکھا تو بہت پسند کیا اور مؤثر قرار دیا۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں پاکستان گیا تو محترم چوہدری محمد علی صاحب سے ملا۔ آپ نے دورانِ گفتگو پوچھا ''کچھ اور بھی لکھا ہے۔'' میں نے اسی مضمون کا ذکر کیا اور مسودہ کی ایک نقل پیش کر دی۔ اشاعت کے لیے یہ عرصہ سے وکالت تصنیف لندن میں زیرِ غور ہے۔ اب اطلاع ملی ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس کو ''ریویو آف ریلیجنز'' میں شائع کرنے کا ارشاد فرمایا ہے۔

پوپ کے اعتراضات کے جواب کے لیے کمیٹی میں شمولیت۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کا احسان

Pope Benedikt XIV

موجودہ پوپ نے جرمنی کی ریگن برگ (Regensburg) یونیورسٹی میں ستمبر ۲۰۰۶ء میں خطاب کیا اور اس میں اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اعتراضات اُٹھائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے مبلغ انچارج مکرم حیدر علی صاحب ظفر سے فرمایا کہ وہ ان کا جواب تیار کریں۔ انہوں نے اس غرض کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جو ان اعتراضات کے جواب تیار کرنے لگی۔

مجھے موبائل پر مکرم حیدر علی صاحب ظفر مبلغ انچارج جرمنی کا پیغام ملا کہ ان سے فوری طور پر ملوں۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ''حضور نے آپ کو اس کمیٹی میں شامل کرنے کا ارشاد فرمایا ہے۔'' چنانچہ میں پہنچا اور دوسرے ممبران کمیٹی سے ملا۔ صدر کمیٹی جناب حیدر علی صاحب ظفر نے ہدایات دیں۔ تقسیم کار ہوئی اور جواب کے مواد کے متعلق مشورے ہوئے۔ اس پہلی میٹنگ کے بعد میں کئی ماہ تک ہر ماہ دو تین دفعہ فرینکفرٹ جاتا رہا اور میٹنگ میں شامل ہوتا رہا۔ مجھے درج ذیل دو عناوین دیئے گئے جن پر مضمون تیار کرنا تھا۔

ا۔اسلام میں غیر مسلموں اور کفار سے حسنِ سلوک

۲۔اسلام۔علم وحکمت اور دلائل کا دین

میرے دونوں مضمون خاصے مفصل تھے اور بہت پسند کئے گئے۔تاہم اس کتاب میں جو پوپ کے جواب میں شائع ہوئی ضرورت کے مطابق کچھ حصے شامل کئے گئے۔میرے لیے اس کمیٹی میں شمولیت اور میرے مضامین کی اس کتاب میں اشاعت میرے لیے بہت بڑی سعادت ہے اور میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا ممنونِ احسان ہوں۔

بائیبل کمنٹری کے جائزہ کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے ارشاد فرمایا تھا جماعت کو بائیبل پر کمنٹری تیار کرنی چاہیے۔اس غرض کے لیے حضور نے لندن میں ایک کمیٹی مقرر فرمائی تھی جو برسوں اس پروجیکٹ پر کام کرتی رہی ہے۔فروری ۲۰۱۰ء میں مجھے مکرم پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کا فیکس ملا کہ اب تک جو مسودہ تیار ہوا ہے اس کا جائزہ لینے کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مقرر فرمایا ہے۔یہ مسودہ مجھے ستمبر ۲۰۱۰ء میں نظر ثانی کے بعد ملا۔اور آج کل مَیں اس کا جائزہ لینے میں مصروف ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اہلیہ کی وفات۔حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا اظہارِ تعزیت

جرمنی میں قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات میں اہلیہ کی اچانک وفات سب سے اہم واقعہ ہے۔۱۹۹۷ء میں ان کو دل کی ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی۔ڈاکٹروں نے بتایا کہ دل کی ایک چھوٹی شریان بند ہوئی ہے اور اس کو کھول کر سٹینٹ رکھ دیا تھا۔وہ سٹینٹ تین سال بعد بند ہو گیا۔تاہم وہ تقریباً نارمل زندگی بسر کرتی رہیں۔دو دفعہ پاکستان کا چکر لگایا اور دو دو ماہ وہاں ٹھہریں۔جرمنی کے اندر بھی سفر کرتی رہیں۔وفات سے دو ہفتہ قبل ڈوزل ڈرف میں اپنے بھتیجے سے مل کر آئی تھیں۔اس شریان کے بند ہونے سے دل میں کمزوری آہستہ آہستہ آ رہی تھی لیکن گھر کا کام کاج کرتے کرتے اچانک دل فیل ہو گیا۔

ہماری شادی ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک وہ میری رفیقۂ حیات رہیں۔پاکستان میں بارہ سال، افریقہ میں انیس سال اور جرمنی میں انیس سال گزارے۔اسی طرح نصف دنیا میں پھیلے اپنے سفر حیات اور اس کے تجربات پر خوش بھی تھیں اور مطمئن بھی۔اب تو خاتمہ بالخیر کی متمنی تھیں۔اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت فرمائے۔حضور انور نے ازراہِ شفقت نماز جنازہ غائب پڑھا اور خاکسار کو تعزیت کا خط بھی تحریر فرمایا۔اسی طرح میرے بڑے بھائی عبد الرحیم بھٹہ نے الفضل میں ان کا ذکر خیر فرمایا ہے۔

سیرت النبیؐ پر تقریر۔ مسجد احمدیہ کانو صدارت مولانا نصیر احمد چوہدری
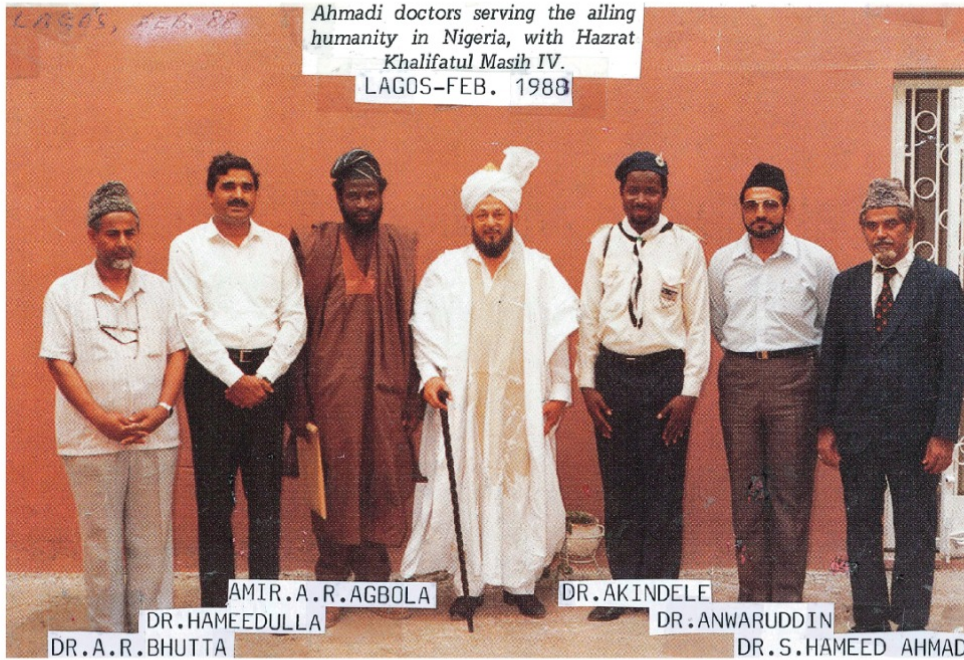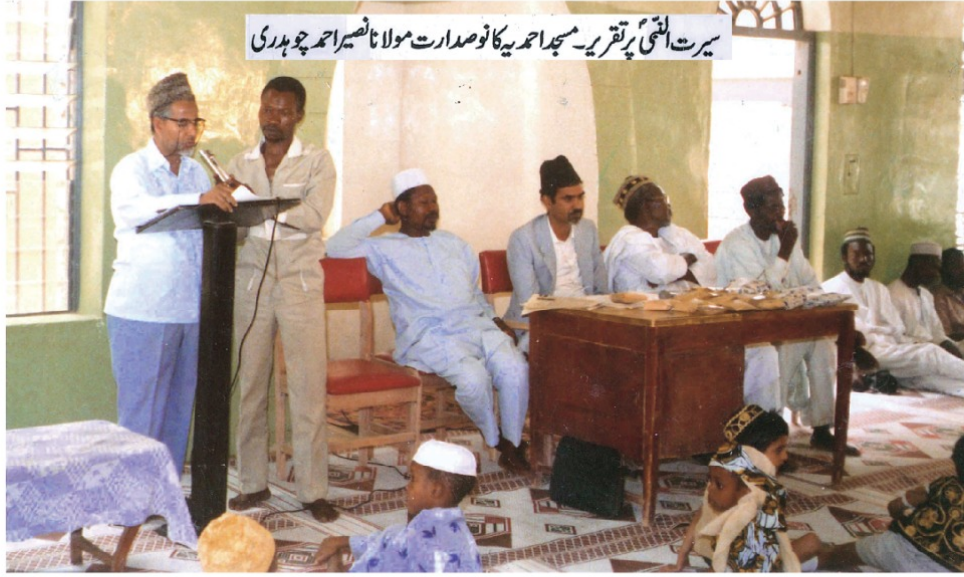
Ahmadi doctors serving the ailing humanity in Nigeria, with Hazrat Khalifatul Masih IV.
LAGOS-FEB. 1988

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کانو سے واپس لیگوس تشریف لے گئے۔ دو روز بعد میں اور ڈینٹل سرجن ڈاکٹر حمید اللہ لیگوس گئے تا کہ الوداعی ملاقات کر سکیں۔ وہاں سب ڈاکٹرز کے ساتھ حضور کی گروپ فوٹو میں ہم شامل ہوئے
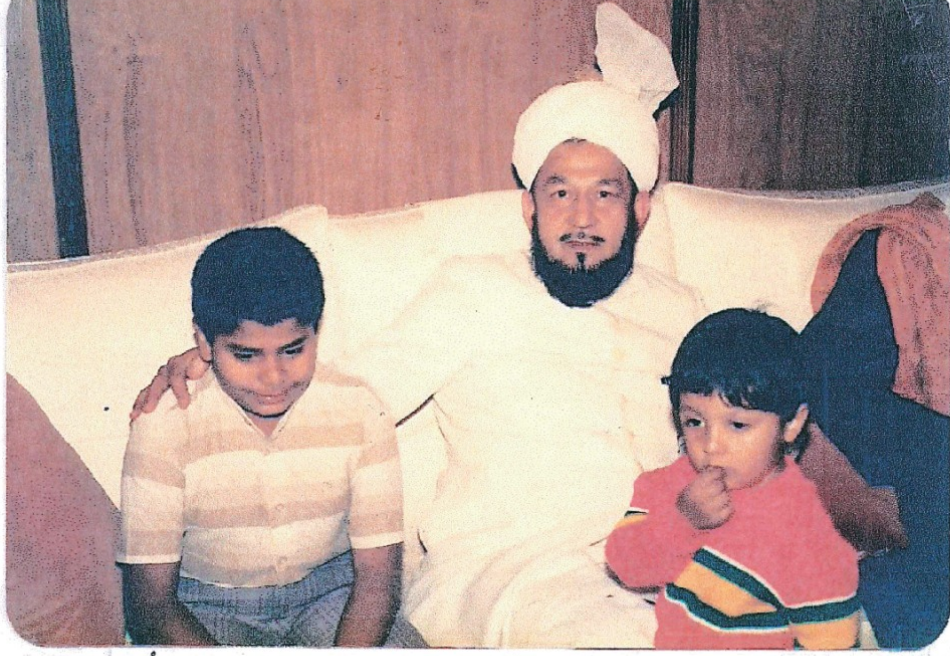
کانو ائیرپورٹ۔ سب سے چھوٹا بیٹا عطاء القدوس نُھٹہ

احمدیہ مسلم سکول کانو کے پرنسپل مکرم منور احمد قیوم صاحب بہت ملنسار اور مہربان دوست تھے۔

خاکسار نے چھ سال کے لیے وقف کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اٹھارہ سال خدمت کی توفیق پائی
حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے خاکسار کو واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(میونسٹر شہر کے میئر اور نائب میئر کے ساتھ ملاقات مولانا حیدر علی صاحب ظفر کی معیّت میں)

محترم عبداللہ واگس ہاؤزر۔امیر جماعت جرمنی ریجنل سیکریٹریان تبلیغ جرمنی حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے ساتھ مولانا عطاءاللہ صاحب کلیم ۔مشنری انچارج جرمنی

مکرم لئیق احمد منیر صاحب کولون میں مربی سلسلہ متعیّن تھے۔ایک صبح مجھے اُن کا فون آیا کہ جلدی آجاؤ۔تبلیغی نوعیت کی ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے۔تفصیل آنے پر بتاؤں گا۔

ریجنل امارت - ایک اعزاز ایک ذمہ داری
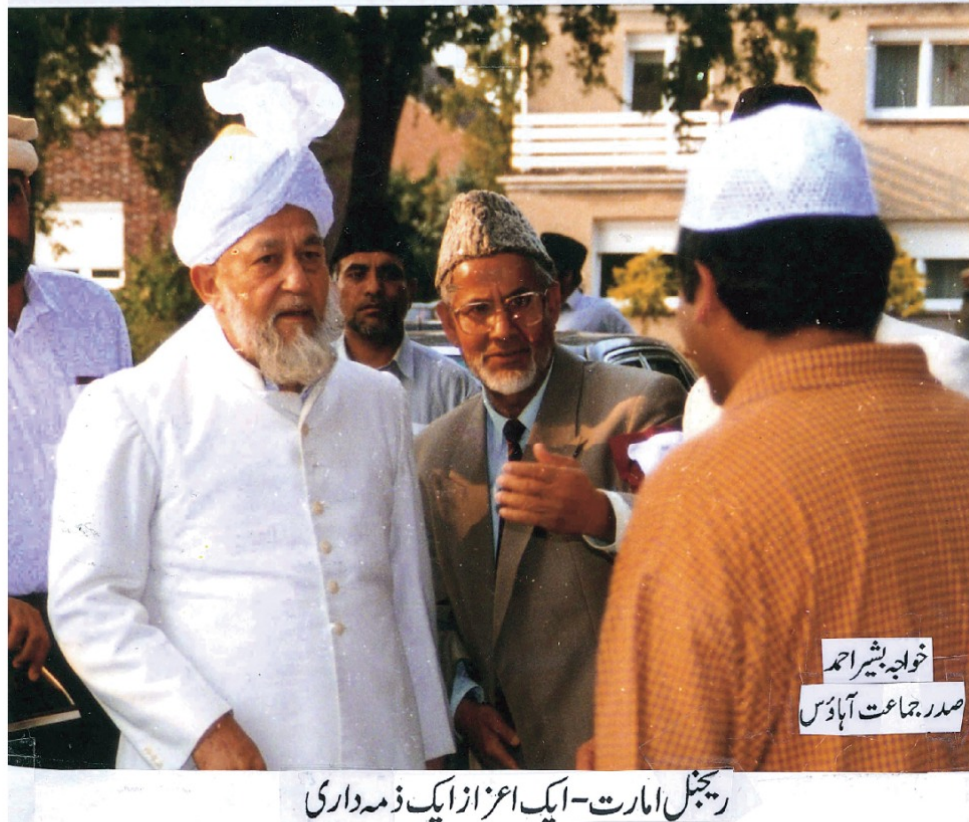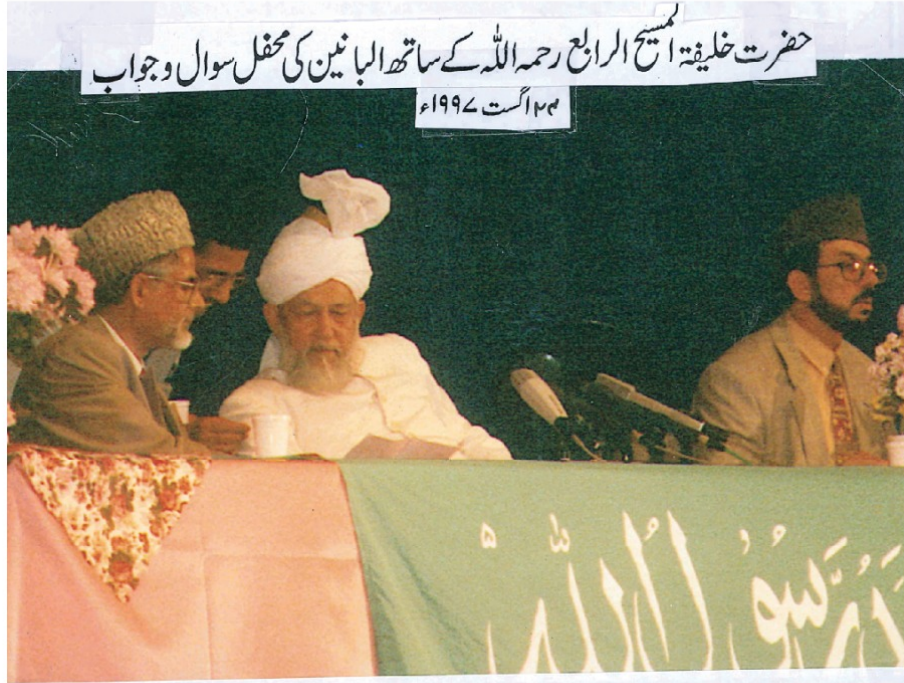
یہ محفل سوال وجواب میرے لیے اس لحاظ سے بہت بابرکت ثابت ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار مجھے خلیفۂ وقت کے ساتھ سٹیج پر بیٹھنے کا اعزاز ملا اور زندگی میں پہلی بار مجھے خلیفۂ وقت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی سعادت ملی تھی۔

میڈیکل ڈیوٹی جلسہ سالانہ جرمنی 1997

شعبہ رشتہ ناطہ سے ہمیں خدا کے فضل سے اچھا رشتہ مل گیا اور ہم نے عبدالشکور کی شادی ۱۹۹۳ء میں کر دی۔
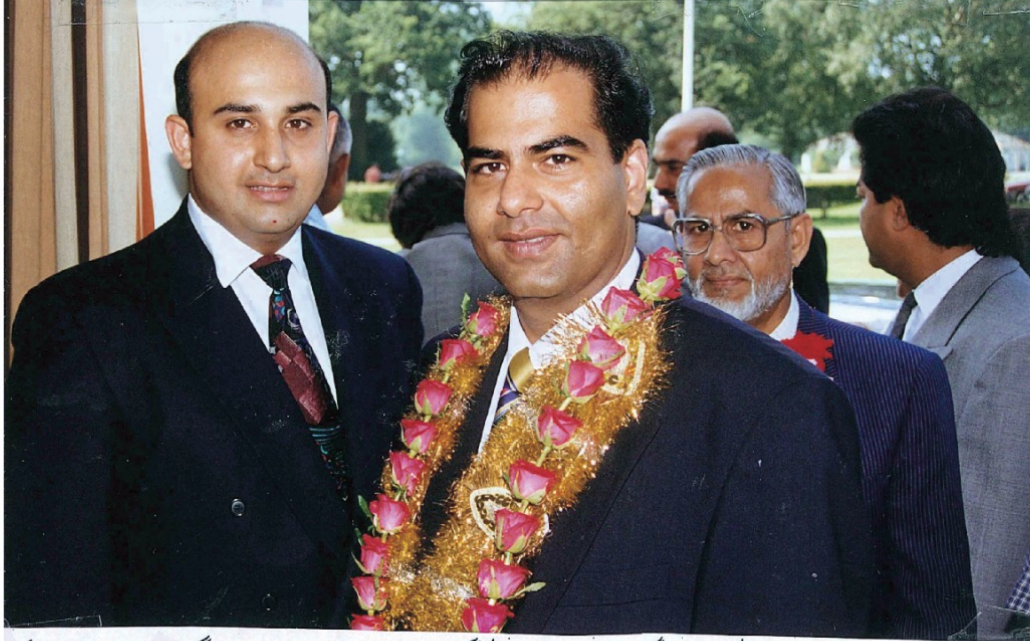
دوسرے لڑکے عبدالسبوح کے لیے ہمیں انگلینڈ میں اچھا رشتہ مل گیا اور ۱۹۹۷ء میں ہم برطانیہ گئے اور وہاں شادی کے بعد رخصتانہ بھی ایک ہوٹل میں کر دیا اور پھر وہیں ولیمہ کر کے واپس لوٹے۔

دانیال۔ جلسہ سالانہ جرمنی 2011ء پر۔
اللہ تعالیٰ اس کو ثباتِ قدم عطا فرمائے اور اخلاص میں ترقی بخشے

انصاراللہ کے ریجنل اجتماعات میں بھی تقریر کے لیے کہا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً صحت جسمانی کے حوالے سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى عَبْدِهِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالنّــاصر

لندن

24-11-09

مکرم ڈاکٹر عبدالرحمان بھٹہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی فیکس موصول ہوئی جس میں آپ نے اپنی اہلیہ کی وفات کی اطلاع دی ہے۔ آپ کو ان کی جدائی کا غم تو بہت زیادہ ہو گا۔ لیکن کل من علیھا فان کے ارشاد کے بعد ہم یہی کہیں گے کہ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اگر ہم حقیقت میں خدا تعالیٰ کی طرف نظر رکھیں گے تو وہ اپنے فضلوں سے ہمیشہ ہمارے لئے کافی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اہلیہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا رہے۔ آپ کو اور آپ کے بچوں کو اس عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

والسلام

خاکسار

مرزا مسرور احمد

خلیفۃ المسیح الخامس

روزنامہ الفضل ....7............ 9 دسمبر 2009ء

سانحہ ارتحال

مکرم عبدالرحیم بھٹہ صاحب امیر ضلع وہاڑی تحریر کرتے ہیں۔

خاکسار کی بھاوجہ محترمہ نصرت سلطانہ صاحبہ اہلیہ مکرم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بھٹہ 16 نومبر 2009ء کو بعمر 69 سال وفات پا گئیں۔ مورخہ 30 نومبر 2009ء کو بیت الفضل لندن میں حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ نے نماز جنازہ غائب پڑھائی۔

مرحومہ عرصہ سے دل کے عارضہ میں مبتلا تھیں دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ مرحومہ کی نماز جنازہ جرمنی میں 19 نومبر کو مکرم ساجد نسیم صاحب مربی سلسلہ مقیم میونسٹر (جرمنی) کی اقتداء میں ادا ہوئی اور اسی روز تدفین کے بعد مکرم الیاس منیر صاحب مربی سلسلہ مقیم کولون نے دعا کروائی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بھٹہ نے 1971ء میں نصرت جہاں تحریک کے تحت زندگی وقف کی۔ نائیجیریا مغربی افریقہ میں مختلف مقامات پر کم وبیش 20 سال تک خدمت دین کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ریکلنگ ہاوژن جرمنی میں رہائش اختیار کر لی۔ صبر ورضا کی پیکر مرحومہ نصرت سلطانہ نے اس طویل عرصے میں نامساعد حالات اور ناموافق ماحول میں نہایت عزم و ہمت اور صبر و استقامت سے حق رفاقت ادا کیا۔ خدمت دین کو فضل الٰہی سمجھا، زبان کو ہمیشہ شکوے سے روکا، شکر کا اظہار ان کے شعار زندگی میں شامل رہا۔ انہوں نے ملنے والی ہر خاتون پر اپنی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑے، مرحومہ دعا گو پابند صوم وصلوٰۃ اور صاحب رویا تھیں۔ مہمان نوازی، خلافت سے وابستگی اور دوسروں کے دکھ درد میں شرکت آپ کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ 1980ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث جب اباوان تشریف لے گئے تو نصف گھنٹہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھی قیام فرمایا اور انہیں شرف میزبانی بخشا۔ 1988ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع جب کانو تشریف لائے تو کچھ دیر ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی ٹھہرے، کھانا مرحومہ ہی نے تیار کیا۔ حضور کو کھانا بہت پسند آیا۔ فرمایا ”انہیں میرا پیغام پہنچا دیں کہ آپ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں“

مالی تحریکات میں بھی مرحومہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں، مقامی بیت الذکر کی تعمیر و تزئین کیلئے جب محترمہ صدر صاحبہ لجنہ نے مالی قربانی کی تحریک کی تو اسی وقت اپنی طلائی چوڑیاں اتار کر صدر صاحبہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

مرحومہ نے چار خلافتوں کا دور دیکھا اور امام وقت کی خدمت اقدس میں باقاعدہ دعا کے لئے خط لکھتی رہیں۔ بیماری کے دوران میں ہمیشہ یہی دعا کرتی رہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بس چلتی پھرتی کو بلا لے، دعا قبول ہوئی صبح اٹھ کر نماز ادا کی ناشتہ تیار کیا کچھ دیر بعد تکلیف محسوس کی تو لیٹتے ہی بے ہوش ہو گئیں اور اسی عالم خود فراموشی میں رحلت کر گئیں۔ مرحومہ نے پسماندگان میں خاوند، تین بیٹے مکرم عبدالشکور صاحب بھٹہ الیکٹریکل انجینئر سیکرٹری مال Kempten جرمنی، مکرم عبدالسبوح صاحب بھٹہ الیکٹرانکس انجینئر سینڈ ہرسٹ Sandhurst یو۔کے۔ مکرم عطاء القدوس صاحب بھٹہ ریکلنگ ہاوژن جرمنی اور ایک بیٹی مکرمہ حبیبہ ظفر صاحبہ اہلیہ مکرم ظفر محمود صاحب ریکلنگ ہاوژن جرمنی تین بھائی مکرم چوہدری محمد انور صاحب، مکرم چوہدری محمد ارشد صاحب، مکرم چوہدری محمد اشرف رضا صاحب اور ایک ہمشیرہ مکرمہ مسرت سلطانہ صاحبہ اسلام آباد چھوڑی ہیں۔ احباب جماعت سے درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ان کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

صدر جماعت مکرم رفیق احمد صاحب

انصار بھائی محترم عبد الرحمٰن مبشر صاحب صدر مجلس انصار اللہ جرمنی کے ساتھ

'Mulakaat' with Hadhrat Khalifat-ul-Masih V. on November 8, 2012
from left to right: my son Abd-us-Sabbooh Bhutta, my grandsons
Shakeel Bhutta and Zeeshan Bhutta, Dr. A.R. Bhutta

Pictures taken during the Jalsa Salana Germany 2014

(from left to right: Shakoor Bhutta, Dr. A. R. Bhutta, Qazi Naeem Ahmad, Daniel Garske)

(Daniel Garske on duty at the Islam exhibition)

نشیب وفراز سے بھرپور اور کرب وقرار سے معمور اپنی نصف دنیا پر پھیلی شاہراہ حیات کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو نظر تشکر، ماں
کی گود کے بعد، اسلام کے اسی گہوارے پر جا کر ٹھہرتی ہے جس نے زندگی کے اُس نازک موڑ پر اس طفل نادان کی تعلیم وتربیت
کے شیر شیریں سے پرورش کی اور اخلاقی اور روحانی اقدار کے آب حیات سے اس کے درخت شعور کی آبیاری کی اور اس کو زندگی
کے میدانِ کارزار میں قدم رکھنے کے قابل بنایا۔ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں گزارے وہ دو سال زندگی کے اہم ترین سال تھے۔

Article in the newspaper 'Recklinghäuser Zeitung', August 8 2007

IM BLICKPUNKT

Klares Bekenntnis zur Toleranz

Ahmadiyya Muslim Gemeinde stellt sich am Sonntag im **Bürgerhaus Süd** öffentlich vor
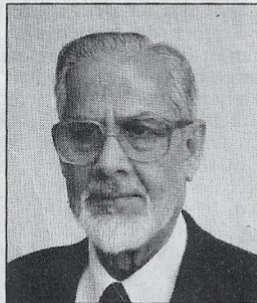
Mabroor Ahmad (l.) und Dr. Bhutta Abdur Rahman laden am Sonntag ins Bürgerhaus Süd ein. —FOTOS: W. GUTZEIT

THEODOR-KÖRNER-PLATZ. (hb) In vielen islamisch dominierten Ländern werden sie verfolgt. In Deutschland jedoch können die Mitglieder der Ahmadiyya Muslim Gemeinde (AMJ) ihren Glauben frei ausüben. Nun startet die Recklinghäuser Gruppe eine Informationsoffensive.

Sie lädt für Sonntag, 12. August, 12 Uhr, zu einer Veranstaltung in das Bürgerhaus Süd ein. „Alle interessierten Bürger, die sich aus erster Hand über unsere Gemeine informieren wollen, sind herzlich eingeladen", erklärt Mabroor Ahmad (22), der zu den engagierten Mitgliedern der Gemeinde zählt. Wie die meisten anderen auch, hat seine Familie ihre Wurzeln in Pakistan. Rund 100 Mitglieder zählt die Gemeinde, die sich zweimal monatlich im Bürgerhaus Süd trifft. „Etliche kommen aus Recklinghausen, einige kommen aber auch aus Gelsenkirchen, Oer-Erkenschwick und Castrop-Rauxel", berichtet Ahmad. Ihm und dem Ehrenvorsitzenden Dr. Bhutta Abour Rahman (71) ist es ein besonderes Anliegen, sich von den radikalen, islamistischen Kräften abzugrenzen und zu distanzieren. „Für die anderen Muslime sind wir Ungläubige. Wir bekennen uns seit über 100 Jahren zur Friedfertigkeit, Toleranz und zum interreligiösen Dialog. Außerdem wollen wir die Trennung von Staat und Religion", betont Rahman. Der Mediziner war 30 Jahre in Nigeria missionarisch tätig, lebt aber bereits seit 1991 in Recklinghausen.

In Deutschland zählt die Ahmadiyya-Bewegung rund 30 000 Mitglieder, weltweit wird die Zahl auf 200 Millionen Gläubige geschätzt.

Traum von der eigenen Moschee

„Was uns in Recklinghausen fehlt, ist eine eigene Moschee. Doch ist diese für unsere kleine Gemeinde einfach nicht finanzierbar. Deshalb sind wir froh, dass wir uns zweimal monatlich im Bürgerhaus Süd treffen dürfen. Regelmäßige Freitagsgebete finden im Haus eines unserer Mitglieder in Oer-Erkenschwick statt", erklärt Ahmad.

Gegründet wurde die AMJ 1889 durch Mirza Ghulam Ahmad in Indien. Ahmad bezeichnete sich als der vom Propheten Mohammed angekündigte Messias und verstand sich als die prophezeite Wiederkunft von Jesus Christus, Krishna und Buddha.

Nach einer Präsentation findet eine Diskussion statt. Ein pakistanischer Imbiss wird gereicht. Die Gemeinde bittet um Anmeldungen: ☎ 0 157/72 56 98 53 oder shahzad_ahmad@lycos.de

Article in the newspaper 'WAZ', December 30 1994

Ahmadi-Muslime: „Mußten vor religiöser Verfolgung fliehen"

Zentrum an der Bergstraße bietet Gemeinde Heimat

Datteln, Dülmen, Marl, Castrop-Rauxel und Haltern: Rund 140 Menschen aus dem Umkreis zieht es in ein kleines, ehemaliges Ladenlokal an der Bergstraße in Rapen. Seit Mai hat dort die verstreute, regionale Gemeinde der Ahmadi-Muslime ihr Zentrum eingerichtet, das täglich zwischen 16.30 und 18 Uhr geöffnet ist - als Ort der Begegnung und des Gebets.

Die meisten Mitglieder der Gemeinde seien aus Pakistan geflohen. „Dort werden wir wegen unseres Glaubens am Heftigsten verfolgt. Doch auch in anderen Ländern, etwa in Indien, hat sich das Klima in den letzten Jahren verschärft", sagt Sprecher Dr. Abdur Bhutta, ein Arzt, der - wie viele aus der Gruppe - in Deutschland Asyl gesucht und gefunden hat.

Bhutta, selber ein Pakistani, berichtet von Plünderungen, davon, daß das Lesen religiöser Bücher der Ahmadi-Muslime teilweise sogar bei Todesstrafe verboten sei, von einer alltäglichen Unterdrükkung, die in Pakistan in allen Lebensbereichen, beispielsweise am Arbeitsplatz spürbar sei.

Mitmenschen

Dr. Abdur Bhutta

Der Glaubensstreit entzündet sich nach Angaben der Gruppe an der Frage, ob der Messias wiedergeboren worden ist. Die vor 100 Jahren gegründete Ahmadiyya-Bewegung glaube daran, die Mehrheit der Islam-Anhänger nicht.

„Es erstaunt uns nicht, daß wir verfolgt werden. Wir sind in einer ähnlichen Situation wie die Urchristen", sagt Bhutta. Doch die über die ganze Welt auf 126 Länder verteilte Gemeinschaft wachse ständig an.

Was viele Menschen dazu bewege, sich ihr anzuschließen, sei die strikte Ablehnung von Gewalt.

„Man kann Menschen nicht durch Zwang überzeugen", sagt Bhutta. Der wahre „Jihad", der „Heilige Krieg" bestehe nicht in gewalttätiger Auseinandersetzung, sondern darin, „die Herzen der Menschen durch Liebe und Argumente zu gewinnen". **meb**

Article in the newspaper 'Marler Zeitung', December 16 1994

Ahmadiy-Muslime fest überzeugt: Gott bringt Frieden, nicht die NATO

Gemeinschaftszentrum an der Bergstraße / Motto: „Liebe für alle, Haß für keinen"

OER-ERKENSCHWICK. (scho.) Drei muslimische Gebetssäle und Gemeindezentren gibt es in Rapen bereits, jetzt ist ein viertes hinzugekommen. An der Bergstraße, im ehemaligen Ladenlokal von Prott, haben sich „Ahmadiy-Muslime" beim neuen, türkischen, Hauseigentümer eingemietet und ein Gemeindezentrum errichtet.

„Ahmadiy-Muslime", das sind Mitglieder einer Glaubensgemeinschaft innerhalb des Islams. Sie gründeten sich 1889 in Indien und glauben, im Gegensatz zur moslemischen Mehrheit, daß mit dem von 1835 bis 1908 lebenden Hazrat Mirza Ghulam Ahmad laut der göttlichen Offenbarung ein Messias auf die Erde kam, um die Menschen aller Erdteile und Glaubensrichtungen „durch Demut und Milde" zu Gott zurückzuführen.

Soweit für Außenstehende Einblicke möglich sind, entzündet sich an dem Glauben an den moslemischen Messias beziehungsweise an dessen Negierung durch die moslemische Mehrheit der Glaubenstreit. Ein Streit, der nach Auskunft der Ahmadiy-Muslime zumindest in Pakistan grausame Ausmaße angenommen haben soll. Die Gesprächspartner im Rapener Gemeindesaal verweisen auf Veröffentlichungen, in denen ihre Verfolgung in Pakistan dokumentiert wird. Vier ihrer weltweit etwa 15 Mio. Anhänger leben in

Dr. Bhutta: Rapen liegt zentral

diesem Land und werden, so Dr. Bhutta, der Sprecher der Gemeinschaft im Kreis Recklinghausen, wegen ihres Glaubens verfolgt, durch Sondergerichte mit Terrorurteilen mit dem Tode bestraft oder schlicht und einfach ermordet. Einige Ahmadiy-Mitglieder verweisen in diesem Zusammenhang darauf, daß ihre Bitten um politisches Asyl wegen der Vorgänge in Pakistan ausnahmslos positiv beschieden würden.

Im neuen Zentrum treffen sich regelmäßig etwa 70 Gemeindemitglieder aus Oer-Erkenschwick, Datteln, Recklinghausen, Castrop-Rauxel und Dülmen. „Rapen liegt zentral", sagt Dr. Bhutta", der zugleich darauf verweist, daß nicht etwa nur Pakistanis zur Ahmadiy-Gruppe gehören. Auch Deutsche sind dabei.

Im Zentrum selbst ist in einem kleinen Nebenraum auch die Möglichkeit zum Gebet gegeben, ansonsten aber stehen täglich zwischen 17 und 18 Uhr Gespräche im Mittelpunkt. Und auch für eine Tischtennisplatte ist Platz vorhanden. „Wir wollen vor allem unseren jungen Leuten eine Anlaufstation bieten und sie vor Gefahren schützen", sagen die Verantwortlichen, die immer wieder an ihren wichtigsten Leitsatz erinnern: „Liebe für alle, Haß für keinen." Gott ist für sie die entscheidende Instanz. Denn: „Gott bringt Frieden, nicht die NATO."
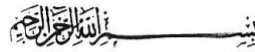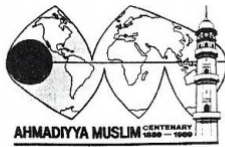
Ahmadiyya Muslim Association U.K.

Dr Abdur Rehman Buta,
Recklinghauser Strasse 97,
Westfahlen,
Germany.

Dear Sir,

Assalamo-alaikum-wa-rahmatullahe-wa-barakatohu.

I trust that you are in the very best of health.

As you may be aware the next **International Tabligh Seminar** on Thursday **29th July** 1993 at Islamabad Tilford.

In this regard, I shall be grateful if you could please **address** this meeting for 15 minutes **on the subject of "Personal Experiences In The Field of Tabligh".**

The programme will begin at 10.00 a.m. with registration with the concluding session commencing at 5.00 p.m.

I am sorry for the short notice but we have been trying to ring for some weeks now without success on 02364-16227. We now understand that the number may be incorrect.

In any case since time is short, I would be obliged, if you could kindly give us a **reply** at the earliest opportunity preferably **by return of post or fax.**

Wassalam,

Your brother in Islam,

(WALEED AHMAD)
Addtl. Sec.Tabligh U.K.
Tel:0634-281285

12/7/93

The London Mosque *16 Gressenhall Road, London SW18 5QL* Regd. UK Charity No.299081
Tel: 081 870 8517 *Telex: 28604 ref 1292 Fax:* 081 874 4779 *Cables: Islamabad London*

Giro No. 95.707
t.n.v.
Ahmadiyya Moslim Missie

Oostduinlaan 79 - Den Haag
AHMADIYYA BEWEGING IN DE ISLAM

Telegramadres:
ISLAM
Telefoon 245.902

Dr. A.R. Bhutta
Altebadstr. 88
7261 - Oberreichenbach 2
Germany.

The Hague, 12 August 1991

Dear dr. A.R. Bhutta,

Assalamo Alaikum, w.w.,
I hope that by the grace of Allah you are quite fine.
First of all I want to apologize for the late respons of your letter dated 20-05-91. I was very happy when I received your letter together with the booklets which where enclosed. I want to thank you very much for this kind gesture. We will certainly place the booklets into our library.

We will pray to Allah to give you a long and healthy life and may Allah bless you with His mercy.

Wassalaam,

Yours sincerly,

16.8.91

Hibatun Nur Verhagen.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

AHMADIYYA MUSLIM JAMAAT

NUUR MOSCHEE

ZENTRALE FÜR DEUTSCHLAND · BABENHÄUSER LANDSTR. 25 · 6000 FRANKFURT/M. 70

NUUR MOSCHEE · BABENHÄUSER LANDSTR. 25 · 6000 FRANKFURT/M. 70

TELEFON: 069/684485
TELEX: 416187 islam d
FAX: 069/686504
TELEGRAMM-ADRESSE:
»ISLAM« FRANKFURT/MAIN

HAUPTSITZ:
RABWAH, PAKISTAN

Dr. A.R. Bhutta,
AlteBad Str. 88,

7261-Oberreichenback-2

FFM, DEN 14.12.1990

Dear Brother,

Assalam-o-Alaikum W.W.

I have been advised by The Ameer-i-Jamaat Germany to contact you in response to your letter dated 24.10.1990. First I thought you might be available on telephone but after an enquiry from Ameer Sahib, no telephone connection was available with him. Then I tried to contact Mr. Ziaul Haq Shams, President Pforzheim but no body picked up his telephone No.07231-43265 available on our record hence this letter.

I have read your all papers and consider that God has sent you here for utilizing your services in Tableegh. Actually, there is great need of learned persons who could guide other Ahmadis in the field of Tableegh. A man of your calibre could be most suitable in training D.I. for Tableegh purpose. I, therefore, request you to please make it convenient to have a personal meeting either in Bonames or Nurr Moschee. My telephone No. is 06182-1423 after 8.00 PM

Thanking you,

Yours brotherly,

(A. Shakoor Aslam Khan)
National Secretary Tableegh

POSTGIROKONTEN: FFM. 244023-604; VERLAG DER ISLAM: FFM. 51886-608 · BCCI - 01052900 · BETHMANN BANK, FFM. KONTO-NR. 17133-9-00

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

AHMADIYYA MUSLIM BEWEGUNG

NUUR MOSCHEE

ZENTRALE FÜR DEUTSCHLAND · BABENHÄUSER LANDSTR. 25 · 6000 FRANKFURT/M. 70

NUUR MOSCHEE · BABENHÄUSER LANDSTR. 25 · 6000 FRANKFURT/M. 70

Dr. A.R.Bhutta
AHMADIYYA CLINIC KANO
52, Bompai Road
P.O.Box 1100
KANO, N i g e r i e n

TELEFON: (069) 681485
TELEX: 416187 islam d
TELEGRAMM-ADRESSE:
»ISLAM« FRANKFURT (MAIN)

HAUPTSITZ:
RABWAH, PAKISTAN

FFM., DEN 10.12.86

Dear brother in Islam,
assalamo alaikum wa rahmatullahe wa barakatohu!
I am happy to be able to convey to you the good news that your book about the prophecies of the Holy Prophet regarding the 14th Century has seen the light of German publication. It was displayed at the Frankfurt International Bookfair and is now announced for sale in our magazines. The translation was done, as you already know, by our Bro. Tahir Cronjaeger. The illustration of the cover was done by our Bro. Bashiruddin Schadoq. 3 copies for your personal use are sent to you by seperated post. If you need more copies, please let us know.
We would also be happy to read more of your works. Perhaps again we can find something, which we would like to offer to our german nation too. Unfortunately we have not seen any copy of The Truth since long. If you happen to meet the manager, please ask him, if it is possible that we in Germany can get a copy regularily, as I often have found very valuable articles in The Truth, many of them proper for translation.
So far, so good. I pray, may Allah enable you to do great deeds for the sake of Ahmadiyyat and bless you with all your pious heart wishes.
Wassalam, yours brotherly,

Hadayatullah Hübsch

POSTGIROKONTEN: FFM. 244023-604; VERLAG DER ISLAM: FFM. 51886-608 · AUDIO-VIDEO: FFM. 40374-607 · BETHMANN BANK, FFM. KONTO-NR. 17133-9-00

TEL. 76845

OFFICE OF THE AMEER AND MISSIONARY-IN-CHARGE

AHMADIYYA MOVEMENT, GHANA

INT. HEADQUARTERS:
RABWAH, PAKISTAN.

Grams: *AHMADIYYA*
P. O. Box 2327,
ACCRA, GHANA.

Our Ref ....

Your Ref ....

1 . 9 . 1985

مکرم برادرم

ڈاکٹر حسیب الرحمن صاحب مبشر

انچارج احمدیہ ہسپتال اجیبواوڈے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا خط محررہ 27/7/85 موصول ہوا جس کے ساتھ ہی آپ کی تصانیف کے
نوادرات بھی موصول ہو گئے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

آپ کی کتب کے یہ نمونے ہم نے گھانا مشن کی ریفرنس لائبریری کے شوکیس
میں محفوظ کر لئے ہیں۔ امید ہے عوام بھی ان سے استفادہ کر سکیں گے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کے فضل سے آپ کی کتب عیسائیت کے رد میں
بہت ہی مفید ہیں۔ اب اوقات ان سے استفادہ کی توفیق ملی ہے۔

آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے انتہائی خوشی محسوس ہوئی ہے کہ آپ نے
گھانا مشن کو اپنی تصانیف کے چھپوانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے
میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم میں اور بھی اضافہ فرمائے اور
بہتوں کی اصلاح اور راہنمائی کا موجب بنائے۔ نیز خدمت احمدیت کے
جذبہ سے آپ کو ہمیشہ سرشار رکھے مقبول خدمات سلسلہ کی توفیق سے
نوازے۔ آمین۔

والسلام

خاکسار

عبدالوہاب

OFFICE OF THE AMEER AND MISSIONARY-IN-CHARGE

TEL. 76845

INT. HEADQUARTERS:
RABWAH, PAKISTAN.

AHMADIYYA MOVEMENT, GHANA

Grams: *AHMADIYYA*
P. O. Box 2327,
ACCRA, GHANA.

Our Ref ....

Your Ref ....

19 . 7 . 1985

برادرم مکرم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بھٹہ
میڈیکل آفیسر احمدیہ ہسپتال اجے بو نائیجیریا۔

امید ہے بفضلہ تعالیٰ آپ خیریت سے ہوں گے۔
مکرم صفی الرحمٰن صاحب خورشید کی وساطت سے آپ کی تصانیف میں سے کچھ کتب
گھانا مشن کے لئے موصول ہوئی ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔
کتب کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی ایک کا پہلے بھی مطالعہ کر چکا ہوں
اور خدا کے فضل سے عیسائیت کے بارہ میں میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔
میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اور بھی اضافہ کرے۔ آمین۔
اس سلسلہ میں ایک تجویز ہے کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس نوعیت کے لٹریچر کی
دوبارہ اشاعت کے لئے گھانا میں کوشش کر لی جائے تاکہ مقامی طور پر لٹریچر کی کمی
کو کسی حد تک پورا کیا جا سکے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو براہ مہربانی
تحریری طور پر اجازت نامہ مرحمت فرما دیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم
سب کو بہتر طور پر خدمات سلسلہ کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

والسلام
خاکسار
عبدالوہاب

ISLAM VERSUS AHMADIYYA IN NIGERIA

by

Ismail A,B. BALOGUN, B.A., Ph. D. (Lond)
Senior Lecturer.
Dept. of Arabic and Islamic Studies,
University of Ibadan,
Nigeria

DEDICATED TO THE GLORY OF ALLAH
AND THE CORRECT UNDERSTANDING OF
ISLAM USHERED INTO THE WORLD BY
THE LAST AND SEAL OF THE PROPHETS,
MUHAMMAD-UL-MUSTAFA ON WHOM BE
CONTINUED PEACE AND BLESSING
OF ALLAH MOST HIGH

DAR AL ARABIA
PUBLISHING, PRINTING AND DISTRIBUTION
BEIRUT - LEBANON P.O.BOX: 6089

Preface

In October 1970, the World Muslim League at Mecca passed a resolution which says, among other things:

> That the Ahmadiyya (Qadiani) group founded by Mirza Ghulam Ahmad is a group that has veered far from the Path of Islam by reasons of certain of its beliefs and practices which are clearly contradictory to the well-known view-point of Islam

Consequent upon this resolution, the government of the Royal Kingdom of Saudi Arabia decided that Ahmadis from all over the world must not be allowed to perform the annual pilgrimage to Mecca and Medina because they were considered as non-Muslims. This decision was based on the tradition **(hadith)** of the Prophet Muhammad **which** bans non-Muslims from the holyland. Vide **Bukhari** 56:176 **(Kitab al-Jihad),** 58:6 **(Kitab al-Jizyah),** 64:83 **(Kitab al-Maghazi) Muslim** 32:63 (Kitab al-Jihad); Abu Dawud 19:26 **(Kitab al-Kharaj); Tirmidhi** 19:43 **(Kitab al Siyar)** etc.

In compliance with the government's decision, the Saudi Arabian Embassy in Nigeria refused bluntly in December 1973 to allow Nigerian Ahmadis to perform the **hajj** of January 1974. A hue and cry ensued as a result of this refusal and many statements and counter-statements were made in the Nigerian Press. The situation reached a point where I sincerely felt that the nation needed necessary information and guidance on the matter. At this point, there were indications that certain people aimed at manouvering the situation into a governmental confrontation between Nigeria and Saudi Arabia.

As an Ahmadi then, I was naturally displeased with the attitude of the Embassy. But as a University teacher in the field of Arabic and Islamic Studies I considered it a bounden duty to present the truth based on the knowledge of Islam, notwithstanding my own side to the dispute. For if the truth as known and understood by the Muslims should elude the University, from where then can we expect to find it?

Consequently, I started to weigh the beliefs and practices of the Ahmadis against the widely accepted teachings of Islam as contained in the authoritative booksof Islam. I contained also the Ahmadiyya interpretations of certain Islamic precepts with the orthodox interpretations. I discovered a basic incongruity between Islam and Ahmadiyya, and also between the Muslims and the Ahmadis. Then the problem arose in me as to how to put forward my findings, after having been a professed and active Ahmadi for over forty

years. I, eventually, resorted to supplication to Allah, Most High, for guidance and the courage with which to follow it.

I was engaged in **Tahajjud /Istikharah** prayer one night when it occurred to me to go straight to my desk, immediately after the prayer, and start writing. I did so, resulting in my article, «The Ahmadiyya Problem In Nigeria» published in the (Nigerian) **Sunday Times** of 20th January, 1974. Many rejoinders poured forth both in support of, and in opposition to the article. It is significant, and naturally understandable, however, that all the oppositions came solely from the rank and file of the Ahmadiyya (Qadiani) Mission.

The official rejoinder of the Mission was published in the Sunday Times of 10th February, 1974 and more fully in the Mission's newspaper, **the Truth,** of Monday 11th February 1974. Subsequent rejoinders and correspondence from members of the Missions were largely a repetition of parts of the official rejoinder. A few were even direct abuse and insult on me. These, however, counted very little, indeed, with me.

After the spate of rejoinders had subsided, I put in another article in the **Sunday Sketch** of August 25, 1974 to explain some of the points raised in the rejoinders. This again gave rise to some other rejoinders largely repeating the same old story. I rounded off the exercise in the Press with my reasons for renouncing Ahmadiyya, contained in the **Sunday Sketch** of September 29, 1974; an exercise the sum total of which cannot only be informative and elucidating, but also academic. [. . .]

THE AHMADIYYA PROBLEM IN NIGERIA

by

Dr. Ismail Balogun,
University of Ibadan.

(Published in the Sunday Times, Nigeria on 20th January, 1974.)

When a group of young and educated Nigerian Muslims wrote in 1916 to India and invited Ahmadiyya into this country, hardly did they know the details of the organisation they were introducing into their fatherland. They came in contact with the Movement through their wide reading coupled with their burning desire to see Islam progress in their country. Such young and educated Muslims were bored by the way their elders were then practising Islam. Unlike some of their number at that time, they saw no sense in converting into Christianity because of the unbecoming practices of their elder Muslims; rather, they considered it better to improve Islam

[. . .]

tices, nevertheless there is a sizeable minority among them who are fully aware of what they have accepted in Ahmadiyya. This minority group forms the leadership of the two factions of the sect in this country, and it is to them that this article is primarily addressed, with the view to considering the implications of Ahmadiyya beliefs and practices and consequently deciding whether or not a rethinking is necessary over what we have tacitly accepted. I happened to belong to the minority group, having been born and bred an Ahmadi forty-four years ago.

Newspaper reports said recently (e.g. Daily Times, 19th December, 1973), during the operation for the last **hajj**, that a spokesman of the Saudi Arabian Embassy claimed that the Ahmadis cannot accept the Prophet Muhammad as their leader. If the report is correct, then it should be noted that the claim is far from the truth. Ahmadis believe in, and doggedly follow, the Prophet Muhammad without any shadow of doubt whatsoever. In point of fact, it is their extreme regard for Muhammad (P.B.O.H.) which is landing them in troubledwaters with other Muslims.The Ahmadis regard the Prophet Muhammad so great that they felt that he must have a follower-prophet in the manner that Jesus Christ followed Moses among the Jews. Consequently, they propounded a theory which resulted in the recognition of Mirza Ahmad as a prophet after Muhammad. This is in contradistinction to the clear statement of Qur'an 33:40 that Muhammad is the Seal (i.e. the Last) of all Prophets.

The Ahmadis, like other Muslims, actually believe that Muhammad is the last of all Prophets in line with the Qur'anic statement, but they argue that it is a special kind of prophethood i.e. the law- bearing prophethood that has ended. By this, they mean that no other Prophet would come that will bring a Scripture since the Qur'an is the final Book from God to man. They continue to say, however, that follower-prophets who will not bring any Book will still appear from time to time as need be. A number of complications arise from this theory.

(a) If, as the Ahmadis claim, Ghulam Ahmad is to Muhammad as Jesus Christ was to Moses, then how do we explain the fact that Jesus Christ came with a Scripture (the **Injil**) as believed by all Muslims, including the Ahmadis themselves? Does it not follow that Ghu'am should necessarily bring a Scripture? Otherwise the theory that Ghulam Ahmad followed Muhammad in the Muslim dispensation in like manner that Jesus Christ followed Moses in the Jewish dispensation will fall flat.

(b) The Ahmadis often quote the Prophet Muhammad as having said that Jesus Christ (i.e. the Prophet **Isa**) would return to the world as the Mahdi. They, therefore, claim that Mirza Ghulam Ahmad is the Mahdi who has come in the spirit of Jesus Christ. If this is true, then it follows that Mirza Ghulam Ahmad should also bring his own Scripture as Jesus Christ did; otherwise, the comparison between the two becomes incongruent. It, therefore, belies the Ahmadiyya belief that Ghulam Ahmad fulfils the Second Coming of Jesus Christ.

(c) To support the idea of follower-prophet, theAhmadisquote the **hadith** credited to the Prophet Muhammad that he said, on the death of his son Ibrahim, «If Ibrahim had lived, he would have been a Prophet.» From this **hadith**, Ahmadis infer that the Prophet Muhammad hinted at the possible continuation of prophethood after himself. But they find it difficult to see the other possible inference from the same **hadith** that it was precisely because there would be no other prophet

after the Prophet Muhammad that God had caused his sons, including Ibrahim, to predecease him. This is why the Qur'an 33:40, which calls the Prophet Muhammad the Seal (or Last) of the Prophets, also emphasises the fact that he had no son. It declares: «Muhammad is not the father of any of your men; but he is the Messenger of Allah and the Seal (or Last) of the Prophets, and Allah knows everything.»

[. . .]

I think it is high time the Ahmadis made their stand clear to the world. Are they Muslims, or a distinct group originating from among the Muslims? If they are Muslims, then they have to follow the consensus of Muslim opinion and abandon the idea of follower-prophethood after the Prophet Muhammad; co-operate with other Muslims to stabilise and consolidate Islam. They are highly needed for this duty; and they can perform the duty well only by associating with the other Muslims rather than alienating them through strange beliefs and practices. If the Ahmadis are a distinct group and a new formation, then let them stand clear from other Muslims and declare their identity, so that those who will embrace Ahmadiyya will know from the start that they are entering a new religion rather than having a wrong impression of being Muslimas.

(c) There is no doubt whatsoever that Mirza Ghulam Ahmad claimed to be a Prophet, even though belatedly unlike previous Prophets of God described in the Qur'an. For example, when the Prophet Muhammad called on people to give him their oath of allegiance, he did so as the Prophet

and Messenger of God, see **Suratul Fath**, i.e. Chapter 48 of the Qur'an. In the terms of initiation which Ghulam Ahmad claimed to have been revealed to him by God, on the other hand, there is no mention of Prophethood in it whatsoever. This is a very valid point indeed in relation to Ghulam Ahmad's claim to prophethood. Since, however, he made the claims in his books, then it is only wise and proper that those who do not believe his prophethood should keep clear of the name he gave his followers.

[. . .]

there is also the social ad vantage which is no less important. In point of fact, the Muslim prayer presents the most constant and regular form of social contact to the adherents of Islam. By it hey have the opportunity of meeting one another at least five times a day at the level of their immediate mosque environments. Then, once a week, on Fridays, they meet on a larger scale in the Central Mosque, and again twice a year, on the occasions of the two Muslim festivals, they met on still larger scale than hitherto. The **hajj** finally pro vides the opportunity for the largest possi ble gathering of Muslims once a year on the plain of Arafat where the two daily afternoon prayers are observed together. The social, religious and spiritual opportunities inherent in these gatherings are better experienced than imagined.

By the Ahmadi doctrine and practice of not praying behind non-Ahmadi Imams, a wedge is automatically placed between the general body of Muslims on the one hand and the Ahmadi Muslims on the other.

As I have already emphasised, there is no intension of minimising the contribution which Ahmadiyya has made to the progress of Islam all over the world. It has spurred Muslims out of their lethargy and has encouraged organised Islam much better than hitherto. It has succeeded to the extent that other Muslims have borrowed a leaf from it. All these should bring satisfaction to the Ahmadis, both the leaders and the followers. Their success in this way should not, however, blindfold them to the excesses to which they are prone as a group within Islam. They should completely avoid the apparent urge to impose themselves on the universal Islam. If they are Muslims along with the others, they should realise that a part cannot make a whole. If they look forward to becoming a distinct group from the Muslims, let them honestly declare to the world, keep to themselves and face the consequences. Theirs will not be the first separatist movement in the history of Islam. The Khawarij and the Mu'tazila had preceded at certain points in history. God Almighty has promised to protect Islam (Q. 15:9) and He has never failed to keep the promise. How He will continue to do so is best known to Himself. In conclusion, may peace be unto those who follow the guidance. (Q. 20:47) It may interest my readers to know that before writing this article I observed the **Istikhare** prayer specially for it, and that subsequent to that I never placed my pen on paper without first praying for God's guidance.

AHMADIYYA-PROBLEM OR BLESSING?

(An official Reply by the Ahmadiyya Mission in Nigeria, published in **the Truth** of Monday 11th February, 1974)

The analysis of Ahmadiyya belief and practise, done by Dr. Ismail Balogun in his article «The Ahmadiyya Problem In Nigeria», published, in Sunday Times on January 20,1974, is highly confusing, and misleading for the general readers who do not know the real stand of Ahmadiyya, and its pattern of belief. In virtue of the fact that the article came in the wake of the action of Saudi Embassy against the members of Ahmadiyya Community by putting ban upon them from performing the Holy Pilgrimage, and the controversy has now-entered a delicate stage, I deem it necessary to explain the stand of Ahmadiyya, and discuss the points raised against it in the above mentioned article. — — . — — — — -

the internal conflicts of muslims regarding their religious interpretations, and practices, Secondly, he described that the sole object of his advent was to serve Islam, and to propagate it among the people of different faiths and to defend it from the strong attack launched against it by Christianity, and other irreligious philosophies. He claimed that it is only Islam which serves the real purpose of religion, because it guarantees living contact with God in this very world through Divine revelation and all other faiths are dead in this respect. He prophesied that in the result of his efforts which would be carried on after him by his

community, the message of Islam would, reach the fore-corners of the world, and within the course of three centuries Islam would gain its absolute dominance over all other ideologies. The Community, since the time of its inception, has been facing strong opposition from the religious quarters coupled with frequent expressions of hostilities amounting to abusive speeches, physical assaults, and killings against its members. The muslim masses are usually misled by self fabricated, and strange allegations made against Ahmadies, on the part of religious Ulema to bias their minds against the community.

Despite this hostile attitude, the Community has been spreading in the Muslim world as well as in the non-Muslim countries, where in the result of the efforts of Ahmadiyya missioneries a considerable number of Christians, Buddhists and the people of other faiths have embraced Islam. Building of mosques, in Europe, America, and the Far East and translating the Holy Quran in different Languages of the world is a special feature of its activities.

It is indeed a historical blunder on the part of the newly-found disciple of the critics of Ahmadiyya that the late Alhaj L.B. Augusto brought the Jama'at to Nigeria. It is true that the mission started in 1916 but the credit of pioneering is due to all members and office-bearers of the Muslim Literary Society whose president and Secretary were Late. L.B. Augusto and Alhaj B.A. Fanimokun, who is still an Ahmadi till today. It was

[. . .]

«The Mahdi who will appear in the later days, will be subordinate to the laws and Shariah of the Holy Prophet (SAW), and in respect of his extent of knowledge and in his position, all the prophets and Walees will be below him. (P. 25, 53)

When as a matter of principle all the Muslims believe the same thing about the Promised Messiah and Mahdi, then how can the stand of Ahmadiyya be criticised, and why should it be called an excessive trend ? There are two things which make the status of the Promised Messiah and Mahdi, higher than the others. First, being a spiritual son of the Holy Prophet (SAW) he perfectly reflects the spiritual excellence of the Holy Prophet (SAW) who is at the highest point of spiritual progress. Secondly, the scope of his mission is to propagate Islam throughout the world, as the Hadith mentions that all religions will die away in his age (Abu Daud Kitabul Malahim) No prophet before the Holy Prophet (SAW) was ever commanded to address the whole world. The Hadith describes that the Promised Messiah would face Dajjalic forces and disorder, which would be so strong that all the prophets have warned against it (TIRMIDHI) Is it possible that the threat of such a disorder be greater than that faced by any prophet before the Holy Prophet (SAW), but the person to face it, be lower in rank than all of them ? The Holy Quran describes the Ummah of the Holy Prophet (SAW) to be the best of all. (3 : 111). The Holy Prophet (SAW) describes the learned Ulema of his Ummah to be similar to the Prophets of Bani Israel. When the learned Ulema and scholars are ranked with the previous pro-

phets, why can not the Promised Messiah be ranked above them ? This is definitely not an excessive trend.

This is the reality of the criticism done by Dr. Balogun, on the sermon of the Head of Ahmadiyya Community. I can only say that a very shallow depth of knowledge, and religious understanding is visible through his criticism, and by doing so, he has committed, intellectual, moral and spiritual suicide, which is very fatal indeed.

I can not help wondering over the confused thinking of the writer about the role played by Ahmadiyya, and then drawing a false conclusion from it...

The writer remarks :

(1) «Ahmadies believe in and doggedly follow the Prophet Mohammad (SAW) without any shadow of doubt whatsoever».

(2) Ahmadiyya has brought a better organisation in Nigeria, there is no doubt whatsoever.

(3) They are in the forefront among the muslims all over the world in propagating Islam, there is no doubt.

(4) It has spurred muslims out of their lethargy and has encouraged organised Islam much better than hitherto.

In the perspective of these 'doubtless' realities, the author concludes :

«The majority of the Muslims will be justified to declare all those who hear the name 'Ahmadiyya' as outside the abode of Islam».

He also predicts

«Ahmadiyya is either going to fade away and remain only in history books, or end up in another religion distinct from Islam.»

I leave it for the readers to comment that how far the above mentioned four facts justify the conclusion and prediction of the author. There have been many who wished and predicted so, and they themselves have faded away in history, and Ahmadiyya is on the way of progress. Has not the time come for the people to know that the message of Ahmadiyya is a great blessing for them ? Peace be on them who follow the guidance.

N.B. The rejoinder above has been faithfully copied as contained in the newspaper in which it was published, **without any emendation whatsoever.**

I.A.B.B.

ISLAM VS AHMADIYYA
What It Is All About

by
Dr. Ismail Balogum
University of Ibadan.

(published in the Sunday Sketch, Nigeria on 25th August, 1974).

There is currently a universal upsurge against the followers of MirzaGhulamAhmad of India who, before his death in 1908, distinguished himself and his adherents with the name Ahmadiyya.

. The upsurge is principally among the muslims who consider that the Ahmadis are stealthily trying to usurp their right in the name of Islam.

The struggle is paramount in the Islamic Republic of Pakistan because it is there, more than anywhere else, that the Ahmadiyya pinch is most greatly felt since it affects them not only religiously but also politically.

This directive was not meant to serve as religious intolerance ; rather its aim was to protect the interest of Islam which has always been the state religion of Pakistan.

One or two comparisons will suffice here in order to make the situation clearer. For example, the monarch of Great Britain is not only the Head of State but also the Defender of the Christian Faith.

Even if the country's constitution does not specifically stipulate that the monarch must

always be a Christian, his/her function as the Defender of the Christian Faith automatically, and understandably, requires that the Head of the State of Great Britain must necessarily be a Christian.

The State of India can serve as another example. It may be argued that a muslim has at one time or another been the President of that country even though the vast majority of the population have always been Hindu.

That notwithstanding, the fact must be realised that ultimate power in India does not lie with the President, but with the Prime Minister who has always been a Hindu since independence.

The constitutional requirement of Pakistan that the highest political post should be filled by a muslim does not also mean that non-muslims in the country are down-trodden. On the contrary, baring the proviso already explained, they have equal rights with their muslim fellow citizens.

In order to sustain the proviso, however, the adherents of religions other than Islam, who live in the country are registered as minority groups for political purposes, such as electing the Prime Minister.

Such grouping does not affect them adversely whatsoover in their social or economic rights.

It was, indeed, in order to safeguard the proviso also that Pakistani muslims have ever since the country's independence cried out to their government that Ahmadiya should be declared a minority religion, and that the Ahmadis should be

recognised as belonging to the minority groups from among whom neither Prime Minister nor President can be elected.

This is because the vast majority of muslims all over the world do not recognise Ahmadiyya as part of Islam, and the Ahmadis as muslims. Let us consider the arguments for and against this stand of the world muslims against the Ahmadis.

In this exercise, my aim is to shed further light on the problem posed by Ahmadiyya, particularly in this country, because it is not unlikely that our law courts may eventually have to be called upon to settle a case which may arise from the problem. It will be necessary for the deciding judge (a) to be familiar with the full facts of Ahmadiyya. Moreover, certain interested people have been trying to impute motives and portraying the problem as political interference of one country with the peace among the Muslims of Nigeria. This is certainly not so. The fact that Ahmadiyya presents a universal problem to all the Muslims of the world rules out such a political interference. It is, therefore, necessary also for the rulers of Nigeria to know the facts in good time.

My article entitled «The Ahmadiyya Problem In Nigeria» published in the Sunday Times of 20th January, 1974 sparked off some controversy on the subject. Some members of the Ahmadiyya Mission in Nigeria went all out to defend their stand as against the overwhelming majority views of the Muslims. Their retorts were largely published in their weekly newspaper, **the Truth,** a few appeared in the Sunday Times, and one

which cunningly assumed the apparent role of a peacemaker appeared in the Sunday Sketch (17/3/74). The official replies of the Mission appeared both in the Sunday Times of 10th February, 1974 and in **the Truth** of Monday 11th February, 1974. By and large, all the subsequent retorts of the individual members of the Mission were simply repetitions of different aspects of the official reply. Consequently, the official reply gave out practically all the most important points considered to be in support of the Ahmadiyya stand. It is, therefore, necessary to treat the points one after the other, because the Mission has only tried to blindfold the people with their arguments.

1. **Khatamun-nabiyyin:** The first important point raised by the Ahmadiyya Mission is the explanation of the expression **Khatamun-nabiyyin** as used for the Prophet Muhammad in Q. 33 :40. The argument says : Mufridat Raghib, an authentic dictionary of Qur'anic vocabulary explains the word as follows :

«Khatam (Seal) is derived from Khatm. It has two fold meanings i.e. (1) to make impression or imprint, just as the impression made by a seal, and (2) the imprint such formed by a stamp. (This is the basic meaning of the word).

Sometimes, it signifies the prevention or protection from something derived from the seal over books, and chapters (which protects what is in writing).

Sometimes, the meaning 'to reach the end of the thing', are also derived from it.»

[. . .]

islam vs ahmadiyya
this is mere diversion

says Dr. A. R. Bhutta.
(published in the Sunday Sketch, Nigeria on 8th September, 1974)

Once again, Dr. Ismail Balogun has come out (Sunday Sketch on August 25, 1974) to criticise Ahmadiyya in wake of another persecution which they are facing this time in Pakistan.

One would have expected the writ! er to say something against the show of force in religion, but instead, he has tried to divert the public attention from the inhuman treatment which is being shown to Ahmadis currently, and has, infact, supported and encouraged this persecution, by accusing that Ahmadies are «usurping the rights of muslims.»

It is the basic human rights that Ahmadies are fighting for and one can only be grateful to the learned writer for not suggesting that Ahmadies are «usurping the rights of mankind» in the name of human-beings. Otherwise «no intolerance» is intended against them.

It has been alledged that Ahmadies misinterpret and twist the meaning of some verses of Holy Quran, so as to suit their view point but no convincing evidence has been given in this respect.

All that the writer could say was that «The Messenger» has been translated as «this messenger» while he agrees that the messenger referred to in both cases is specifically the same holy prophet of islam.

So where is the misinterpretation and what is the twist ? No one knows better than him that 'Alif-Lam' added to the word «Rassool» in the verse (4 :70) is meant to specify the messenger and in English this purpose of specification can be served better by translating it as «this messenger», than as «the messenger».

Nevertheless, it is heartening to note that the learned scholar has encouraged an intelligent approach to the verses in the light of authentic commentaries and teachings of Islamic scholars of the past.

Let us examine these verses in this light and see who is deviating from the path of these divines :

(1) The principal controversial point between 'Ahmadi' and 'non-Ahmadi' muslims is the interpretation of term 'Khatamun-Nabiyyin». Ahmadis say that it means a prophet that is perfect, supreme and at the highest and last stage of 'excellence' while other muslims insist that it means prophet that comes last of all or 'at the end' in respect of time.

It may be noted that the word 'last', is used sometimes to mean 'supreme' or 'highest', just as 'supreme court' maybe called the 'last' court of appeal, or a customer may offer the 'last price' for an article, meaning the 'highest price' he will pay.

In this sense, Ahmadis agree that the term may mean 'last' that is, 'supreme' and 'highest in rank', but they do not agree that it means 'last' in respect of time, as is believed by other muslims.

Let us now try to know what the term really means and find out what God actually wanted to tell «mankind when He gave this 'title' to the holy prophet.

Needless to say we should find the facts and face them them without caring which side is supported by the facts.

The term 'Khatamun-Nabiyyin' is a combination of two words 'Khatam' (Seal) and Nabiyyin (prophets). We know that when two words join together to make a phrase, they do not necessarily give their literal meaning.

«IBNE' means 'son' and 'SABEEL' means 'way', but when the two join together to make the term 'IBNE-SABEEL' it does not mean 'son of the way' ; it means 'traveller'.

The real sense of the phrase is determined by grammar, by its usage in language and by the context in which it is used. This fact is too common in every language and too well known to every educated person, to need any further elaboration.

We also agree on this obvious fact that the term 'Khatamun-Nabiyyin' has been used in praise of the holy prohet and grammatically it is 'Mupakabe Ezafi' (compound phrase) : 'Khatam' is 'Muzaf' and Nabiyyin' is 'Muzaf eleh'.

Now it is an established and unchangeable rule of arabic grammar and language that when word 'Khatam' is used in praise of a person, and its combining word (Muzaf-Eleh) is a 'group of talented people' (like 'poets' teachers, investiga-

tor') it never means 'the last' or 'at the end' in respect of time.

It always means that the person called 'Khatam' is 'perfect', 'supreme' and top-most in that group of talented people. The islamic literature is full of such instances and NOT A SINGLE, example can be cited against this rule.

To quote some - Khatamu-Shura' (khatam of poets) never means last or end of poets, it means the top-most and perfect poet.

KHATAMU - MUFASAREEN» ('Khatam' of commentators) never means the end or last-born commentator, it only means the best and perfect of all commentators.

Similarly, the word 'Khatam' has been used with many other groups of talented people like, 'Muhaqaqeen' (investigators), 'Muhadaseen' (reporters) «Hukkaam» (officers), 'mualameen' (teachers) and 'Auliyya' (friends of God).

In none of these phrases 'Khatam' means 'the end' or 'last-born' ; it only means the best, perfect and supreme of all in that particular talent which belongs to the group.

It may be noted that when 'Khatam is not used in praise of a person, and its' Muzaf-eleh : (combining word) is not a 'group of talented people' then it does mean 'last' or 'end', in respect of time. Because in that case it is used not to Praise the person for any talent, but as a mere statement of a fact.

For example 'Khatamul-Aulad' (Khatam of sons) will mean last-born, because 'to be born' is

not a 'talent' and the term is used not to praise the boy but merely to point out the fact that he is the youngest son.

Again, term 'Khatamul-Muhajireen', (Khatam of migrators) will mean 'last one to migrate because, 'to migrate' is not a talent, nor is the term used to praise the last migrator.

But, as I have mentioned above when the term is used in praise of a person', and the combining words (Muzaf-eleh) is a 'group of talented people', it never means the 'last one' or 'the end' in repect of time : it always means that he is the best, perfect and has excelled others in that particular talent and has reached the last and the highest grade of excellence.

In light of the above mentioned facts, the real meaning of 'Khatamun-Nabiyyin', therefore, can only be the perfect, 'supreme' chief and most excellent of all the prophets, and not the 'last one' in respect of time.

The title clearly shows that the holy prophet is chief of all the prophets that appeared before him and that no prophet superior or greater than him can ever appear after, but appearance of Prophet Junior and subordinate to the holy prophet is not contrary to the title.

The above meanings of 'Khatam' are also supported not only by well known scholars of Islam but also by holy prophet himself.

The holy prophet is reported to have said to Hazarat Ali that : «O ! Ali you are 'Khatamul-Auliyya' just as I am 'Khatamul-Anbiyya' : (Tafseer-Safi P. III)

Here, the holy prophet could not be telling Ali, that he was the 'last' 'Wali' and there could be no 'Wali' after him. The saying could only mean that Ali was a perfect and 'supreme' 'Wali' just as the holy prophet was the perfect and supreme 'Nabi'.

Again, the holy prophet says : «I am the chief of prophets who are before me and after me» (Delmi)

This is exactly what the title means : Hazarat Ayesha, the holy wife of the holy prophet advises us that : «Say that he is seal of prophets but say not that there is no prophet after him». (Durre-Manthur vol. 5. P. 104 also) (Takmila Majmaal Bihar, Vol. 4 P. 85.)

Now, if 'Khatam of prophets means the 'last' prophet and there could not be any prophet after him then why not say so ?

Hazrat Sheikh Mohyuddin Ibne Arabi (died 638 Hijra) say : «The prophethood that was terminated with the person of prohet of Allah was no other than the law bearing prophethood and not the prophethood itself.» (Futuhot-e-Makkia vol. 2 P. 3.)

Hazrat Sheikh Ahmad Sarhindi (died 1034) Mujadded Alaf Sani, regarded by many as the greatest reformer before the advent of promised messiah says : «Attainment of the rank of prophethood, by his followers in the way of Allegiance and as legacy after the advent of the 'Khatamun-Nabiyyin ('seal of prophets') does not contravene his finality.» (Maktoobat vol. 1. P. 432.)

Hazrat Shah Waliula Muhaddis (died 1176 Hijra) A great reformer in Islam says : «Prophets ended with him in such a way that there shall not be after him one whom Allah the holy, invests with Law.» (Tafhimat-i Ilahiyya vol. 2. P. 72).

Hazrat Maulvi Muhammad Qasim Navotovi (Died 1297 Hijra) says : «If a prophet appeared after the holy prophet it would in no way affect his finality». (Tahzirunnas, P. 28).

Imam Fakhar-Uddin Hazi (died 606 Hijra) writes : «It is essential for a 'Khatam' to be Supreme. Look ! Just as our holy prophet was declared 'supreme' on account of being 'Khatamun-Nabiyyin' so is 'the man' declared supreme on account of being 'Khatam' of all the physical creatures». (Tafseer-e-Kabeer vol. 6 P. 31)

Allama Ibne-Khaldoon (died 809 Hijra), writes : «The perfect, 'Wali' is declared as 'Khatamul-Auliyya', that is one who receives that stage, which is the extreme of 'willayat'. Just as Hazrat Khatamul-Anbiyya received that excellent stage which is the extreme of prophethood.» (Muqadama Ibne-Khaldoon P. 271, 272 Egypt).

«He (i.e. holy prophet) has been declared khatam (i.e. the seal for he had no peer in virtue before him nor shall there be one after him». (Musnavi Rumi, vol. 6. P.8)

Hazrat Imam Shirani (died 972) says : «The statement,.. 'there shall be no prophet after me' simply means that there shall be no such prophet after him as bears a new law». (Al'y-waqeet-wal-Jawahir vol. 2. P. 2.).

Allama Zurqani (died in 1122 A.H.) in 'Sharah Ma Waibul Lodunnia, L (vol. II, page 163) ; writes that the word Khatam means perfection and an adornment.

The above references are too clear to need any explanation and explain the real meaning of Khatamun-Nabiyyin beyond any shadow of doubt as understood by scholars of Islam, that lived in the past.

Let us however have a look on the verse 33 :30 which reads : «Muhammad is not the father of any of your men ; but he is the messenger of Allah and the seal of the prophets, and Allah knows everything.»

The use of of the word 'but' in the verse is noteworthy, 'But' is used to join two sentences and it always serves 'to remove any doubt or objection that may possibly arise from the first sentence.'

If we interpret the 'seal of prophets' as 'last prophet' the information given in the verse can be briefed as follow 'Muhammad is not the father of any son but he is the last of prophets.

'Muhammad has no son after him but he has no prophet after him.

Read the above sentences again and see that the use of 'but' is absolutely wrong because both parts of each sentence have something negative in them.

In all these sentences, use of 'but' demands that if there is anything 'negative' in the first statement, the other statement should contain something positive or vice versa.

If certain fact is denied in the first statement, the use of 'but' demands that this denial, should be compensated by acknowledging some similar fact in the other statement.

Now let us suppose that the 'seal of prophets' means supreme, chief, head and top-most prophet, and read the same sentences again ; Muhammad is not the father of any son but he is father (head) of prophets :

Or Muhammad is at the end of his lineage but he is at the top of the prophets, or Muhammad has no sons after him but he has prophets as 'sons' after him.

The use of«But»is absolutely correct in these sentences because the doubt that arises by denying one fact in the first statement has been removed by acknowledging some similar or even better fact in the other statement.

It may be remembered that a prophet is the father of his followers and the wives of the prophets are 'mothers' of the followers, as stated by Quran.

With this fact in view, read the verse again and see that when God said : «Muhammad is not father of any man». He denied the physical 'fatherhood,' but He compensated this loss with a big 'but' that he is «Father of a nation» as messenger of Allah and 'father of prophets' as a 'seal of prophets.'

The 'seal' here could never mean the 'last, it can only mean 'the seal' which 'issues' some-

thing, because it is the physical 'issues' of the prophet that are denied in the first part of the verse : the second part, therefore, must necessarily acknowledge the existence of spiritual issues.

Therefore, what God really wants to tell mankind is, that although, Muhammad is not the father of any man (and has no physical son) but he is the 'father of a nation' (and has spiritual sons) and above all he is the «father of prophets» thus having prophets as his spiritual sons.

Please, note that every prophet is the father of his followers and the words «messenger of Allah» in the verse made the holy prophet only the 'father of his followers' in common with other prophets. It is the next term 'seal of prophets' which exalted him above all as «father of prophets», or as 'issuer' of prophets.

≒ The other verse (4 :70) of the Holy Quran also supports this meaning of the 'seal of the prophets'. It tells us that the obedience of God and the holy prophet, will enable his followers to be with the «blessed people» which are prophets, truthfuls the 'martyrs' and «the righteous».

The company of «blessed people» can only mean that the followers of Islam be blessed with these four ranks. If we suppose that it only means the physical company and not in rank, then we will have to believe that no muslim can even attain the rank of 'truthfuls' 'martyrs and 'righteous people'. and this obviously is ridiculous.

Whatever the interpretation of 'company' we make, it will apply to all the four groups alike. If

we deprive the followers of Islam from the rank of prophets we will have to deprive them from the other three ranks also and if we give them the three ranks of 'truthfuls' 'martyrs' and righteous, the fourth rank of prophets will also become attainable, because the word 'company' applies to all the four groups alike.

This is what the great 'Imam Raghib' has said while explaining this verse. He says : «Similarly, one who follows Allah and the holy prophet and gets the rank of a prophet,Allah will include him in the group of prophets and one who gets the rank truthful Allah will include him in group of truthfuls.
(Al Behrul - Momeet vol III P . 287 as quoted by ABU Hayyan).

Let us read these verses with this explanation in mind, may be we will understand : why Muhammad is the top-most and supreme prophet, why he was telling that prophets can appear after him and why all the scholars and saints of islam that lived the past, agreed that the followers-prophets can come after him.

The following reference may explain further.

Maulana Muhammad Qasim Nanautovi (born in 1248, and died in 1297 A.H.) was the founder of Deoband. He says : «The common people think that the holy prophet was Khatam in the sense that he came after the old prophets and he is the last in point of time, but it will be clear to men of understanding that coming first or last in point of time is in itself no excellence».

The holy prophet is not possessed of the fatherhood of any man in its general sense but the

[. . .]

spiritual fatherhood of followers as well as of prophets does belong to him». (TahzirOunOnas page 3 and 10).

I have discussed above the meaning of verse 33 :30 and 4 :70 I have quoted the references of the most respected scholars of Islam that lived in the past and I have not quoted a single sentence from Ahmadiyya Literature.

DR. BALOGUN HASN'T SAID ANYTHING NEW

Says M.A. Taiwo

(Published in the Sunday Sketch, Nigeria, on 8th September, 1974

The article of Dr. Ismail Balogun on Islam vs Ahmadiyya which appeared in the SUNDAY SKETCH of August 25 is like the Richards Constitution, the same old beer in a new bottle, for, it adds no new revelation to his January20, 1974 epistle to the muslims.

That we have been able to read him once again, and possibly still more on the topic is not beyond expectation.

At the onset, Dr. Balogun refers to the word «khattam» seal , and says that the interpretation being given to it by the Ahmadis is contrary to the view of the author of Mufridat al-Raghib-a dictionary of Quranic Vocabulary.

The heart of the matter, however, is that the author of the dictionary in question having stated the different meanings of the word (as Dr. Balogun has rightly pointed out) went further to expatriate that there were two categories of prophets — thelaw-bearers and the non law-bearing ones.

It is the former categories which the author says the word «khattam»«seal», applies to; and this he says terminated by the ad vent of prophet Muhammad while the latter categories, the author maintains would continue till the end of time.

It may interest readers to know at this juncture that it took myself and Dr. Balogun almost three hours to peruse that portion of the dictionary in his office on one Saturday and we were both satisfied with the comentary of the author as afore mentioned.

But in a bid to intrigue the judges whom he says he was trying to enlighten with his article, Dr. Balogun kept a sealed lip on the whole commentary of the author as regards the categories of prophets to whom the word may or may not apply.

One will observe also that in order to arouse the gullibility of the muslim world, Dr. Balogun has all along been clinging only to the doctrine of finality of prophethood but logically glossed over another important aspect of the case which he knows too welll **that if faithfully dealt** with can **open the shelter on some peoples' eyes.**

For example, the Ahmadis maintain that ALL the authentic Hadiths of Prophet Muhammad foretell the second coming of Prophet Isa and the coming of Mahdi at the latter part of the Day.

Whether Dr. Balogun and other muslims believe Ghulam Ahmad to be the fulfilment of these prophecies is not the question, but he should have done the muslims a world of favour if he has, among other things explained: whether or not he believes in these hadiths regarding the second ad vent of Prophet Isa (Jesus). If his answer is yes, he should tell us when; and why Prophet Isa should have come after Prophet Muhammad**when god has already said in the Quran that the (Muhammad) is the last prophet.**

If Prophet Isa is to reappear in the world would he have to be derogated of the title of prophethood and become Mr. Isa?

If one can succeed deceiving the people into believing that there will be no other prophet after Muhammad, no amount of trickery can convince them to discard the hope of seeing prophet Isa and Mahdi at the close of the Hour.

God addressed all mankind through Prophet Muhammad in Quran 7:36; saying: «O children of Adam! if messengers come to you from among yoursel ves, rehearsing my signs unto you, then who so shall fear God and do good deeds, on them shall come no fear nor shall they grieve.» Here, God bade Prophet Muhammad to assure humanities that messengers would unceasingly be coming to them, which; in other words; means word; means prophets.

But Dr. Balogun did not tell us whether this revelation is meant for the dead or the subsequent generation after Muhammad.

[. . .]

To bring my readers into certainty, I'll now quote from a speech he delivered at the Ahmadi Youth Conference in October, 1972. He (Dr. Balogun) said: «It may be pointed out with all humility and modesty that the explanations given by Ahmadiyyat concerning the teachings of Islam are increasingly being acceptable to the enlightened and well educated muslims —whether young or elderly;even though some fanatic muslims still brood even the existence of Ahmadiyya in the world.»

«Already, attempts are being made by certain elements in the country to oppose Ahmadiyya here as had been done elsewhere in the world. Such opponents of Ahmadiyya here should reflect and learn a lesson from what their predecessors in the opposition had suffered.

«They should realise that a tree that has been planted by God can never be uprooted by any man however mighty he might be. If they carry out any plot, perhaps that is God's plan by which the Nigerian Ahmadis should come together. Man proposes while God disposes. He will certainly not abandon those who continue to struggle rightly in His way» (Sure!!!) parenthesis mine.

How a person can be a bearer of this type of revelation and at the same time be the victim of it leaves much to be desired!

On the whole, I should only like to remind here, in consequence, the fact that we have repeatedly been appealing to whoever has any axe to grind to meet us at a public debate whereby we could be able to invite the Press and the Public. Some have ventured an answer to this challenge only to cancel it on the eve of the appointed day.

My prayer is that Allah may grant our critics the courage to come out and have their say rather than a merenewspaper campaign which cannot benefit millions of illiterate muslimsof thiscountry.

[. . .]

WHY I RENOUNCED AHMADIYYA

By Dr. I.A.B. Balogun
(Published in the Sunday Sketch, Nigeria on
29 th September, 1974.)

In his rejoinder (SUNDAY SKETCH, SEPTEMBER 8,1974) to my article, on 'Islam vs Ahmadiyya', Mr. M.A. Taiwo reports an address which I gave to the Ahmadiyya Youth Conference in October 1972, he wonders «How a person can be a bearer of this type of revelation and at the same time be the victim of it.»

In point of fact, subsequent to my critical articles on Ahmadiyya, a number of well-meaning people have wondered why I criticised the mission, into which I was born and bred, in public.

Some also queried why I had to wait until after the age of 40 before I made my views on ahmadiyya known. These are pertinent questions for which an answer is desirable.

[. . .]

It is only by going to the source references and reading what the Ahmadis had quoted within context in which they are set that the reader, and the seeker after truth, will realise how much the Pakistani Ahmadiyya missionaries try to deceive the world.

In my last article, I called attention to how Raghib's MEFRADAT... an authentic dictionary of the Qur'an had been dishonestly quoted out of context.

It should be noted that DR. Bhutta did not contradict me on this point. On the contrary he

avoided the point and jumped to another part of my exposition only to fumble on Arabic grammar.

If he still insists that «Alif-Lam» (the definite article) is translatable into «this» in the English language, then he certainly needs some more tutoring in the Arabic language.

To the layman, the copious references made by Dr. Bhutta in his rejoinder appear impressive. But to the trained Islamic scholar, a systematic analysis of the references shows that they are either quoted out of context or many of them are unreliable.

This is also true of the references made in the official Ahmadiyya rejoinder to my first article (vide THE TRUTH, Monday, February 11, 1974).

For example, an often-quoted «tradition» by the Ahmadis in support of Ghulam Ahmad's claim to prophethood is that Aisha the wife of the Prophet Muhammad (S.A.W.) says: «Say that he is seal of prophets but say not that there is no prophet after him.»

The two references always made for this quotation are Durre-Manthur, vol.5, P. 104: and also Takmila Majmaal Bihar, vol. 4P. 85.

It should be pointed out that these references are not the universally accepted references on the sayings of the Prophet and his companions.

For the benefit of my readers, there are six universally recognised authentic books of hadith, and three others which have gained widely accepted reputation for one reason or another.

The first six authentic authors are Bukhari, Muslim, Abu Lawud, Ibn Maja, Tirmidhi and Nasai. The next three books are Muwatta' of Malik b. Anas, Musnad of Ahmad b Hanbal and an anthology of all the fore-going contained in Mishkat al-Masabih.

TRADITIONS

There is nowhere in the Muslim world in which these books are not known and revered as important books of traditions in Islam. The first two of them, Bukhari and Muslim, are the most important books in Islam after the Qur'an.

All other books of Hadith are either extracts from some or all of the listed books, or commentairies and glossaries on one or another of the books.

It must be noted that of all references made by Dr. Bhutta to the Prophet and his wife, none is taken from any of the universally recoignised books of hadith.

Anyway, even though the supposed hadith form Aisha is worthless and unreliable, since is has become rather high in the estimation of the Ahmadis, let us consider the weight of authentic traditions against it. It should be remembered that the Ahmadis quote the «hadith» in order to prove that Khatamun-nabiyyin does not mean the last of the prophets in respect of time.

In conveying the meaning of this term, the Prophet Muhammad (S.A.W.) gave an illustration as follows as contained in **Muslim,** Fadail: 26. «The similitude of me and the Prophets is like that

of a man who built a house, completed and perfected it; except for the place of a brick. People were entering it and wondering about it saying: «Were it not for the place of the brick'. The Messenger of God (S.A.W.) says: «I am the place of the brick. I came and I put an end to the Prophets.»

A similar hadith is contained in Bukhari, Manaqib: 18. So also it is in Tirmidhi, and Musnad of Ahmad B. Hanbal.

Another section of Bukhari indicates, on the Prophet's authority, that the only characteristic of prophethood that remains after him is good dream.

[. . .]

Page 3 THE TPUTH Friday November 9, 1979.

Savior of the world Jesus or Mohammad?

Recently the editor of the "Spiritual News", Mushin Lagos, has invited the readers to express their views on the above topic. The subject is not only important for the Muslims and the Christians but for all the people of the world. Accordingly Dr. A. R. Bhutta, a well-versed scholar on the comparative studies of the religions, has expressed his views on the subject and already published in the Spiritual News. We reproduce it for wider publicity.

In your issue of 23rd-29th August, 1979, members of the public have been invited to express their opinion if Mohammed, like Jesus, can save his followers and lead them to eternal life. It has also been said that Mohammad was not a true Prophet as Jesus was the end of the prophets. I would like to express my views on this very important topic and hope you will publish my views for the information of your readers.

(1)

The basic point in this respect is, who, out of Jesus and Muhammad, claimed to have been sent by God for the salvation of the whole world? If one or both of them have any such claim, then we can go on to examine that claim. But if anyone of them does not have any such claim, then he will be supposed to have withdrawn from contest and there can be no comparison between the two. Before we look for the claims of Jesus and Mohammad, we should remember that claim has to come from the claimant himself and witnesses are supposed to support that claim. If there is no claim then all the witnesses will simply be useless no matter how great their number and how high their rank.

Now if we go through the bible we discover that Jesus NEVER claimed that he or his mission was for the whole MANKIND. He, on the other hand, categorically declared thast he had been sent only for a particular nation called Israel and he specifically ordered his followers to confine their preaching to that nation only. It is also clear from the bible that his disciples did actually preach to that particular group of people only. The following references from the bible will bear me out:

(A)

Matthew 15:23-26 mentions the declaration of Jesus that he had been sent only to the lost sheep of the house of Israel. He was so strict in keeping the limits of his mission that he refused to make an exception even for a poor non-Israeli woman. And when at last he did agree to help her, he did so only after he had made it clear to his disciples that he was favouring her as we 'feed our dogs'. Jesus declared Israel as his children and the Gentiles as dogs. Math. 7:6 is another instance where Jesus has declared the Gentiles as dogs

and swine and has advised that his teachings (pearls) should not be preached to other nations.

(B)

In Matthew 10:5-7, Jesus has ordered his disciples to go out into the world and preach the Gospel but advised them that they should "go nowhere among the Gentiles and enter no town of Samaritans but rather go to the lost sheep of house of Israel. It is, therefore, clear that the message and mission of Jesus was meant only for Israel and it was advised not to preach the Gospel to others.

It may be noted that in Matthew 28:19 where apostles are told to make 'disciples of all nations', it is not the Gentile nations that are referred to. It means the twelve tribes of Israel which had developed into different nations and had spread into other nations covering a large part of the then known world. In Ezekiel 34:6 and 36:6-19, we are told that these tribes had "scattered among the nations and dispersed through the countries" and had, infact, covered "all the face of the earth". So when Jesus told them to go and preach all nations, he was not talking of Gentile nations and thus contradicting his previous statements. He was only referring to the nations of Israel which had spread among other nations and had wandered like lost sheep into other countries of the world.

Again it may be noted that the word 'world' as used in the Gospels, does not actually mean the whole world. In Luke 2:1, we are told that Caeser issued a decree that "all the world should be enrolled". Now Caesar was neither a ruler of the whole world nor was it possible for him to get the whole world enrolled. The words "all the world", therefore can only mean the part of the world of which Caesar was the ruler. Similarly when we are told that Jesus was the 'light of the world' or that he had been sent to 'save the world', it does not mean the whole mankind. It only means the 'world of Israel' of which Jesus was the ruler (Math. 2:6, Mic. 5:2). How could he save the whole world when God had sent him 'only to Israel'? Wherever it is mentioned in the Gospels that 'no one' can reach the Father except through Jesus and that 'all' or 'whoever' believes in him shall be saved, the context of all such verses would show that these words were addressed to Jews only. There is nothing to suggest that these words were meant to include the Gentiles also. It is just like a primary six teacher telling his class, "all who will obey me, shall pass and anyone who does not listen to me will suffer". Obviously, the words 'all' and 'anyone' are meant to warn the students of his class and do not in any way include the boys all over the world. Jesus too, was a teacher of his class called Israel and all such words were meant for his 'children' in the class and could not include the boys outside whom he called 'dogs and swine'.

(C)

Matthew 10:23 also signifies that the Gospel of Jesus was meant to be preached only to the people and in the towns of Israel. It also shows that the task of preaching to all the towns of Israel was a long one and it could hardly be completed 'before the son of man

comes'. It was indeed very difficult to preach the Gospel 'among all the Jews throughout the world'. (Act 24:5)

(D)

Matthew 19:28 mentions that Jesus and his disciples 'will sit on twelve thrones, judging the twelve tribes of Israel'. The faith of the non-Israeli believers is evidently useless and they may even be turned out of the court because there is no judgement for them by Jesus. If Jesus were a saviour of the whole world, why judge only the twelve tribes of Israel?

(E)

Luke 24:21 shows that Jesus was believed by his followers to be a redeemer of Israel only.

(F)

Act 11:19 shows that the followers of Jesus preached the 'word to none except Jews'; and this proves beyond any shadow of doubt that even after the so-called death and resurrection of Jesus, his followers believed that the Gospel of Jesus was meant not for the whole world but for Jews only.

All the above mentioned references prove that Jesus was sent for the guidance of Israel only as declared by the Holy Quran (3:50). Even the Jerome Biblical Commentary had to CONFIRM the "historical fact assured in all the Gospels, that the mission of Jesus himself was limited to Jews" (43:68).
Since Jesus never claimed to be a saviour of the mankind, all the preaching of his latter followers in support of that 'claim', is nothing but their wishful thinking and deceitful exaggeration.

(2)

As far as the claim of the Holy Prophet Muhammad (saw) is concerned, the Holy Quran clearly mentions that he had been sent as a "warner for all mankind" (34:29); a messenger of Allah to all mankind (4:80) and " A MERCY FOR ALL THE PEOPLES" (21:108) He categorically declared, "O Mankind, truly I am a messenger to you all from Allah!.... (7:159). SO, WHO IS THE SAVIOUR OF THE WORLD?

(3)

It is also said in your paper that Christ was the end of the prophets and that no prophet can come after him. But this is not supported by the Bible. In John 1:19-25, we are told that three prophets, namely, Elijah, the Christ and 'the Prophet', were expected to appear in the days of Jesus. Now we know that Elijah came in person of John, the Baptist and Christ came in the person of Jesus but what about 'the Prophet'? All the commentaries of the Bible explain that 'the Prophet expected at that time apart from Elijah and Christ, was the one whose prophecy was made by Moses in Deut. 18:18. And no where is it mentioned in the Bible that people were wrong in expecting 'the Prophet' or the the prophecy had been fulfilled in some other prophet before Jesus. On the other hand, it is clear from Act 3:17-24 that 'the Prophet' promised by MOSES was still being expected after Jesus and that he was to come sometimes before the second coming of the Christ.

(4)

It has been said that Muhammad (saw) was a 'prophet of devil' because he preached a Gospel different from Jesus, married many wives and made wars with sword. This observation, I may explain, is based on prejudice and lack of knowledge.

(i)

Muhammad and his religion, infact are the very fulfilment of the Gospel of Jesus. We know that Israel were a chosen people of God and God had established His Kingdom in them by raising a great prophet Moses, among them and by giving them His Law through Moses. God had also promised through Moses that another 'prophet like him' will be raised 'from among the brethren' of Israel (Deut.18:18) Many prophets came after Moses to establish the Law and Jesus was the last of all those prophets.

Jesus came and told the people of Israel that "the Kingdom of God will be taken away FROM YOU and given to a nation, producing the fruits of it (matthew 21:43). This declaration of Jesus clearly implied that the time was coming when Israel would cease to be chosen people of God and a new 'prophet like Moses' with a new Law would be raised from the 'brethren of Israel' and thus kingdom of God would be established in some other nation. When Jesus preached the Gospel that 'kingdom of heaven was at hand', he was simply preparing the Jews for the forthcoming 'Prince of peace and wonderful counsellor' whose 'government of peace was to have no end' (is. 9:6-7); and this, in fact was the main mission of Jesus. The prophecy of Jesus about the' 'counsellor' as mentioned in John 14:15,16, is also the repetition of the same Gospel of the kingdom of 'Mighty God' and 'Wonderful Counsellor' of Isaiah 9:6.

Your writer has 'wondered how Muhammad came to be a Prophet after Jesus. Even Jesus and Jews have wondered before on this 'Wonderful Counsellor' and have said:

"... this is Lord's doing and it is marvellous in our eyes" [*Matthew 21:42*].

(ii)

It is absurd to say that since Muhammad (saw) had many wives and made wars, he could not be a prophet of God and was a 'prophet of devil'. Most of the biblical prophets were polygamous and many of them made wars. Can we, therefore, call them 'prophets of devil'? And most of your bible is written by those prophets. Can we now call that part of the bible as 'word of devil'?

The first wife of Muhammad (saw) was a forty years old widow and he married her when he was a young boy of twenty-five. And he lived the first twenty-five years of his youthful life with that one old wife and did not marry any woman till her death at the age of sixty-five. This fact alone is sufficient to convince a sensible critic that right from his youth he was a man of God and could never be led by the 'worldly desires'. Even out of the other wives that he later married, all but one were old widows. The Holy Prophet at that time was a

head of state as well and had the responsibilities of moral, social, political reforms in the society. Even the worst critics of Islam have agreed that all his later marriages had social, political and religious reasons.

(iii)

As far as the use of sword is concerned, even Jesus said, "Do not think that I have come to bring peace on earth; I have not come to bring peace, but a sword" (Matthew 10:34). So we can see the peaceful teachings of Jesus!

Muhammad (saw) had to use sword to protect the life, faith and honour of the people and he made wars to restore peace and justice in the society and to establish the freedom of worship and religion in the country. Isaiah had already fore told the role of this 'chosen servant of God', saying, "he will bring forth justice to the nations ...." "He will not fail or be discouraged till he has established justice in the earth ...." "The Lord goes forth like a *mighty man,* like a *man of war* he stirs up his fury .... shows himself mighty against his foes." (Is. 42:1-13).

I have briefly replied the points raised in the paper. I hope you will publish it for the information of your readers. For further details, people can write me direct.

Yours faithfully,
Dr. A. R. Bhutta.
P.O.Box 15, Ijebu-Ode.

شانِ احمدِ عربی ﷺ

(منقول از دافع البلاء صفحہ ۲۰ مطبوعہ ۱۹۰۲ء)

زندگی بخش جامِ احمدؐ ہے — کیا ہی پیارا یہ نامِ احمدؐ ہے
لاکھ ہوں انبیاء مگر بخدا — سب سے بڑھ کر مقامِ احمدؐ ہے
باغِ احمدؐ سے ہم نے پھل کھایا — میرا بُستاں کلامِ احمدؐ ہے
ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو — اُس سے بہتر غلامِ احمدؐ ہے

THE FACTS ABOUT THE BIRTH

OF

JESUS CHRIST

BY

DR. A. R. BHUTTA

Published by:-

Ahmadiyya Muslim Mission

IJEBU-ODE.

Jimy Press Ijebu-Ode.

Christianity

AND

Salvation

BY

DR. A. R. BHUTTA

PUBLISHED BY

AHMADIYYA MUSLIM MISSION

IJEBU-ODE, NIGERIA.

Was Jesus Buried?

Dr. A. R. Bhutta,

Published by
Ahmadiyya Muslim Mission
45, Idumagbo Avenue, Lagos. (Nigeria)
(P. O. Box 418 Tel: 633757)

ABRAHAM'S SON OF PROMISE

ISHMAEL OR ISAAC?

A critical analysis and comparative study of the Biblical story.

BY

DR. A. R. BHUTTA
AHMADIYYA HOSPITAL,
IJEBU-ODE, NIGERIA.

Pub'ished by

AHMADIYYA MUSLIM MISSION,
23, LAGOS ROAD,
IJẸBU–ODE,
NIGERIA.

Jimy Press, I'Ode
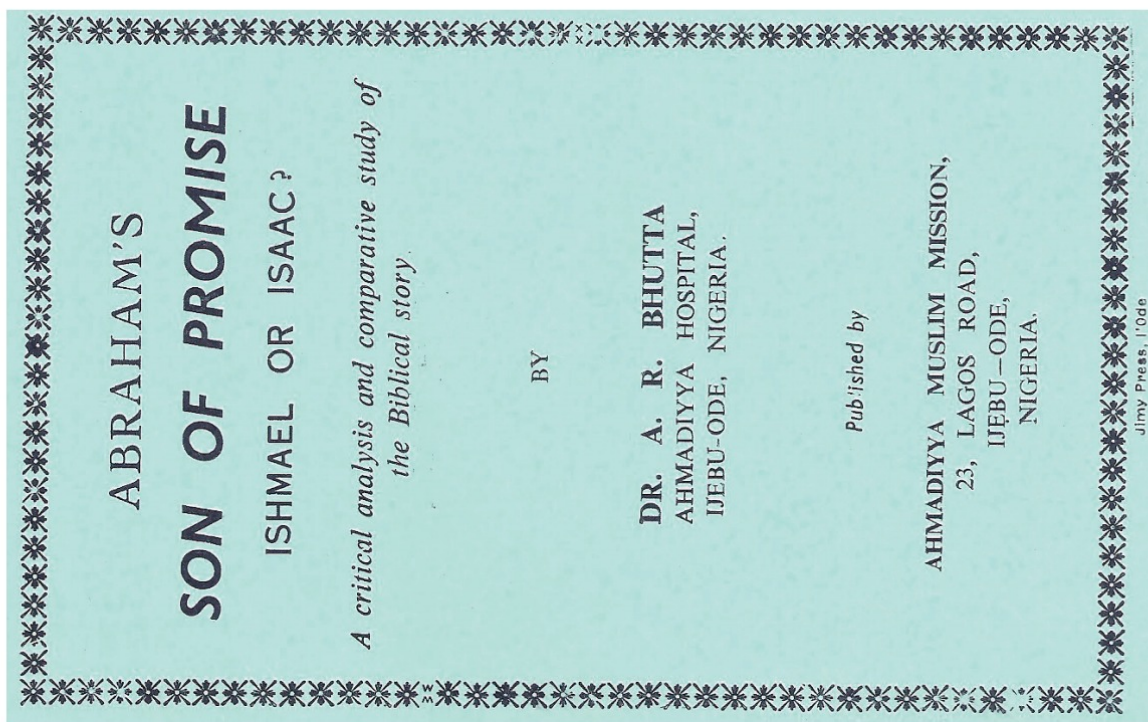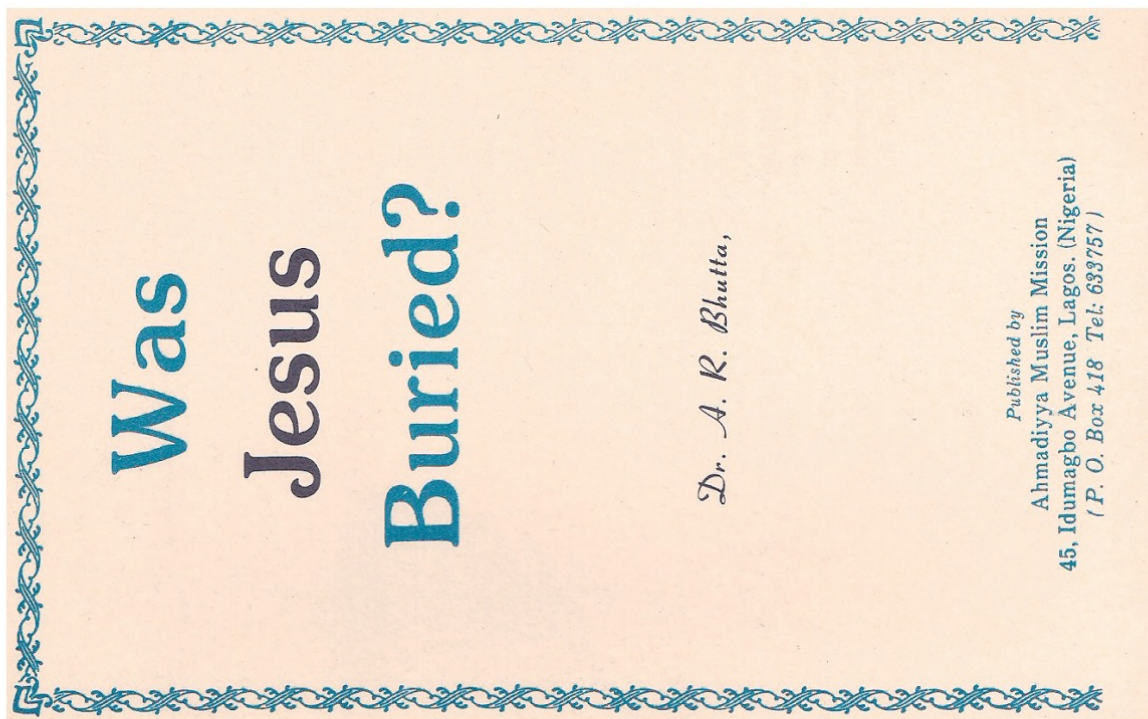
JESUS CHRIST

A REDEEMER

OF ISRAEL ONLY

BY

DR. A. R. BHUTTA
AHMADIYYA HOSPITAL,
IJEBU--ODE.

PUBLISHED BY

AHMADIYYA MUSLIM MISSION
IJEBU-ODE, NIGERIA.

Jimy Press 38 Awujale Street Ijebu-Ode.

THE COUNSELLOR

PROMISED BY JESUS

HOLY SPIRIT OR THE HOLY PROPHET?

BY

Dr. A. R. Bhutta,
AHMADIYYA HOSPITAL,
IJEBU-ODE.

PUBLISHED BY

AHMADIYYA MUSLIM MISSION,
23, Lagos Road, P. O. Box 15, Ijebu-Ode.

Printed by :- Jimy Press, 33, Awujale St. Ijebu-Ode.

SIN

AND

SALVATION

BY

DR. A. R. BHUTTA

AHMADIYYA HOSPITAL,
IJEBU-ODE.

Published by :-

AHMADIYYA MUSLIM MISSION
45, Idumagbo Avenue,
P. O. Box 418,
Lagos, Nigeria

THE HOLY PROPHET

MUHAMMAD

(S. A. W)

IN THE BIBLE

By

DR. A. R. BHUTTA

THE ISLAMIC LITERATURE
AHMADIYYA BOOKSHOP
45, IDUMAGBO AVENUE,
P. O. BOX 418,
LAGOS.

پوپ کے اسلام پر اعتراضات کا رد
احمدیہ مسلم جماعت جرمنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

حصہ اول

خطبات امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

حصہ دوئم

تفصیلی فہرست مضامین

دیگر مضامین